

مستقل انجمن کی حامل معیاری اور ثقافتی تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

اگست 2014

نظارہ کیجیے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا



WWW.PAKSOCIETY.COM

مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم
سب سے آخر میں ملتا ہے۔
مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی

کی لازوال تحریروں سے انتخاب

القرآن

بسم الله الرحمن الرحيم

سورة الانعام

زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔ ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں مگر جو لوگ ہماری نشانیں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔ ان سے کہو ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آ جاتی ہے یا آخری گھڑی آپہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے مٹا دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔

(آیہ ۳۷ تا ۴۱) (حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

سیارہ ڈائجسٹ / اگست ۲۰۱۳ء

1

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم الشان پیشکش

صدقات و خیرات نمبر

شائع ہو گیا ہے

قیمت: 175/-

”کون ہے ایسا شخص جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر بہت زیادہ کر دے“ (القرآن)

☆..... قرآن وحدیث کی روشنی میں صدقہ خیرات کے احکامات اور مسائل

☆..... خیرات کرنے، صدقہ کرنے اور مفلسوں و ناداروں کو کھانا کھلانے

سے مال میں برکتیں اور اضافہ ہوتا ہے

☆..... غریبوں اور مسکینوں سے وہ سلوک کریں جو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے

☆..... ایمان افروز سچے واقعات سے مزین جن کو پڑھ کر آپ کی زندگی

میں انقلاب آجائے گا

☆..... ایک ایسی کتاب جو انشاء اللہ ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کی ضمانت ہے

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور۔

فون: 0423-7245412

الحديث

بسم الله الرحمن الرحيم

جانداروں کو پانی پلانا ثواب کا کام ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”ایک آدمی راستہ میں جا رہا تھا۔ اس کو بہت زیادہ پیاس لگی۔ ادھر ادھر دیکھا ایک کنواں ملا، وہ اس میں اتر گیا اور پانی پیا۔ (ڈول اور رسی نہیں تھی) جب کنویں سے باہر آیا تو دیکھا کہ ایک عورت پیاس کی وجہ سے زبان نکالے ہوئے بھیگی مٹی کھا رہا ہے، اس آدمی نے اپنے دل میں سوچا اس ٹٹے کو اتنی ہی شدید پیاس لگی ہے جتنی شدید پیاس مجھے لگی تھی، وہ فوراً کنویں میں اتر گیا، اپنے چمڑے کے موزہ میں پانی بھر کر منہ میں تھا سے باہر آیا اور ٹٹے کو پلایا۔ تو اللہ نے اس کے عمل کی قدر کی اور اس کی مغفرت فرمادی.....“۔

لوگوں نے پوچھا ”کیا چوپایوں پر بھی رحم کرنے پر ثواب ملتا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا ”ہر جاندار کے ساتھ رحم کرنے پر ثواب ملتا ہے.....“

(بحوالہ: مختصر صحیح بخاری)

لن ٹارے میں.....

- 2 القرآن ضیاء القرآن قرآن ایک مکمل ضابطہ سیات ہے!
- 3 الحدیث ادارہ جانداروں کو پانی پلانا ثواب کا کام ہے!
- 14 دستک امجد رؤف خان قانون توڑنے کا فیشن.....!
- 43 خود جلس دیدہ اغیار قلندر حسین سید لکھا بے مثل تحریروں کا گلدستہ جنہیں چننے کے لیے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے!
- 59 چھاؤں جاوید بسام ایک شخص کی پتا، جسے دُرگاؤں میں ممتا کی چھاؤں میسر آ گئی تھی!
- 65 یک درگیر اشرف صبوحی اُجڑے دیار کی کہانی، اُردو کے نام و راویب اشرف صبوحی کی زبانی!



سیارہ رپورٹ

17 کوئی قلمزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مدد دے!

اُردو کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں سے انتخاب

63

مونا بنجوداڑ کی تصویری تحریریں

عارف محمود اہل

ماہرین ابھی تک ان تصویری تحریروں کو پڑھنے سے قاصر ہیں!



ایک خاندان کا فسانہ، چند لمحوں نے اُن کی زندگی کی کہانی بدل دی تھی!

فیضان مبارک

تغاوت

127

سلطان العارفین کے حالات زندگی، آپ کو بزرگان دین میں وہ مقام حاصل ہے جو فرشتوں میں جبرئیل کو حاصل ہے!

پروفیسر غلام رسول

حضرت بابریزید
بسطامی

132

ایک مصنف کی کہانی، جو خود ایک بے رنگ کروار بن گئی تھی!

مدیحہ اصغر

”کروار“

154

ایک باپ کی کہانی جس نے ہمیشہ حلال کمائی سے بچوں کی پرورش کی تھی!

جاوید احمد صدیقی

ترہیت کا اثر

161

14 اگست کے حوالے سے خصوصی تحریر.....!

ایس۔ امتیاز احمد

وریام سنگھ.....!

163

گرمی دانی

129

حکیم راحت نسیم سوہدروی

”دو تم میری ہو“
مصیرہ ہالوشیریں



86

سیارہ کچن کارنر

171

جویریہ کامران



91

حافظ سعید

ایک صحافی کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ، وہ کالا جادو کرنے والوں کو بے نقاب کرنے چلا تھا!

ڈاکٹر سید نسیم احمد ادیب جعفری

139

آئیے تقریر کرنا سیکھیں

فن خطابت کے بنیادی رموز و نکات سے آگاہ کرتی ایک تحریر

- 175 بزم شاعری ادارہ بازوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!
- 181 گھر اور شہر ڈاکٹر درخشاں انجم ایک عورت کی کہانی جس کے ساتھ شادی کے نام پر بہت بڑا دھوکہ ہوا تھا!
- 190 اسماء الحسنیٰ کامیابی بیہوش شاہ محمد قادری اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں سے آپ کے مسائل کا حل! کاراستہ
- 195 آخری لمحہ نعیم بیک ایک بازاری عورت کی کہانی، وہ اپنی محبت کی تذلیل برداشت نہ کر سکی!
- 203 گمانِ وفا شوکت افضل ایک شخص کی دلگداز کہانی، جس نے جنتِ نظیر زندگی کا خواب دیکھا تھا!

143 ساگون دیوتا کا مندر امیر امجد



آجائو کی محبتی لم کے ساتھ پیش آئے حیرت انگیز اور ہر اس واقعہ

54 رم جھم برسات اور اس کی بیماریاں



پھوٹی چھوٹی باتیں، بڑے بڑے فائدے کا راز نہیں!

79 نوری اور توکل جاوید راسی



ایک شخص کا لسانہ جس کے محنت کرنے والے ہاتھ بندوق اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے!

97 حقیقت کہانی محبوب، محبوب اور شوہر نواز خان



”وہ ایک مندی لڑکی تھی، اس نے ایک شخص سے تیسڑ کا بدلہ لینے کے لیے اپنی زندگی جتنم بنائی“

جلد نمبر 51 شمارہ نمبر 8 اگست 2014ء

زکن آل پاکستان نوزیبہ دوسو سائی

www.facebook.com/sayaradigest

Email: editorsayyara@yahoo.com

sayyaradigest@gmail.com

editorsayyara@hotmail.com

Phone: 92-042-37245412

Mobile: 0300-9430206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ
سیارہ ڈائجسٹ
لاہورمدیر اعلیٰ
امجد رؤف خان
مدیر منتظم
کامران امجد خان

مدیر : محمد ثاقب

معاون مدیران : جویریہ کامران - رونی خان - فرحان امجد

سرکولیشن منیجر : بشیر احمد

مارکیٹنگ منیجر : خرم احمد خان - 0333-4207684

نگران پرنٹنگ : خالد محمود

طابع : اللہ والا پرنٹرز شاہراہ قائد اعظم لاہور

0333-4207684

0300-4144781

0321-3758492

لاہور : خرم احمد خان -

طارق محمود -

کراچی : محمد عابد مرزا -

شعبہ اشتہارات

صغیرہ بانو شیریں رفیق غوری
ریاض آفندی فیاض عمر عارف محمود اہل

مجلس مشورہ

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر
240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا۔قیمت
80 روپے

www.paksociety.com

سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
 ✨ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
 ابنِ صفی کی مکمل ریخ
 ✨ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے
 کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرا لیں

twitter.com/paksociety1

اظہار خیال



اقبال بڑا اپڈیٹنگ ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا
کسی دانشور مفکر نے کہا تھا جو تو میں علم و عمل کو
چھوڑ کر روحانیت اور معجزات پر یقین رکھتی ہیں وہ
تو میں اپنا تشخص کھو بیٹھتی ہیں۔
(قلندر حسین سید / احمد پور شرقیہ)

کارآمد خطوط

محترم مدیر اعلیٰ امجد رؤف خان صاحب!
السلام علیکم! سب سے پہلے تو آپ کو اور آپ کے
ادارے کے لوگوں کو رمضان کی بہت بہت
مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی رحمتوں
کے سائے میں رکھے (آمین)۔ اس ماہ بذریعہ
ڈاک سیارہ ڈائجسٹ موصول ہوا۔ سوچا اس میں
میری کہانی ہوگی لیکن جب کھول کر دیکھا تو پرچے
میں نہ تو میری کہانی تھی اور نہ ہی شاعری تھی، بس
میرا خط لگا ہوا تھا۔ میں بڑی حیران ہوئی کہ اس
کے باوجود مجھے اعزازی پرچہ ارسال کیا گیا۔
اس عزت افزائی کے لیے میں آپ کی بہت
ممنون ہوں اور امید کرتی ہوں کہ اگلے شمارے
میں میری کہانی کو ضرور جگہ دی جائے گی۔ اب
اگر پرچے پر بات کروں تو سرورق سے لے کر
کہانیوں تک سب کچھ بہت اعلیٰ تھا۔ خاص طور پر
قارئین کے خطوط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سارے
خط روایتی خطوں سے ہٹ کر کچھ علم فراہم کرتے
ہوئے تھے جو کہ بہت ہی اچھا لگا۔ اچھا اب اس
امید کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اگلی دفعہ

تفرقہ بازی کیوں؟

مدیر منتظم ”سیارہ ڈائجسٹ“ السلام علیکم!
سیارہ ڈائجسٹ کا شمارہ جولائی ملا۔ جو، اب
زینت مطالعہ ہے۔ سرورق مولانا طارق جمیل
صاحب کی تصویر سے جھگڑا رہا تھا، کیا خوب!.....
ہماری دینی کتابوں میں مذکور ہے کہ حضرت رسول
کریم ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے بعد
آپ کی امت میں اچھے لوگ کون ہوں گے، تو
آپ نے فرمایا کہ ”علماء۔ اور پھر پوچھنے والے
نے پوچھا کہ بُرے لوگ کون ہوں گے، تو آپ
نے جواب دیا کہ، علماء۔“

ہم مانتے ہیں کہ ہمارا خدا ایک ہے اور رسول
ایک ہے اور کتاب ایک ہے تو پھر یہ تفرقہ بازی
کیوں؟ ڈاکٹر اقبال بھی ایسے علماء دین سے شاک
تھے جو تفرقہ بازی کرتے تھے۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں
اس کا اظہار ان کے بیٹے ڈاکٹر جاوید اقبال نے
بھی اپنی کتاب ”گریباں اپنا چاک“ میں کیا ہے۔
”یہ ایک حقیقت ہے ایک مسجد میں نور اور رحمت کی
ساری رات بارشیں ہوتی رہیں اور قرب میں ایک
بوڑھا بیمار نہ سوسکا۔“

ہمارے ہاں اکثر مولانا حضرات اپنی پارسائی
کے لیے ہر سال حج عمرہ کرتے ہیں۔ بڑی بڑی ایئر
کنڈیشن گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں جہاں پڑاؤ
کرتے ہیں وہاں بھی اے سی کی سہولت ہوتی ہے۔
ان کے گھر بھی ایئر کنڈیشن ہوتے ہیں۔ یہ سب
چیزیں کیا آپ سے مخفی ہیں؟

مضمون لکھا ہے مکمل طور پر پاکستانیت کا اظہار ہے شاہاش نوشاہہ، لیکن آپ نے بھی اپنے مضمون میں بھارت کو ”انڈیا“ ہی لکھا ہے اور حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ خود ”دستک“ میں بھی جناب امجد رؤف صاحب نے بھارت کو انڈیا کہہ کر مخاطب کیا ہے اس روش کو تبدیل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

(اقبال تبسم۔ راولپنڈی)

حوصلہ افزائی

محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری تحریر ”تھوڑا آسمان“ کو اپنے شمارے میں جگہ دی۔ زندگی سانپ سیرگی کے کھیل کی طرح ہے کبھی ”صفر“ تو کبھی آسمان..... اس آفت والے دور میں نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرنا قابل قدر جذبہ ہے۔ الفاظ کے خزانے کبھی انسان کو تنہا نہیں رہنے دیتے۔ اب ہمیں یقین ہوا، تعقید، تعریف کے سلسلے صلاحیتیں بڑھانے کی طرف پیش رفت کرتے ہیں۔ پچھلی تمام باتوں کی وجہ سے میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ آپ کا اور آپ کے تمام ادارے کا پھر سے بہت بہت شکریہ۔ اگست کے حوالے سے تحریر بھیج رہا ہوں۔ اسے شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

(محسن علی)

عید الفطر اور جشن آزادی

جناب محترم کامران امجد خان صاحب السلام علیکم! امید ہے مزاج گرمی بخیر ہو گا اماہ اگست کی آمد آمد ہے، آپ کو اور قارئین کو عید الفطر اور جشن آزادی کی مبارکباد۔ 14 اگست کے حوالے سے خصوصی تحریر دریا م سنگھ بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے اگست کے شمارے میں شامل اشاعت ہوگی۔ غزل

میری کہانی کو جگہ ملے گی۔ اللہ حافظ

(عطیہ زاہرہ/ لاہور)

بھارت کو ”انڈیا“ نہ کہیں

جناب کامران امجد خان صاحب! السلام علیکم! اللہ جی آپ کو صحت تندرستی دے (آمین)۔ کراچی ایئرپورٹ پر دہشت گردوں کا حملہ اور بھارت کا اس میں ملوث ہونا دوہری دہشت گردی ہے لیکن ہمارے سربراہ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے چکر میں ادھ موئے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ جب کہ ایک طرف وہ نہ صرف دہشت گردوں کو اسلحہ فراہم کر رہا ہے بلکہ وہ مملکت پاکستان پر اپنے خونی دانت بھی گاڑنے کے لیے اپنے ہتھ پھیلا رہا ہے۔ شہر دور میں بھارت کا آئین ترحیب پایا اور اسی آئین میں لکھا ہوا ہے کہ مارٹینیس، بھوٹان، سری لنکا، برما (میانمار)، بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان)، مالدیپ، نیپال اور پاکستان ایک انڈیا ہے۔ ان سب ملکوں پر بھارت جبراً قبضہ کر کے واپس ایک انڈیا بنائے گا جب ہندوستان یا انڈیا تقسیم ہوا تو ایک حصہ کا نام بھارت رکھا گیا دوسرا پاکستان بنا، ہماری قوم بڑے فخر سے بلکہ حکومتیں بھی، بھارت کو ”انڈیا“ یا ہندوستان کہتے نہیں تھکیں۔ یعنی پاکستان خود ہی تسلیم کر رہا ہے خدا خواستہ کہ بھارت دراصل انڈیا ہے جبکہ بھارت کے آئین میں واضح طور پر لکھا ہے کہ انہوں نے بھارت کو مذکورہ ملکوں پر قبضہ کر کے ”انڈیا“ بنانا ہے۔ اگر ضیاء الحق تھوڑا عرصہ اور زندہ رہ جاتے تو خود بھارت کے کئی ٹکڑے ہو چکے ہوتے اور انشاء اللہ آج نہیں تو کل بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہو گا۔ مدیر صاحب آپ نے صفحہ 139 پر محترمہ نوشاہہ اختر صاحبہ کا مضمون ”کسی کی ڈنکی پر میرا داگ“ شائع کر کے دل خوش کر دیا ہے، نوشاہہ نے زبردست

ہے کہ یہ قارئین کی آراء کو خاص اہمیت دیتا ہے اور میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی ہے کہ آپ تمام قارئین اور لکھنے والوں کو مکمل کر آزادی اظہار رائے کا حق دیتے ہیں خواہ اُن کی بات ادارہ کے خلاف ہی کیوں نہ جاتی ہو۔ دوسرے شماروں میں یہ چیز عطا ہے۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہوں گا کہ سیارہ ڈائجسٹ علم و ادب کی بے حد خدمت کر رہا ہے۔ مجھے بالخصوص قلندر حسین صاحب کا سلسلہ ”خود جلیس دیدہ اغیار کو پینا کر دیں“ بے حد پسند ہے، اُن کے سلسلے سے ہمیں بہت سی معلومات افزاء باتیں حاصل ہوتی ہیں، وہ ایک ہی جگہ بے شمار ”لکھنے“ جمع کر دیتے ہیں۔

(محمد رفیق اعظم / کراچی)

صغیرہ بانو شیریں کی باتیں

مکرمی مدیر صاحب! السلام علیکم! میں ایک گھریلو خاتون ہوں اور مطالعہ میرا شوق بھی ہے اور عادت بھی۔ سیارہ ڈائجسٹ کئی سال سے باقاعدگی سے زیر مطالعہ ہے۔ میں اکثر یہ محسوس کرتی تھی کہ اس میں ادب اور کہانیوں پر مبنی مواد تو بخوبی موجود ہوتا ہے مگر خواتین کی نمائندگی ذرا کم ہوتی ہے مگر گزشتہ کچھ شماروں سے آپ نے ہمارا یہ گلہ دور کر دیا ہے۔ آیا صغیرہ بانو شیریں کی آمد سے سیارہ ڈائجسٹ کی محفل میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ وہ بے حد کارآمد گھریلو نسخے بتاتی ہیں اور عام فہم انداز میں ہمارے لیے معلومات مہیا کر دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے میری طرح بے شمار قاری خواتین اُن کی باتوں سے مستفید ہوتی ہوں گی۔ امید ہے وہ سیارہ ڈائجسٹ کے صفحات کو اپنی تحریروں سے رونق بخشتی رہیں گی۔

(ریحانہ قادر / سرگودھا)

اور مراسلہ بھی ارسال خدمت ہے۔ براہ کرم قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو سیارہ ڈائجسٹ کے شاف اور تمام لکھنے والوں اور تمام پڑھنے والوں کو دعا سلام۔ اپنا خیال رکھئے گا۔

(ایس امتیاز احمد / کراچی)

مسیحا آگے بڑھیں

محترم مدیر اعلیٰ صاحب! السلام علیکم! جولائی کے شمارے میں مولانا طارق جمیل صاحب کے بیان پڑھے۔ یقین جانیں جی چاہا ابھی ان سے جا کے ملوں۔ میرے دل میں تو ہر وقت ایک ہی دعا ہے۔ ایسے لوگ آگے بڑھیں تاکہ اس ملک کو بدل سکیں۔ ہم اسلام سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ ہمیں ایسے مسیحا چاہئیں جو ہمارے مُردہ جذبات کو بیدار کر سکیں۔ جو ہمیں پر احساس دلا سکیں کہ ہم کس مذہب کے پیروکار اور کس نبی کی اُمت سے ہیں۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر عالم فاضل نہیں اس لیے کچھ بھی کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ اللہ طارق صاحب کو سلامت رکھے اور ایسے طارق جمیل اور بھی پیدا ہوں (آمین) عاؤں کے ساتھ۔

(نوشابہ اختر)

آزادی اظہار رائے

محترم امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ ہمارا پسندیدہ شمارہ ہے، میرے ابو خود بھی علم و ادب سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہمارے گھر میں بہت سے رسائل و جرائد آتے ہیں مگر سیارہ ڈائجسٹ کو ان سب میں خاص مقام حاصل ہے۔ یہ ہمارے گھر میں قریب 25 سال سے آرہا ہے۔ اس کے تمام خصوصی نمبر بھی ابو کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ کا خاصا یہ

لنا، اُن کو دیکھنا اور ان سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ لیکن آپ نے انھیں نئی نویلی ذہن کی طرح ہزاروں پردوں کے پیچھے چھپا کر رکھا ہے۔ ایسا کر کے آپ سیارہ ڈائجسٹ کے قارئین کے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ مہربانی کر کے کبھی اُن کی فونو کے ساتھ اُن کا مختصر سا انٹرویو شائع کرتے رہیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو بہت جلد قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے ذہنوں میں نواز خان صاحب ایک حقیقی شخصیت کی بجائے ایک افسانوی شخصیت بن جائیں گے۔

(محمد کمال/مردان)

☆ کمال صاحب، نواز خان صاحب کی تصویر شائع کرنے یا قارئین سے اُن کا رابطہ کروانے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں، مگر نواز خان صاحب خود اپنی شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی تصویر شائع کروانا انھیں پسند ہے۔

مولانا طارق جمیل کی باتیں

مکرمی و محترمی جناب ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! اس شمارہ میں ”سیارہ رپورٹ“ میں مولانا طارق جمیل صاحب کے بارے میں بہت ایمان افروز اور معلومات افزا تحریر پڑھنے کو ملی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ لیکن ایک شکایت بدستور ہے کہ لگتا ہے آپ نے اپنے کمپوزر کو تنبیہ نہیں کی کہ کتابت کی غلطیاں اب بھی موجود ہیں۔ محترمہ شوکت افضل صاحبہ کی تحریر ”ہنی مون“ میں کتابت کی غلطیوں نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ محترمہ صغیرہ بانو شیریں کی بزم اظہار خیال میں آمد پر خوش آمدید۔ سیارہ ڈائجسٹ کے عملہ اور قارئین کو عید مبارک۔

(زاہدہ یوسفی۔ لاہور)

نواز خان اور شوکت افضل کی تحریریں

محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کو پچھلے ایک برس سے باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ ایک دوست کے ذریعے اس سے تعارف ہوا اور پھر اس نے مجھے اپنا گردیدہ کر لیا۔ مجھے محترم نواز خان اور محترمہ شوکت افضل صاحبہ کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ یہ دونوں اس قدر جاندار کہانیاں لکھتے ہیں کہ قاری ان کے سحر سے نہیں نکل پاتا۔ پھر ان کی تحریروں کا خاصا ہے کہ کردار آپ کو بالکل حقیقی اور اپنے آس پاس موجود محسوس ہوتے ہیں۔ ان دونوں سے ملاقات کی شدید خواہش ہے، اگر کسی طرح ممکن ہو سکے تو ضرور بتائیے۔

(نعیم الحسن/پشاور)

امن و سکون

محترم جناب ایڈیٹر! السلام علیکم! جولائی کا شمارہ نظر سے نہیں گزرا، چھوٹے بچے کی بیماری کی وجہ سے خریدنے نہیں جاسکی یکم جولائی کو مئی تو ملا نہیں۔ بہر حال آپ کے پاس اگر کوئی ہو تو بھجوا دیں۔ تبصرہ نہیں کر سکتی کیونکہ ہمیشہ سیارہ سامنے رکھ کر خط لکھتی ہوں آج عجیب لگ رہا ہے اس کے بغیر لکھنا۔ جولائی میں رمضان اور عید الفطر کے بابرکت لمحات آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان میں امن و سکون کے ساتھ وہ لمحات لائے اور اپنی خاص رحمتوں سے نوازے پاکستان کو امن کا گہوارہ بنائے اور عوام کو صبر عطا کرے۔ اقوام عالم میں پاکستان کا مقام اونچا کرے۔ آمین ثم آمین۔ والسلام دعا گو!

(یاسمین کنول)

نواز خان سے ملاقات

محترم جناب امجد رؤف خان السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کا ہر قاری نواز خان صاحب سے

سیارہ ڈائجسٹ کی سالانہ خریداری کیلئے بیرون ملک بدل اشتراک

6000/-
روپے

(1) سعودی عرب، کویت، اردن، سری لنکا، ابو ظہبی، بحرین، دوحہ، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت۔

6000/-
روپے

(2) سوڈان، یوگنڈا، لیبیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، ملائیشیا، سوئزرلینڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی۔

7000/-
روپے

(3) آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، ونیزویلا، یونان، امریکہ، نودو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا،ارجنٹائن، میکسیکو، گریناڈا۔

◀ بیرون ملک وی پی نہیں جاتی۔ رقم پہلے بھجوائیں۔

◀ کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار کو ادا کرنا ہوگا۔

◀ ڈرافٹ سیارہ ڈائجسٹ لاہور کے نام ارسال کریں۔

240 مین مارکیٹ، ریواڑ گارڈن لاہور۔

فون: 0423-7245412

E.mail: sayyaradigest@gmail.com

سیارہ ڈائجسٹ



قانون توڑنے کا فیشن.....

وہ بہت غصے میں تھے، دفتر سے آتے ہی انہیں اس قدر غضبناک دیکھ کر ہم سب حیران بھی تھے اور کچھ فکر مند بھی۔ بالآخر میں نے ہمت کی اور ان سے غصے کی وجہ دریافت کی۔ میں حیران تھا کہ ہمیشہ دھیمے مزاج کے مالک نظر آنے والے مقصود صاحب کو کس بات پر اس قدر غصہ آیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ بتایا وہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے، کیونکہ ہم سب اس طرح کے تجربات سے گزرتے ہیں اور اپنی آنکھوں کے سامنے قانون کی دھجیاں اڑاتے لوگوں کو بے بسی سے دیکھتے ہیں۔

مقصود صاحب نے بتایا کہ وہ اپنی گاڑی پر ایک انتہائی معروف شاہراہ سے گزر رہے تھے۔ ایک ٹریفک سگنل پر سبز بتی ہوتے ہی جیسے ہی انہوں نے اپنی گاڑی آگے بڑھائی، اچانک ایک موٹر سائیکل سوار بائیں جانب سے انتہائی تیز رفتار سے نمودار ہوا اور دائیں طرف جانے کے لیے ان کی گاڑی کے سامنے آگیا۔ اس کی یہ حرکت اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھی کہ مقصود صاحب کوشش کے باوجود گاڑی کو موٹر سائیکل سے ٹکرانے سے نہ بچا سکے۔ نتیجتاً وہ لڑکا تو بچ سڑک پر گرا ہی، مقصود صاحب کی گاڑی کی ہیڈ لائٹ بھی ٹوٹ گئی اور بمپر کو بھی نقصان پہنچا۔ جس بات پر انہیں زیادہ غصہ آیا وہ یہ تھا کہ موٹر سائیکل سوار کو اپنی اس غلطی پر کوئی ندامت نہ تھی، اُلٹا وہ ان سے بدتمیزی پر اتر آیا تھا۔

مقصود صاحب کے ساتھ پیش آیا یہ واقعہ اس جموٹی رویے کا عکاس ہے جسے ہم ہر روز سڑکوں پر عملی طور پر دیکھتے ہیں۔ دوران ڈرائیونگ لوگ ٹریفک قوانین کی قطعی پرواہ نہیں کرتے۔ جس طرف سے چاہا اور ٹیک کر لیا، جب جس لین میں دل چاہا گاڑی موڑ لی۔ حتیٰ کہ ون وے اور سگنل کی خلاف ورزی سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ اسی پر بس نہیں قانون کی خلاف ورزی کرنے والا کسی قسم کی شرمندگی محسوس کرنے کی بجائے اُلٹا اکثر تا اور دوسروں کو آنکھیں دکھاتا ہے۔ سب سے زیادہ خوف موٹر سائیکل سواروں سے محسوس ہوتا ہے۔ جو اچانک دائیں یا بائیں سے نمودار ہوتے ہیں اور سامنے سے ”زگ زگ“ کی طرح گزر جاتے ہیں۔ موٹر سائیکل سوار خود کو ہر قانون سے آزاد تصور کرتے ہیں۔ ہیلٹ نہیں پہنتے، سگنلز کا خیال نہیں کرتے، غلط اور ٹیک کرتے ہیں، رش اور معروف سڑک پر بھی اپنے کرتب دکھانے لگتے ہیں۔ ان کی ایک چھوٹی سی غلطی اکثر بہت بڑے حادثہ کا باعث بن جاتی ہے۔

معاشرتی نظام کو احسن طور پر چلانے کے لیے ہر ملک کچھ قوانین تشکیل دیتا ہے، جس کی پابندی ہر خاص و عام پر لازم ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی قوانین تو موجود ہیں مگر ان کی پابندی کوئی نہیں کرتا۔ جو جتنا طاقتور ہے، خود کو اتنا ہی قانون سے بالاتر تصور کرتا ہے۔ قوانین کی خلاف ورزی اور ان کا منہدم اڑانا اب ہمارا معاشرتی مزاج بن گیا ہے، جو معاشرے میں بڑھتے بگاڑ کی اہم ترین وجہ ہے!

قوانین کی خلاف ورزی صرف ٹریفک تک محدود نہیں بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں یہ رویہ ہمارے ملک میں عام نظر آتا ہے۔ چند ماہ پہلے کی بات ہے، ایک دوست کے گھر جانا ہوا۔ اُسکے گھر کے سامنے ایک بڑے سے پارک میں کوئی تقریب جاری تھی، جس میں کوئی میوزک بینڈ تمام تر ”بینڈ باجوں“ کے ساتھ موسیقی کے سڑوں کی بجائے ”شور“ بکھیر رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میرے پوچھنے پر دوست نے بتایا کہ اُن کے ہمسایہ میں ایک ایس بی صاحب رہتے ہیں۔ اُن کے بیٹے کی شادی ہے۔ آج تیسرا روز ہے، اسی طرح موسیقی کی محفل رات بارہ ایک بجے تک جاری رہتی ہے۔ ہم سب گھر والے تو بہت ڈسٹرب ہیں، میں نے صبح دفتر اور بچوں نے سکول جانا ہوتا ہے مگر تیز موسیقی کی آواز سونے ہی نہیں دیتی۔ انہیں روکنے والا بھی کوئی نہیں۔

قانون معاشرے کو مہذب اور منظم بنانے کے لیے ہوتا ہے مگر ہم لوگ قوانین توڑنے میں لطف لیتے ہیں۔ ایک صاحب نے اس حوالے سے دلچسپ واقعہ سنایا۔ کہنے لگے ”گزشتہ دنوں امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بہت سی دلچسپیاں اور رنگینیاں تھیں۔ جدید اور ترقی یافتہ دنیا کے حیرت انگیز مظاہر بھی دیکھنے کو ملے، مگر پھر بھی ہمیں وہاں مزہ نہیں آیا۔“ تنگی کا احساس ہوتا رہا۔“ وجہ پوچھنے پر وہ صاحب کہنے لگے۔ ”اصل بات یہ ہے کہ وہاں پاکستان جیسی آزادی، بے فکری نہیں تھی۔ سڑک پر پیدل چلتے بھی قوانین کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ راہ چلتے تھوک نہیں سکتے، جوس، چپس اور سگریٹ کے خالی پیکٹ کہیں بھی پھینکنے کی عیاشی بھی میسر نہ تھی۔ بس، ٹرین کی ٹکٹ لینی ہو یا سوار ہونے کا مرحلہ۔ دونوں صورتوں میں دوسروں کو دھکم پیل کے ذریعے پیچھے ہٹا کر خود آگے بڑھنے کا حزمہ ہی نہیں لیا جاسکتا، بلکہ جہاں تین لوگ جمع ہوتے ہیں خود بخود قطار بنا لیتے ہیں۔ گاڑی میں سفر کر رہے ہو تو کوئی ہارن نہیں بجاتا، کسی کے ساتھ آگے بڑھنے پر ٹکرا نہیں ہوتی بلکہ لوگ خود جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ سگریٹ پینے کے لیے مخصوص مقام تلاش کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان جیسی آزادی تو کہیں نظر ہی نہیں آتی۔ ہر وقت قانون کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

سوال یہ ہے کہ ہم لوگ قوانین پر عمل کیوں نہیں کرتے، جب کہ دنیا کی دیگر قومیں قانون کی بالادستی کا سہارا لے کر ہم سے آگے نکل گئی ہیں۔ ایک اور دلچسپ امر یہ ہے کہ ہم پاکستانی اپنے ملک میں تو قوانین کی پابندی نہیں کرتے مگر جب بیرون ملک جاتے ہیں تو قوانین کی پابندی کرنے لگتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ قوانین کی پاسداری کرتے ہیں۔ انہیں قانون پر عملدرآمد کرتے دیکھ کر ہم پاکستانیوں کو بھی ویسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ وہاں خلاف ورزی پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں، اور قانون صرف نام کا قانون نہیں ہے بلکہ فوراً حرکت میں آتا ہے۔ آپ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کریں تو فوراً بھاری جرمانہ لگ کر آجاتا ہے۔ سڑک پر کوڑا کرکٹ پھینکیں تب بھی آپ کی بچت نہیں ہو سکتی اور پھر قوانین سب کے لیے ایک جیسے ہیں، کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

ہمارے ہاں قوانین پر عملدرآمد نہ کرنے کی دو اہم وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے

نااہل اور فرائض سے لاپرواہ ہیں اور دوسرا یہ کہ قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں ہے۔ جب کچھ لوگ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں یا خود کو قانون سے بالاتر تصور کرتے ہیں تو انہیں دیکھ کر دوسرے لوگوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ پھر ان بااثر لوگوں کے رشتہ دار، اہلخانہ، دوست احباب بھی خود کو قانون سے بالاتر تصور کرنے لگتے ہیں اور یوں یہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کو قانون توڑنے پر سزا نہیں ملتی۔ ٹریفک سگنل توڑنے والے شخص کو اگر یہ پتہ ہو کہ وہ قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا اور اس جرم کے نتیجے میں اُسے بھاری جرمانے کے ساتھ سزا بھی ملے گی تو وہ کبھی ایسا نہ کرے۔ مگر یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ یہی حال دیگر جرائم کرنے والوں اور قوانین کی وجہیں اُڑانے والوں کا ہے، وہ قانون توڑتے ہیں اور اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے سزا سے بھی بچ جاتے ہیں۔ بالفرض کبھی پکڑے بھی جائیں تو عدالتی نظام ایسا ہے کہ مجرم کے بچ نکلنے کے بے شمار راستے ہیں۔ پھر سزا ہوتے ہوئے برسوں لگ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بااثر لوگ خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ گزشتہ دنوں اس کی عملی مثال اُس وقت دیکھنے میں آئی جب ایک سیاہ شیشوں والی پجارو کو سکیورٹی اہلکاروں نے تاک کے پر روک کر تلاشی لینے کی کوشش کی۔ پجارو میں بیٹھے افراد نے تلاشی دینے سے انکار کرتے ہوئے دروازے لاک کر لیے۔ بعد ازاں اعلیٰ افسران کو خود موقع پر آنا پڑا۔ تب معلوم ہوا کہ پجارو میں بیٹھے افراد کسی رکن اسمبلی کے رشتہ دار تھے اور انہوں نے اس بات پر بہت بُرا منایا تھا کہ سکیورٹی اہلکاروں نے انہیں کیوں روکا حالانکہ اُن کی گاڑی پر رکن اسمبلی کی نمبر پلیٹ بھی لگی ہوئی تھی۔ دوسری طرف سکیورٹی اہلکاروں کا موقف تھا کہ گاڑی کے شیشے سیاہ کرنا ایک جرم ہے اور پھر گاڑی کی تلاشی نہ دیکر بھی گاڑی میں بیٹھے افراد نے قانون کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی۔

قانون کی حکمرانی کا سبق ابتداء سے پروان چڑھتا ہے۔ قومیں اپنی اقدار اور روایات کے مطابق قوانین تشکیل دیتی ہیں اور پھر ان پر عملدرآمد یقینی بنانے کے لیے ایک نظام وضع کرتی ہیں۔ پھر معاشرے کے ہر فرد کو ان قوانین پر عملدرآمد کرنا پڑتا ہے کیونکہ ابتداء سے اُن کو یہ باور کر دیا جاتا ہے کہ قوانین اُن کی بہتری اور آسانی کے لیے ہیں۔ ان پر عمل کرنے میں ہی اُن کا فائدہ ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم قوانین کے نفاذ کے لیے نظام تشکیل نہیں دے سکے۔ پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ہم جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کر سکے۔ نتیجتاً یہ ادارے فعال کردار ادا کرنے میں ناکام ہیں۔ اسی طرح ہم لوگوں کو یہ شعور نہیں دے سکے کہ قانون کی پابندی ہماری ذمہ داری ہے اور ہمارے ہی فائدے کے لیے ہے۔ نیز سب کے لیے یکساں قانون اور قانون کی بالادستی کو تسلیم کرنے کا کلچر فروغ دینے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لیے سخت سزاؤں کا اطلاق اور عملدرآمد یقینی بنا کر بالخصوص قانون توڑنے والے بااثر افراد کو سخت سزائیں دی جائیں تو نظام خود بخود ٹھیک ہونا شروع ہو جائے گا اور پھر بتدریج قوانین کی پابندی کا کلچر فروغ پا جائے گا۔

(امجد رؤف خان)



بسم الله الرحمن الرحيم

کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مددے!

اردو کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں سے انتخاب

مشتاق احمد یوسفی..... ادبی کٹہرے میں!

۱۔ اس نے اردو مزاح کو اس مشکل مقام پر پہنچا دیا ہے جس سے آگے لے جانا کسی دوسرے مزاح نگار تو کیا اس کے اپنے بس میں بھی نہیں۔ میرا دوست مسٹر انو تو یہاں تک کہتا ہے کہ یہ کتابیں اس کی اپنی لکھی ہوئی ہی نہیں جس کا جواز اس کے پاس یہ ہے کہ اگر یہ کتابیں ملزم مصنف نے خود لکھی ہیں تو ایسی دو تین کتابیں اور لکھ کر دکھائے۔

۲۔ اس نے بعض شعراء کے متعدد اشعار اور مصرعوں کو ہلکے سے رد و بدل سے اپنی تحریروں میں یوں استعمال کیا ہے کہ اب وہ اشعار اور مصرعے اصل شعراء کے معلوم ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض مصرعوں کو توہوں کاٹوں قبضے میں لے لیا ہے۔ ایک مثال دیکھئے:-

بینک میں لکھتے سب انگریزی میں تھے، گفتگو اردو میں، لیکن گالی ہر شخص اپنی مادری زبان میں ہی دیتا:۔
زبان خیر سے کیا شرح آرزو کرتے

یہ مصرع جب بھی سنیں گے آتش یاد آئے نہ آئے، مشتاق یوسفی ضرور یاد آئے گا یعنی چوری اور دماغ زوری۔
۳۔ اس نے اردو زبان کے محاورات، ضرب الامثال اور روزمریوں کو اس مہارت سے بگاڑا ہے کہ اب وہ اپنی اصلی شکل میں مزاحی نہیں دیتے۔

۴۔ اس نے بعض نامور لکھنے والوں کے اسالیب کو نہایت چالاکی سے گھلاما کر ایک طغوبہ تیار کیا اور اسے کئی آشتی کر کے اپنے نام سے پیش کر دیا۔

۵۔ اس نے قارئین کو اپنی تحریروں کے ذریعے ایسا نشہ فراہم کیا ہے جو بندہ ان کو سمجھ کے پڑھ یا پڑھ کر سمجھ لیتا ہے، اس کا کسی اور مزاحیہ تحریر میں دل ہی نہیں لگتا۔

۶۔ لوگ اس کی کتابیں اتنی بے دردی سے خرید اور بیچ رہے ہیں جس سے کئی دوسرے لکھنے والوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

(تحریر: مشتاق احمد یوسفی)

حجر فہ ہفت بلا

زینت مینشن میں ایک تنگ و تاریک سی کیمن تھی جس میں ڈھنگ کی ایک میز بھی اسی صورت میں سما سکتی تھی کہ کرسی کا کھڑاگ نہ ہو۔ اس میں چار آدمیوں کی شانہ بشانہ نشست کا اس طرح اہتمام کیا گیا تھا کہ دیوار میں چیز کا ایک آٹھ فٹ لمبا، ڈیڑھ فٹ چوڑا تختہ کیلوں سے جڑ دیا گیا تھا۔ جسے کاؤنٹر کہتے تھے۔ اس لیے کہ ڈکسٹری میں اس شے کے لیے کوئی علیحدہ لفظ نہیں تھا۔ بیٹھیں تو کھوے سے کھو، زانو بلکہ قلم سے قلم چھلتا تھا۔ جب تک دونوں سروں کے آدمی زور لگا کر خود کو اپنے جڑواں پڑوسی سے علیحدہ نہ کر لیں۔ بیچ والے آٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ سب باجماعت اٹھتے بیٹھتے تھے۔ بغیر ٹوئس دائیں بائیں سر ہلا کر لطیف کی داد دینے کی اجازت نہ تھی۔ سو سال پرانی چھت پر چھپکی بھی ذرا بے احتیاطی سے چلتی تو ہمارے سر پر پلستر کے لیوڑے گرتے۔ دیوار بوسیدہ اور پتیلی پتیلی۔ کچلیں بار بار اُکھڑ جاتی تھیں۔ بیشتر وقت ہم تختہ کو گود ہی میں لیے بیٹھے رہتے۔ اس بلیک ہول میں کسی طرف سے روشنی کا گزر نہ تھا۔ ہوا کے جھونکے البتہ ہاتھ روم سے گزر کر برابر آتے اور ہر دفعہ تازہ بد بو لاتے۔ مکھی اور مچھر یہاں زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ کھٹلوں کا ذکر ہم نے عدا نہیں کیا، اس لیے کہ ان کے جو ہر اؤل دستے کارلوں پر ریگتے ہوئے پکڑے گئے، وہ مقامی نہ تھے۔ ان کے خون کے معائنے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کا تعلق اہالیان ہیرالپی بخش کالونی، لالو کیت اور آرٹیری میدان کے ”بلڈ گروپ“ سے ہے۔ دور ترین کو نے میں 15 واٹ کا ایک تنگا بلب لٹکا ہوا تھا۔ (15 واٹ سے کم کے بلب اس زمانے میں دستیاب نہ تھے)۔ اُسے تسلی سے کھینچ کر ایسے غیر جانبدارانہ نقطے پر لے آئے تھے کہ سب کو یکساں طور پر دھندلا نظر آئے۔ یہ بینک کا رجسٹرڈ آفس اور چیف اکاؤنٹنٹ کا دفتر تھا۔ کلرک تو خیر اپنا علیحدہ علیحدہ وجود رکھتے تھے لیکن تینوں افسر ایک ہی قیص چٹون کے کوزے میں بند تھے۔ بینک میں ملازم ہوئے ہمیں مشکل سے تین سال ہوئے ہوں گے کہ اینڈرسن نے ازراہ مرحمت ہمیں چیف اکاؤنٹنٹ بنا دیا۔ سیکرٹری اور انسپکٹر آف برانچز کے عہدوں پر ہم پہلے سے ہی فائز تھے۔ ہماری دن دوئی رات تنگی ترقی سے بینک کو کل 15 آنے کا نقصان ہوا۔ اس لیے کہ تین ربر اسٹامپ بنوانے پر اس زمانے میں یہی لاگت آتی تھی۔ جیسا کہ ہم تفصیل سے کہیں اور بیان کر چکے ہیں، اس ترقی سے ہر چیز میں ایک خوشگوار تبدیلی آگئی سوائے تنخواہ کے۔ وہ بدستور ہی رہی۔

اینڈرسن ڈسپن، دفتری آداب اور ضابطہ کا اس قدر پابند تھا کہ کبھی ہمیں نام لے کر نہیں بلاتا تھا۔ بلکہ کاغذات کی نوعیت دیکھ کر چہرہ اسی کو حکم دیتا کہ ”انسپکٹر آف برانچز کو بلاؤ“۔ ”کمپنی سیکرٹری کو سلام دو“۔ ”ایکڈم چیف اکاؤنٹنٹ کو حاضر کرنا مانگنا“۔ اور جس حیثیت سے طلب کرتا، صرف اسی کے متعلق سوال کرتا۔ دوسرے عہدے سے متعلق کچھ پوچھنا ہوتا تو تین منٹ کا وقفہ دے کر دوبارہ طلب کرتا۔ ایک دفعہ اس نے ایک گوشوارے میں، جسے ہم نے خود بنا کر خود ہی، بحیثیت چیف اکاؤنٹنٹ، چیکنگ کے دستخط کیے تھے، ایک موٹی سی غلطی پکڑی اور ہمیں دھمکی دی کہ میں چیف اکاؤنٹنٹ کے کام کے ابھی انسپکٹر آف برانچز سے سر پر انز چیکنگ کروا کے پرچے اُڑوا دوں گا! ہم خود کوزہ کوزہ گرد و گل کوزہ ہی نہیں، کوزہ جھکن بھی تھے۔ کبھی اظہار خوشنودی کرنا ہوتا تو یہ نہیں کہتا تھا کہ میں تمہارے کام سے خوش ہوں، بلکہ فقط اتنا اعتراف کرتا کہ جزل فیجر سر دست انسپکشن ڈپارٹمنٹ واحد پر مشتمل تھا اور اس کی علیحدہ دوات تک نہ تھی۔ ویسے تو گھنٹی بھی نہ تھی، لیکن اس کی گئی ہم نے کبھی محسوس نہ کی۔ اس لیے کہ

اسے بجا کر بلانے کے لیے کوئی علیحدہ چہرہ ہی نہ تھا۔ ایک مشترکہ چہرہ ہی کو اپنی جیب خاص سے چار روپے ماہوار دیتے تھے۔ وہ ہمیں صبح و شام سلام کرنے کے علاوہ کبھی کبھی دفتری کام بھی کر دیتا تھا۔

ہماری ضد و جھد

آخر الذکر ترقی سے پہلے، ہمیں یاد نہیں کہ ڈھائی تین برس تک کبھی گیارہ بجے رات سے پہلے بینک سے فراغت ہوئی ہو۔ اتفاق سے کبھی سات آٹھ بجے گھر پہنچ جاتے تو بیگم پریشان اور ہم سکول سے بھاگے ہوئے بچے کی طرح کھسپانے ہو جاتے۔ ”الہی خیر! طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ کام کبھی اتنا زیادہ ہوتا کہ ایک ڈیڑھ بجے تک ختم ہونے کی صورت نظر نہ آتی تو نیند اڑانے کی گولیاں کھا لیتے تھے۔ ہمیں ان گولیوں سے ساجد صاحب نے متعارف کروایا تھا۔ جو ایک کلیرنگ فاروڈنگ انجینیئر میں ملازم تھے۔ دن بھر درآمدی مال چھڑواتے اور رات کو یہ گولی کھا کر جہازوں پر درآمدی مال لے دواتے۔ لیلۃ القدر اور 10 شعبان کی نظائیں پڑھتے۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ گزشتہ رات کی جگہ سے غلط حال ہو کر ہم نے سرشام ہی گولی کھائی۔ خلاف اندازہ، کام دس بجے ہی ”نبڑ“ گیا اور گھر آ کر ہم چار پائی پر صبح تک آنکھیں پھاڑے طبی سائنس کے کمالات پر غور کرتے رہے۔ جزل منجر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک شاک انجینئر کی بینک کے شیئرز (حصص) کی قیمت نہیں بڑھے گی، عملے میں ایک چہرہ ہی کا بھی اضافہ نہ ہونے دیا جائے گا۔ ادھر کراچی شاک انجینئر ہماری بددعائے نیم شمی سے ڈرنے والا نہیں تھا۔

کافی عرصے تک کھڑے ہو کر اونچے کاؤنٹر پر خود کام کیا یا اوروں کا چیک کیا۔ رفتہ رفتہ صحت گری تو شام تک عیروں پر اتنا گرم آ جاتا کہ سات بجے کے بعد جوتے اتارنے پڑتے۔ چند مہینوں سے سینے میں بھی دائیں طرف درد رہنے لگا تھا جس کا نوٹس لینا ہم نے کسر شان سمجھا۔ اس لیے کہ دل تو بائیں طرف ہوتا ہے۔ تکلیف نے جب اتنی شدت اختیار کی کہ محسوس ہونے لگا چوبیس گھنٹے کوئی بڑے سے سینہ چھید رہا ہے کہ پیٹھ کے آر پار ہوا جاتا ہے تو ایک ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے نرمی سے کہا کہ دایاں پیچھے اماتر معلوم ہوتا ہے۔ پوچھا کا ہے؟ رکھائی سے بولا ”آف کورس، ٹی بی“۔ فوراً ایکس رے، خون اور تھوک ٹیسٹ کروانے اور تین مہینے کی رخصت پر کوئٹہ یا مری جانے کی ہدایت کی۔ ڈیڑھ سال بعد جب ہماری مالی تکالیف میں افاقہ ہوا تو ایکس رے کروایا۔ اس سے تصدیق ہوئی کہ دائیں پیچھے دردوں پر ایک زخم تھا جو کبھی کا خود بخود مندمل ہو چکا ہے۔ اس سے ہمیں اپنی قوت ارادی کی مضبوطی کی داد مطلوب نہیں، بلکہ ٹی بی کے جراثیم کی نقاب کشائی اور بودا پن دکھانا مقصود ہے۔

اس زمانے میں اس روٹ پر کل تین لنگڑی بسیں چلتی تھیں۔ ایک تو کافی بھی تھی۔ وہ بھی دس بجے بند ہو جاتی تھیں۔ دن بھر اس کے بیچ سڑک پر مسافروں کے دھکوں اور مشوروں سے مرمت ہوتی اور رات کو ٹیس کی لائٹیں کی روشنی میں مالک خود ان کی آنت اوچھڑی باہر نکال کر معائنہ و پلاسٹک سرجری کرتا تھا۔ دس بجے کے بعد رکشا، جس میں سائیکل سوار بٹا ہوتا تھا۔ میکوڈروڈ سے پیر الہی بخش کالونی تک دس آنے سے کم میں نہیں ملتا تھا۔ یاروں کی جیب میں اتنے فالٹو پیسے ہوتے تو دوپہر کا کھانا ہی نہ کھا لیتے۔ یا کم از کم سگریٹ کے دوکڑے کر کے تو نہ پیتے لیکن جب سے ایک کروڑ پتی دل کے مریض کو سگریٹ کے تین کڑے کر کے سونے کے سگریٹ ہولڈر

میں اُڑس کر پیٹے دیکھا تو اپنے ٹوٹوں کے سائز پر رشک آنے لگا۔ اکثر سات میل پیدل ہی گھر جانا پڑتا۔ خواہ رات کے تین بج جائیں، آندھی آئے، بارش آئے۔۔۔ اور چاہے تو بس ہی کیوں نہ آجائے۔ ہم گھر ضرور جاتے تھے۔ حالانکہ بینک میں کس چیز کی کمی تھی۔ لکھو کھا رو پیہ، پٹکے، کمر سیدھی کرنے کے لیے میزیں، حفاظت کے لیے سنتری، رات بھر کام کرنے کے بعد صبح منہ دھونے اور اسے دیکھنے کے لیے واش بیسن اور آئینہ۔۔۔ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے۔ بیوی کے سوا۔ لیکن صاحبو! جو شکھ چھجھو دے چو بارے، اودہ نہ بخ نہ بخارے۔ گھر پہنچے تو بیوی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھتی۔ تام چینی کے تسلے میں سہا سہاتا گرم پانی اور دو چھچھے نمک ڈالتی اور ہم اس سلونے تسلے میں سانولے پاؤں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ کسی نے بتایا کہ اس سے پیروں کی سوجن اتر جاتی ہے۔ ٹھیک ہی ہوگا، اس لیے کہ صبح آئینے میں چہرہ کافی ستا ستا نظر آتا تھا۔ صبح بھی اتنی ٹکان محسوس ہوتی گویا شام ہو۔ مشقت سی مشقت! آٹھن اور ایسی آٹھن کہ ایک ایک مسام میں اتر جائے اور ہڈیوں تک کو چٹھا دے۔ رواں رواں کراہنے لگتا۔ کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا اب کے ایسے سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں۔

کچھ اڑھا دیتے مولانا مجھے نیند آتی ہے

پھر کھانا گرم کیا جاتا اور دونوں ساتھ کھاتے۔ وہ ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھانے لگی تھیں۔ تنخواہ دونوں بچیوں کے دودھ کے ڈبوں کے برابر! البتہ سکول کے مالک کی ہنگامی تنخواہ کی رسید دینی پڑتی تھی (چار سال سے اس کی پشن رُک ہوئی تھی) ہمارے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا کہ کوئی یہ نہیں بتائے گا کہ دن کیسا کٹا۔ ان کے لیے ہمارے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا ان کا سہاگ رہتی دنیا تک قائم رکھے۔ انہوں نے ہماری عادتیں خراب کر دی ہیں اور ہم گھر گھرستی سے اتنے بے خبر ہیں کہ آج بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ ہمارے گرتے میں کتنا کپڑا لگتا ہے۔ کریلا کون سے موسم میں آتا ہے، گوشت کہاں سے آتا ہے، ساری کا عرض کیا ہوتا ہے، چپک کا ٹیکہ کس عمر میں لگوا یا جاتا ہے، ایک سیر بریانی میں کتنی چھناک نمک پڑتا ہے؟ پھر صبح چھ بجے اٹھ جاتے اور سات تک تیار ہو کر پیدل گردمندر پہنچتے۔ وہاں سے بس آسانی سے مل جاتی تھی۔ تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ ڈھائی تین میل پیدل چلنے میں، پیر الہی بخش کالونی کے بس سٹینڈ پر دھینکا مشتی کرنے کے مقابلے میں آدھا پیسہ بھی نہیں آتا۔ 8:30 تک دفتر پہنچ جاتے اور پھر اس ہنگامی میں پتے جس کے دوپاشن بیچ آج تک کوئی ثابت نہ بچا۔

شاہجہانی دوزن

بیکوں میں اس زمانے میں دیوار کی طرف منہ کر کے بٹھانے کا رواج عام تھا اس میں غالباً یہ فائدہ ملحوظ تھا کہ دھیان ادھر ادھر نہیں بھٹکتا۔ آدمی یکسوئی سے گھنٹوں دیوار اور کام کو گھورتا رہتا ہے۔

افسر کا منہ بھی نہیں دیکھنا پڑتا۔ خیر، ہمیں اس طرزِ نشست سے کوئی قابل ذکر تکلیف نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ ہم تو یوں بھی ساری عمر نوشتہ دیوار ہی پڑھتے رہے ہیں۔ دائیں جانب ایک کھڑکی تھی جس میں رنگ خوردہ سلاخوں کا آہنی سہرا لٹک رہا تھا۔ یہ سڑک کی طرف کھلتی تھی لیکن بجکم جہز نمبر بہادر ہمیشہ بند رہتی تھی۔ موصوف کا خیال تھا کہ کھڑکی کھلنے سے بینک کے راز ہائے سر بستہ نامحرموں پر کھل جائیں گے۔ کبھی پٹ کھلا رہ جاتا تو باقاعدہ ”انکوائری“ ہوتی ”کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیوں کھلا؟“ شام کو موصوف اکثر اپنے ہاتھ سے بعض دروازوں کی تلاشی لیتے۔ رنگ اور دیمک نے ترس کھا کر اس کھڑکی میں ایک ذیلی کھڑکی بنا دی تھی جس میں سے

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم اسلامی پیشکش

جادو، خواتین اور اسلام

(قرآن و سنت کی روشنی میں)

شائع ہو گیا ہے۔

اس شمارے میں

- حقیقت... خطرات.... احتیاطی تدابیر اور علاج
- جادو، جن، آسیب اور نظر بد میں حقیقت کتنی ہے اور فسانے کیا کیا ہیں؟
- بے حد دکھ بھری افسوسناک کہانیاں۔
- قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں درست رہنمائی۔
- نام نہاد شعبہ باز اور فتنہ گر کس طرح پریشان حال لوگوں کو اپنے چنگل میں پھانس کرستم کا نشانہ بناتے ہیں؟
- ایک مسلمان گھرانہ جادو کے اثرات سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟

خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھائیں۔

”سیارہ ڈائجسٹ“..... 240 ریواز گارڈن، لاہور۔

فون: 37245412

یورپ کی اور ہماری خواتین میں بڑا فرق ہے۔ یورپ میں جولائی دُور سے سترہ برس کی معلوم ہوتی ہے وہ قریب پہنچ کر ستر برس کی نکلتی ہے اور ہمارے ہاں جو خاتون دُور سے ستر برس کی دکھائی پڑتی ہے وہ نزدیک آنے پر سترہ برس کی نکلتی ہے۔ مگر یہ وضع داری انگلستان میں ہی دیکھی کہ جو عمر دُور سے نظر آتی ہے وہی پاس ہے۔ چنانچہ کمر کمر تک بالوں والی جولائی دُور سے انیس سال کی نظر آتی ہے وہ پاس جانے پر بھی انیس سال کا ”ہی“ لگتا ہے۔

(مشاق احمد یوسفی / خاتم بدین)

چائے کا کپ اور سر باسانی گزر سکتا تھا۔ اس کے سامنے کی ایک سلاخ کسی شوریدہ سر نے نکال دی تھی۔ جی گھبراتا تو ہم اس سوراخ میں سے باری باری سڑک کی سیر دیکھتے۔ یہ ”شاہجہانی روزن“ کہلاتا تھا۔ روایت ہے کہ شاہجہاں جب قلعہ آگرہ میں اسیر ہوا تو دیوار زنداں میں لگے ہوئے ایک گھینہ پر سے نظریں نہیں ہٹاتا تھا کہ اس میں اس کی جیتی کے روضہ کا پورا عکس نظر آتا تھا۔ ہمیں سردی، گرمی، پھوار پڑنے، دھوپ ڈھلنے، اور چاندنی پھیلنے کا اندازہ اسی روزن سے ہوتا تھا۔ ہمیں ورنہ اندر تو ہمیشہ جھٹ پنے کا سا سماں رہتا تھا۔ غروب آفتاب کے بعد اسے جھاڑن سے ڈھانک دیا جاتا، اس لیے کہ سنسان سڑک اور گھنپ اندھیرا دیکھ کر رول بیٹھنے لگتا تھا۔

چند روز سے ہم دیکھ رہے تھے کہ ایک سفید بلی شاہجہانی روزن کے نیچے فٹ پاتھ پر اپنے بچوں سمیت آکر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک دن اس نے بہت میاؤں میاؤں کی تو ہم نے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ملہاری چائے والے کو انکی پھینک کر اسے دودھ پلوایا۔ اس کے بعد یہ روزمرہ کا معمول ہو گیا کہ وہ شام پڑتے ہی وہاں آ جاتی اور ہم اس کا حق ادا کر دیتے۔ اس کے بچوں کی بڑھوار دیکھ کر جی خوش ہوتا۔ کبھی ہم وہاں نہ ہوتے یا اس کی فریاد پر دھیان نہ دیتے تو وہ جگے پر چڑھ کر روزن میں سے جھانکتی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بڑی بے بسی جھلکتی تھی۔ دودھ پی پلا کر کچھ دیر اپنے بچوں سے ہمارا جی بھلاتی۔ پھر اٹھ کر چلی جاتی اور دوسرے دن چھ بجے سے پہلے نظر نہ آتی۔ گھر پر بچے روز پوچھتے کہ آج وہ بچے کتنے بڑے ہوئے۔ اگر ہمیں اتوار کو بینک نہ آنا ہوتا تو سنچر کی شام کو اس کے دودھ میں انکی چائے والے کو جھٹکی ادا کر دیتے۔ کچھ دن سہ پہر ہی سے ہمیں اس کا انتظار رہنے لگا۔ پالتو جالور کی چُپ دُسر اٹھ اور اس کا پیار کتنا بھر پور ہوتا ہے اس کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی ڈکھی ہو یا تنہا۔ اس کے بھی چار بچے تھے۔

سیمنٹ کا بیٹ

بارش کے دن تھے۔ جھڑگ رہی تھی۔ ایسی بارش اور ایسی چھت کراچی میں پھر کبھی نہیں دیکھی۔ لگتا تھا کہ آسمان کا پیندا چھلنی ہو گیا ہے۔ مکان کی چھت بھی چھلنی ہو رہی تھی اور کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانے کے لیے چھتری لگانی پڑتی تھی۔ کوئی جگہ ایسی نہ بچی جہاں آدمی موکی حالات سے ہر لحظہ باخبر رہے بغیر سو سکے۔ اس کے باوجود ہم نے اس بے چینی اور پھرتی کا مظاہرہ نہیں کیا جس کا نظیر اکبر آبادی مذاق اڑا گئے ہیں:-

مذت سے ہو رہا ہے جن کا مکان پڑا

اٹھ کے ہے ان کو بیٹہ میں ہر آن چھت پہ جانا

چھت پر جانے سے ایک تو پڑوسنیں چھردانی اوڑھ لیتی تھیں اور ان کے مرد چھردانی کے ہانس لے کر باہر نکل آتے تھے۔ دوسرے، کوئی زمین سرے سے بنایا ہی نہیں گیا تھا اس لیے کہ چھت اپنے ہی بوجھ کی تحمل نہ تھی۔

دوسرے کمرے کی چھانی کے چھیداتے بڑے تھے کہ اس کا پرنا لہی خشک ہو گیا۔ ایک رات ایسی بھی گزری کہ چھت رات بھر روتی رہی۔ اس کی دیکھا دیکھی بچے بھی۔ اور انہیں دیکھ کر ہماری آنکھ بھی بھر آئی۔ ان سب کو رقت سے باز رکھنے کے لیے دوسرے دن ہم نے سچ کے وقفے میں آٹھ پونٹ سینٹ خرید اور شام کو اسے لفافے میں ڈال کر، بو چھارے سے بچاتے چھپاتے، بس سینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ اتنے میں ایک بیس گز، لمبی کاروائیں طرف سے ہمارے آدھے جسم اور لفافے پر برساتی پانی اور کچڑ کا اسپرے پینٹ کرتی زونیں سے گزر گئی۔ کچھ دیر بعد ایک اور کار آتی ہوئی نظر آئی تو ہم نے دوسرا گال بھی پیش کر دیا۔ تاکہ ہمارے کپڑے کا بایاں حصہ بھی دائیں کا ہم رنگ ہو جائے۔ آخر 19 نمبر کی بس آئی گئی۔ کچڑ میں لت پت ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ زندگی میں پہلی بار کشتی لڑے بغیر بس پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی نے فاول نہیں مارا۔ کسی نے کمر میں ہاتھ ڈال کر پیچھے نہیں کھینچا۔ ہم سیٹ پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ ایک صاحب جو ہمارے بعد چڑھے تھے اپنے بریف کیس کے بمپر سے ہمیں دھکیل کر ہماری سیٹ پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے سفید شارک اسکن کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ جو بڑبڑاتا مگر بے داغ۔ ہم ان کے پہلو میں چھت کا ڈنڈا پکڑ کر بس کے جھکوں کے ساتھ جھولنے لگے۔ ان کی نگاہیں ہمیں جھڑکتی پرے ہٹنے کی ہدایت کرتی رہیں۔ بس بڑی تیزی سے کچڑ اچھالتی جا رہی تھی اور ہم گیلے لفافے کو سینے سے لگائے جموم رہے تھے کہ ایک بڑھیا نے اچانک سڑک پار کرنے کی کوشش کی اور بس دو زبردست جھکوں کے ساتھ ڈکی۔ کھڑے ہوئے مسافروں کی لائن میں ہر سر پہلے پیچھے اور پھر آگے والے سر سے ٹکرایا۔ اور مسز دین نے ایک دوسرے کو ”ذرا ہوش کر کے کھڑے ہو“ کی تنبیہ کی۔ ہم نے لفافے کو گرنے سے روکنے کے لیے اس میں مضبوطی سے انگلیاں گڑو دیں۔ یکا یک بھیگا ہوا لفافہ پھٹا اور سینٹ کا پرنا لہ شارک اسکن کے سوٹ پر دھواں دھار گرا۔ کچھ دیر تو سوائے ہمارے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ سینٹ کا ہم کیوں اور کیسے پھٹا لیکن جب ہوا میں اڑتے ہوئے غبار کا آخری ذرہ تک شارک اسکن کے سوٹ پر آکر جم گیا اور ہمارے ہاتھ میں خالی لفافہ رہ گیا تو دو سال کا بچہ بھی بتا سکتا تھا کہ کیا ہوا۔ دو سال کی قید ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ اس سے کم عمر کا بچہ بتوایشن کو سمجھ تو سکتا ہے مگر الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ بچے بولنے سے پہلے ہنسا سکتے ہیں۔ جیسے ہی ان صاحب پر اس سانحہ کی سببیت اور حدود اربعہ مشکف ہوئے۔ انہوں نے رومال سے اپنا سوٹ رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی لیکن گیلے سوٹ پر اعلیٰ کوالٹی کا مضبوط اور پائیدار سینٹ، ایسا چٹنا کہ:-

پہلا ہے اس قدر ہتھکا کہ رگڑا جائے ہے

اُس نے عالم میں بزبان اردو انگریزی میں جو کچھ کہا، خدا اسے معاف کرے۔ ہم نے تو اسی وقت معاف کر دیا تھا۔ قابل اشاعت فقرہ صرف یہی تھا کہ پرسوں ہی درزی کو 75 روپے نقد سلائی دی تھی۔ بس اور ان کی زبان چلتی رہی۔ ذرا دیر بعد آخری سیٹ سے ایک صاحب نے ٹیٹ کر خنداری لہجے میں ہدایت فرمائی ”بھائی جان! فوراً سے بیشتر نکلے کے نیچوں غسل صحت کر لو، جھٹ ڈینی سینٹ جم گیا تو پھٹ ڈینی ملکہ نور یہ کابت بن جاؤ گے، محلے کے لوٹے لوٹو بنا دیں گے۔ زوجہ صاحبہ بھی نہیں پچھان پاویں گی“۔ سینٹ پوش صاحب نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن دو تین منٹ بعد پہلے ہی پرنا لے پر بس سے اتر گئے۔

چارپانچ دن بعد ہم پھر اس بس میں چڑھنے لگے تو ہمارے آگے آگے چارٹرڈ بینک کے منیجر کی سیکرٹری

38-24-38 تھی۔ کنڈکٹر نے ہمیں آنکھ مار کے، ریزگاری کا تھیلا بجاتے ہوئے ہانک لگائی ”ہابو جی اڈرا سنبھل کے، آگے پیچھے کے پمپر سے ہوشیار رہاں جی! میکلوڈ روڈ، پوسٹ آفس، صدر، گرومنڈر، جمشید روڈ، بڑا گھر (جیل)“ کالونی۔ مہربان قدر دان! بس میں پٹھری چلو، چرس، گانجا اور سینٹ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

کراچی کی برسات

پانچ چھ سال بعد ایسی بھر کے بارش ہوتی ہے تو کراچی کی تاریخ اور کچھ کا حصہ بن جاتی ہے۔ سارا نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اسے معمول پر لانے میں پانچ چھ برس لگتے ہیں۔ جنگی لٹینوں کے لیے یہ بارانِ رحمت، آفاتِ ارضی و سادی کا درجہ رکھتا ہے۔ دیکھا جائے تو غالب بھی بارش کے اس لیے دلدادہ نہیں تھے کہ پینے کے لیے آبِ مقطر کی سپلائی بڑھتی ہے۔ کھیتی باڑی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ بلکہ

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے

بکس بادۂ تاب اور آم کھائیں

محکمہ موسمیات بارش کا سالانہ اوسط چار انچ بتاتا ہے مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہماری تنخواہ اور آدم جی، سہگل اور داؤد سیٹھ کی آمدنی کو جوڑ کر ہمارا اوسط چھ کروڑ نکالا جائے اور اس پر ہم سے انکم ٹیکس کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر گھر کے سامنے قرتی کا ڈھول بجا کر ہماری تصانیف کی ناقابلِ فروخت کاپیاں، دوائیں اور ٹائیاں نیلام کر دی جائیں۔

”بتدریج بلبل“ تو پھر بھی غنیمت ہے۔ کراچی میں تو بارش اس طرح ہوتی ہے جیسے کوئی مگر چھ آنسو بہا رہا ہو۔ کراچی کے اکثر پرانے مکانوں کی چھتوں میں آپ کو پرنا لے اور موریائیں نظر نہیں آئیں گی۔ بعض سڑکوں پر تو برساتی پانی، بلکہ ٹریفک کے ٹکاس کا بھی کوئی انتظام نہ ملے گا۔ کراچی کو دنیا کے تمام شہروں کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کبھی چھتیاں اور برساتیاں نظر نہیں آتیں۔ یوں تین چار مہینے گھنگھور گھٹائیں چھائی رہتی ہیں۔ بھولے سے کسی پروگرام ڈائریکٹر کی کھڑکی کھل جائے تو ریڈیو اسٹیشن سادون کے گیت نشر کرنے شروع کر دیتا ہے۔ کراچی کے مطلع پر سادون بھادوں میں گہرے بادل اور محکمہ موسمیات کی پیش گوئیوں کا ڈھند چھایا رہتا ہے۔

کشت بے آب نے دیکھے ہیں وہ کالے بادل

جو گہلیں اور برسنے کو ادھر سے گزرے

جب دریاؤں میں طغیانی آتی ہے اور پنجاب کے اکثر علاقے زیرِ آب آ جاتے ہیں تو کراچی کے ہوٹلوں اور بوتلوں میں سے کئی ہزار کیوسک فی سیکنڈ بادۂ تاب کا اخراج ہونے لگتا ہے۔ غالب ہوتے تو یہ نقشہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔ کھتے اور اس کے ”وہ بادہ ہائے تاب گوارا کہ ہائے ہائے!“ کو بھول جاتے۔

لیکن اس سال سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ بارش اور ایسی بارش! ایسی بارش ہم نے صرف مسوری میں اپنی شادی کے دن دیکھی تھی کہ پلاؤ کی دیگوں میں بیٹھ کر دلھن والے آ، جارہے تھے خود ہمیں ایک کفگیر پر بٹھا کر قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ پھر نہ ہم نے ایسی حرکت کی اور نہ بادل ایسا ٹوٹ کے برسا۔ عجب سماں تھا۔ جدھر دیکھو پانی۔ اس دن سوائے دلھن کی آنکھ کے ہمیں کوئی چیز خشک نظر نہ آئی۔ ہم نے شہو کا دیا کہ رخصتی کے وقت دلھن کا رونا رسومات میں داخل ہے۔ انہوں نے بہت پلکیں پٹپٹائیں، مگر ایک آنسو نہ نکلا۔ پھر کار میں سوار کراتے وقت ہم نے سہرا اپنے چہرے سے ہٹایا۔ خوب مٹھوٹ مٹھوٹ کر دیں۔

ایسی ہی بارش ان دنوں کراچی میں ہو رہی تھی۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے کسی سے سنا تھا کہ پنڈی میں تو میٹے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

0300 8511747

0300 3511747

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

کے برابر اگلے پڑے ہیں۔ ایسا موسلا دھار برسا کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ سڑکیں دریاؤں کی طرح بہہ رہی تھیں۔ میکوڈ روڈ پر چارٹرڈ بینک کے سامنے استغھانی خاندان کے ایک بزرگ کی کارڈ بکیاں لگا رہی تھیں اور وہ اس کی چھت پر بیٹھے کراچی میونسپل کارپوریشن کو قدیم فارسی میں گالیاں دے رہے تھے۔ شاف کو ساڑھے تین بجے چھٹی دے دی گئی تھی اور ہم بھی چوبیس بجے تک اٹھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وقت معینہ سے کافی پہلے موتی (بچوں نے ملی کا یہ نام رکھ دیا تھا) آئی۔ ہم نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کھم تین آنے! اب اسے اور اس کے ٹم کو ایک آنے کا دودھ پلوادیتے تو بس سے ٹکٹ میں دو پیسے کم پڑ جاتے۔ وہ کھڑکی کے نیچے بھکتی رہی۔ روتی رہی، ہم نے پروانہ کی۔ پھر اس نے بچوں سے گھر گھر کی اور بار بار روزن سے جھانکنے لگی تو ہم نے اسے جھاڑن سے ڈھک دیا تاکہ یکسوئی سے کام سمیٹ سکیں۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے رزق کی تلاش میں کہیں اور نکل گئی۔ بارش ذرا تھمی ہم اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ چائے والا جس نے اپنی دکان ایک دروازے کی عراب میں غفلت کر لی تھی، کھڑکی کھٹکانے لگا۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے؟ کہنے لگا بابو جی اتھاری ملی ریلی برادرز کے ٹرک کے نیچے آکر مر گئی۔ یہ لو اس کے بچے۔ ہلکے رہے ہیں۔ یہ خون تمہاری گردن پر۔

یہ خون ہماری گردن پر تھا۔ اگر ہم آج بھی پیدل چلے جاتے تو کون سی قیامت آ جاتی۔ چاروں بچے بارش میں شرابور تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ہم نے سب سے چھوٹے کو میز پر بٹھا کر ڈسٹر سے خشک کیا تو اس کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھا گیا۔ ہو بہو ماں جیسی تھیں۔ بارش پھر تیز ہو گئی اور ہم نے کھڑکی کھول کر تین آنے بچتے نالے میں پیسے دیے۔ انہی کی وجہ سے وہ اپنی جان سے گئی۔ ہفتوں اس کی اداں نیلی نیلی آنکھیں اس روزن سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیں۔ آخر ہم نے ٹکٹ آکر اس روزن پر براؤن کاغذ چپکا دیا۔

بول میری مچھلی کتنا پانی؟

چاچا فضل دین (چوکیدار) صبح ہمارے لیے پھر سینٹ خرید لایا تھا۔ اس گاڑی کے ساتھ کہ اب کے لفافہ سینٹ سے زیادہ پائیدار ہے۔ اس نے کہیں سے ٹوکری بھی برآمد کی جس میں لفافہ اور موتی کے چاروں بچے رکھ کر ہم پرستے مینہ میں پیدل روانہ ہوئے۔ وہ تین آنے ہمارے پاس ہوتے بھی تو کچھ کام نہ آتے، اس لیے کہ ہمیں چلنی کبھی کی بند ہو چکی تھیں۔ پانی کی چادر چل رہی تھی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ سڑک کہاں ہے لیکن سات آٹھ ڈکیوں کے بعد آسان پہچان ہاتھ آ گئی۔ جہاں جہاں پانی زیادہ گہرا اور گڑھے تھے، وہی سڑک تھی۔ بندر روڈ طغیانی پر آئی ہوئی تھی۔ اور ہم اس کی موجوں اور کلاڑے کے تھیمڑوں سے بچتے بچاتے گلیوں گلیوں جا رہے تھے۔ لائٹ ہاؤس سینما کے پاس کمر کر پانی تھا، بشرطیکہ کراڈ ۶۱ فٹ ہو۔ لیکن گلی بہت بہتر تھی۔ وہاں صرف کچھڑ تھا۔ چنانچہ ہم اُدھر ہو لیے۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ محسوس ہوا گویا کسی نے سر پر مشک چھوڑ دی لیکن مشک میں سے دلی کی نہاری کا دھون تو نہیں لگتا۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ سر پر پہلے تربوز کا میلمٹ آن کر فٹ ہو گیا، ورنہ فحری آم کی ایک سیر وزنی کھٹلی سے سر پاش پاش ہو جاتا۔ گردن اٹھا کر دیکھا تو ایک لڑکی ہانسی اُلٹے، چوتھی منزل کی ہانسی میں کھڑی کھلکھلا رہی تھی۔ کہیں سے آواز آئی ”..... ہراسند بول میری مچھلی کتنا پانی؟“ اس کے بعد ہم نے بندر روڈ پر غرقاب ہونے کو گلیوں میں نہاری سے غسل کرنے اور بھسلے پر ترجیح دی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ بھسلے پر ہمیں خدا نخواستہ اصولاً کوئی اعتراض ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی طرح، ہم تو کچھڑ نہ ہوتے بھی بھسلنے کے لیے جی جان سے تیار ہیں:-

صاحبو! اگلے دنوں کے لوگ جن میں اپنا شمار کرتے ہوئے کیجہ منہ کو آتا ہے درحقیقت ناقابل اصلاح ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ نباہ کرنا نئی نسل کے لیے مشکل سے مشکل ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے کیسے پتے کی بات کہی تھی۔

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں

لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

میری عمر اور نسل کے لوگ عرصہ دراز سے ”علیکم السلام“ ہی کہتے آئے ہیں ایسی ہی شان اور طنطنے والے

بزرگ کے بارے میں سنا ہے کہ جب وہ قبرستان میں داخل ہوتے ہیں تو السلام علیکم یا اہل القبور کہنے کی

بجائے علیکم السلام لینے رہے کہتے ملیں گے۔

فائل کے طلبہ کا تازہ بہ تازہ نو بہ نو موضوعات پر کام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ چند موضوعات پر عدم دلچسپی، اور نامحرم

والی بے نیازی دیکھ کر اور زیادہ خوشی ہوئی۔ علامہ اقبال نے فن کاروں اور لکھنے والوں سے گلہ کیا تھا۔

ہند کے شاعر و صورت گردو فسانہ نویس

آہ بے چاروں کے ہے اعصاب پہ عورت سوار

سنا ہے اس پر سعادت حسن منٹو نے یہ فقرہ کہا تھا کہ مرد کے اعصاب پر عورت نہیں تو کیا ہاتھی گھوڑے سوار ہوں گے۔

(مشتاق احمد یوسفی / خاکم بدہن)

کچڑ سے ہر مکال کی ٹو پچتا بہت پھرا

جب دکھائی دی کھلے بالوں کی اک گٹھا

بجلی بھی چمکی حسن کی 'ینہ برسا تاز کا

میسلسن جب ایسی آئی تو پھر کچھ نہ بس چلا

آخر کو واں نظیر بھی آکر میسلسل پڑا

بھوتوں کا اکلوتا جوڑا پانی میں بھیگ کر غسل کی طرح ملائم ہو گیا تھا اور اسے حریدہ ملیں ہونے سے بچانے کے لیے

ہم نے ٹوکری میں رکھ لیا۔ پانی میں نہ صرف لطف آیا بلکہ اس کی انگلی پکڑے پکڑے بچپن بھی لوٹ آیا۔ ہمیں اُن

پر بڑا ترس آیا جو بچپن میں کبھی ننگے پیر نہیں پھرے، اور نہ بارش میں نہائے۔ انہوں نے اپنا بچپن ضائع کیا۔ وہ کیا

جانیں کہ جب ہادلوں کے جھما جھم ہائے گرمی دانوں سے بھرے ہوئے بدن کو باڑھ پر رکھ لیتے ہیں تو کیسی گدگدی

ہوتی ہے اور زمین کا ہر قدم پر بدلتا ہوا سُخاؤ اور کور لپٹا، اس کی نرمی، گرمی اور کٹیلان کیا چیز ہوتی ہے۔ دھرتی اپنا

آپا بھید بھاؤ جوتے کے تلے کو نہیں دکھایا کرتی۔

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں

راستے بھر گہرے فکر اور پانی میں ڈوبے رہے۔ صبح تک جوتے کیسے سوئیں گے؟ ”اُجلے پوش لاٹھری رجسٹرو“

بھی بارش کی وجہ سے دو دن سے بند تھی۔ بارش سے پہلے اس کے کارندے شہر سے دُور دھوبی گھاٹ کے گندے

نالے میں ”ارجنٹ“ ڈھلائی کرتے تھے۔ بارش کے بعد یہ سہولت گلی گلی میسر ہوگی۔ یہ لاٹھری بکفایت یعنی ڈھانکی

آنے میں دن کے دن قیص دھو دیتی تھی۔ جب کہ شہر کی لاٹھریاں اس زمانے میں قیص کی ”ارجنٹ“ پھڑوائی کے

چھ آنے لیتی تھیں۔ ہم سوچے لگے کہ گھر میں اتنا پانی کہاں کہ کپڑے دھو کر صبح کو نکلنے کی استری سے خشک کر لیں۔

آخر الذکر کو برسات میں دھوپ کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے۔ گھر میں کوئی مضبوط آگنی بھی نہیں تھی جس پر خود کو لٹکا کر پڑے پہنے پہنے سکھا لیتے۔ کالونی میں نکلے نہیں تھے مگر یہ اکبر الہ آبادی کا زمانہ نہیں تھا کہ نکلے نکلے کو ایک قومی سانحہ سمجھ کر شاہ ایڈورڈ کی ڈہائی دی جائے کہ کیا زمانہ آن لگا ہے۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

بھگت سنگھ میونسپل کارپوریشن نے ہمیں پہلے سانحہ سے بذریعہ محکم محفوظ رکھا۔ کالونی کی کوآپریٹو سوسائٹی فنکلیوں کے ذریعہ پانی تو کیا تقسیم کرتی، موندو ند کو ترساتی تھی۔ ہمیں تین محکم روزانہ کے کوپن ملتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا یہ محکمیں خاص طور پر آرڈر دے کر بکری کے قبل از وقت پیدا ہونے والے بچوں کی کھال کی بنوائی گئی تھیں۔

ان تین محکموں میں تین بہشتی حسب توفیق و طاقت پھونک بھردیتے تھے۔ ربر کی دریافت سے پہلے ایسی محکمیں تیرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ کبھی زوری و زاری یا آٹھ دس آنے کے نذرانہ سے ایک محکم زیادہ مل جاتی تو گویا عید بلکہ ہولی ہو جاتی۔ تین دن سے سڑکیں کٹ جانے کے باعث پانی کی فنکیاں نہیں آتی تھیں اور پانی پینے کا بھی ختم کرنا پڑتا تھا۔

گھر کے سامنے والی سڑک کے نالے کی صحیح گہرائی، آخری اعشاریہ تک، تو ہم نہیں بتا سکتے۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک موج ہماری عینک بھا کر لے گئی اور اب ہم اس قابل بھی نہ رہے کہ ڈبکی کھائے بغیر، پانی اور خشکی کی تمیز کر سکیں۔ گلی کے کھڑے پر شیخ رحیم بخش، مالک رحیم بس کمپنی، نے ترس کھا کر ایک پرانا ٹیوب دیا۔ جسے کمر سے باندھ کر ہم نے چڑھتی ندی پار کی۔ کالونی کے تمام مکان ایک دوسرے کا چہرہ تھے اور بغیر عینک کے تو ہر مکان پر اپنے مکان کا گمان ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ تین چار جگہ اہل محلہ نے پان کی ایک ایک گودی کھلا کر واپس پانی میں چھوڑ دیا۔ در بدر لنگر اندازی کے بعد گھر آیا تو دیکھا کہ برآمدے اور کمرے میں نالے کا پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے (مکان چھوڑے پر نشیما علاقے کے پالے میں واقع ہوا تھا)۔ جن موریوں کا کام گھر کا گندہ پانی باہر نکالنا تھا وہ اب فصل مکوں انجام دینے میں جٹی ہوئی تھیں۔ یعنی باہر کا غلیظ پانی ان کے توسط سے بھل بھل اندر داخل ہو رہا تھا۔ سطح آب پر جا بجا روٹی کے گالے خیر رہے تھے۔ ہوا یوں کہ ایک دن ہم نے اپنی اولاد کو صبیہ کی کہ شرفا کے بچے گلاسوں اور چپلوں سے نہیں لڑا کرتے۔ خدا ان کی عمر دلا کرے، اس کو ان سعادت مندوں نے ایسا گرمہ ملا باندھا کہ پھر کبھی عینک سے زیادہ سخت چیز استعمال نہ کی۔ ایک چار پائی پردوںوں بچیاں اپنی گڑیوں پر چھتری لگائے کبھی بیٹھی تھیں۔ چھوٹی کے منہ پر ابھی تک دودھ کی مونچھیں بنی ہوئی تھیں۔ دوسری چار پائی کتابوں کے مچان تلے بیٹھی تھی، جو کہاڑی سے خریدے ہوئے "مصطفیٰ اینڈ سنز" ناشران و سوداگران کتب کے سائن بورڈ کو یوار پر ریلوے کی بالائی برتھ کی طرح لٹکا کر بتایا تھا۔ اس پر ساری متاع فقیر..... کتابیں..... تین قطاروں میں بچی رہتی تھیں اور ان کے اوپر دیگر اشیائے غیر ضروری۔ اس "فالس سیلنگ" کے نیچے چار پائی پردوںوں بیٹے پشیمان بیٹھے تھے۔ بڑے نے سوتے میں نیکر سے ہاتھ روم کا کام لیا تھا اور اب پیش بندی کر رہا تھا کہ دیکھئے امی! میری نیکر میں آپ کے گڈو نے پیشاب کر دیا ہے! تعجب اس پر تھا کہ گڈو میاں سبکیاں لے لے کر یقین دلا رہے تھے کہ امی اب نہیں کروں گا! لائین ایک کونے میں لٹکی ہوئی تھی۔ جہاں ایک کالی زبان بن گئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے گلوب پر جو کاغذ آٹے سے چپکایا گیا تھا وہ آدھا جل چکا تھا۔ اس کی آنکھ ماری ہوئی روشنی میں ہمارے بچوں نے ملی کے بچوں کو دیکھا اور دونوں کے بچے ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

آج ہم نے اپنا چہرہ دیکھا

بیکم بہت خوش خوش نظر آرہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں کچے گھن میں لے گئیں اور کہا ”دیکھو آج میں نے دو ٹشیاں پانی سے بھری ہیں! بالکل موتی کی طرح! ڈھیروں کپڑے ڈھل جائیں گے۔“ تین دن سے پانی بالکل بند تھا اور لوگ بوند بوند کو ترس گئے تھے۔ یہ دو ٹشیاں انہوں نے برآمدے کے پرٹالے کے نیچے رکھ کر پانی سے بھری تھیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر یہ بی بی اس قدر خوش ہو رہی تھی گویا کوئی خزانہ مل گیا۔ یہ دکھانے کے لیے دونوں لبالب بھری ہیں انہوں نے لائین اپنے چہرے تک اٹھائی تو مانگ میں ایک سفید بال نظر آیا جو اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پانی اگلے کی طرح ٹھنڈا ٹھنڈا اور موتی کی مانند جھل جھل کر رہا تھا۔ ہمیں اس میں اپنا چہرہ نظر آیا۔

مفلسی میں جوتا گیلا

گھر کی ساری کائنات چار پائیوں پر محفوظ کر لی گئی تھی۔ بچے ایلو منیم کی پتلی کو تیرتا ہوا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ مٹی کے چولہے سے پانی اُبل رہا تھا۔ دیکھا آج بیروں پر درم نہیں ہے۔ اتنی دیر ٹھنڈے پانی میں رہنے سے تلوے اتنے گورے ہو گئے کہ ہمیں شبہ ہونے لگا کہ کسی اور کے تو نہیں آگئے۔ سلوٹس پڑنے سے، بقول گڈومیاں، کریپ سول بن گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں تالا اتر گیا اور سارے گھر میں اُجلی اُجلی ملائم مٹی کی دہیز تہ چھوڑ گیا۔ بچے اپنے ننھے منے بیروں کے نشان دیکھنے کے لیے اس پر خوب چلے۔ بالکل ایسے ہی بقدم خود نشان پٹنگ کی چادر پر بھی تھے، مگر وہ زیادہ واضح اور دیر پا تھے۔ سونے سے پہلے ہم نے دونوں جوتوں کو فیتے سے باندھ کر لائین کی گردن میں ہار کی طرح لٹکا دیا تاکہ صبح تک سوکھ جائیں۔

صبح ساڑھے چار بجے بجلی کے کڑکنے سے آنکھ کھلی تو کمرے میں چڑا جلنے کی چراغ پھیلی ہوئی تھی۔ اٹھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ جو جوتا گلوب کے ٹوٹے ہوئے رخ پر تھا اس کی ایڑی کے اوپر کا پشتہ جل کر اب پشادری چل بن گیا ہے۔ ہم لائین اور جوتا بچھا کر ایسے سوئے کہ صبح پونے سات بجے آنکھ کھلی۔ اس وقت تک بیوی ہمارے کپڑے استری کر کے اپنے سکول پڑھانے جا چکی تھیں۔ کپڑوں پر ایک پرچہ رکھا ملا جس پر لکھا تھا کہ رات میں تمہیں بتانا سکی۔ ڈاکٹر نے مجھے یرقان بتایا ہے۔ خواتواہ ڈھیر ساری دوا میں اور انجکشن لکھ مارے ہیں۔ میں واہی میں پاکستان چوک کے ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے دوا لیتی آؤں گی۔ زرد رنگ تمہارا نیورٹ (پسندیدہ) رنگ بھی تو ہے۔

زخم کا سفر

جوتا ایسی چیز نہیں کہ زیور کی طرح مانگ مانگ کر بہن لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ چل بہن کر بینک جائیں اور تین دن بعد خواتواہ ملے تو نیا جوتا خرید لیں۔ پھر خیال آیا کہ اگر اینڈرسن پوچھ بیٹھا کہ آج انجکشن ڈپارٹمنٹ چل پہنے کیوں پھر رہا ہے تو کیا جواب دیں گے۔ ایک دفعہ ایک افسر بینک میں بغیر ٹائی کے آگیا تو اینڈرسن نے اس سے پوچھا کہ آج کیا بینک ہالی ڈے ہے جو یوں تنگ دھڑنگ پھر رہے ہو؟ اسی طرح ایک کلرک ”تین دن کا بڑھا ہوا شیو دیکھ کر دوٹی پکڑاتے ہوئے کہنے لگا کہ اپنا کیو فلاڈ منڈا کر آؤ تاکہ چہرہ شناخت کر کے رجسٹر میں حاضری لگائی جاسکے۔“

ذہن پر زور ڈالا تو اس کا حل بھی نکل آیا۔ چل بہن کر ایک بیرو پر بی بی باندھ لیں گے۔ کسی نے پوچھا تو کہہ دیں گے کہ چوٹ لگ گئی ہے۔ اور یہ کچھ ایسا جھوٹ بھی نہیں۔ آخر اندرونی چوٹ تو آئی ہی تھی جس کے بارے میں حضرت لوح ناردی اہل منتہی میں فرماتے ہیں:-

جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے
 جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے
 ایک موٹر سے پر نیلے رنگ کا جہازن بڑا نظر آیا۔ اس میں سے ایک لمبی دھجی پھاڑ کر پٹی باندھ لی۔ سہ پہر کو
 ایئر ڈرن کی نظر پڑی تو کہنے لگا کہ دُغم پر کبھی رنگین پٹی نہیں باندھنی چاہیے۔ پک جاتا ہے، خصوصاً برسات میں۔
 دوسرے دن صبح دونوں کام پر جانے کے لیے تیار ہونے لگے تو بیگم دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہنے لگیں کہ تمہارے
 ان لاڈلوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے اور کچھ نہیں تو کم بخت آدھا دوپٹہ ہی پھاڑ کر لے گئے۔ ان کا دایاں کان
 ایک کھونٹے میں سے باہر نکلا ہوا تھا۔

ہم نے پٹی واپس کر دی اور جلدی جلدی ایک پھٹے پاجامے کے لٹھے کی سفید پٹی باندھ کر بینک چلے گئے۔ گیارہ
 بجے کسی کام سے ایئر ڈرن نے طلب کیا۔ واپس آنے لگے تو بینک کو ناک کی پھٹک پر رکھ کر اس کے اوپر سے
 دیکھتے ہوئے فرمایا "JUST A MINUT, TAMERLANE" "تمہارے دُغم نے چوبیس گھنٹے میں
 کافی مسافت طے کی ہے۔ دائیں سے بائیں دُغم میں منتقل ہو گیا ہے۔"

اب جو ہم نے نگاہ ڈالی تو دھک سے رہ گئے۔ افراتفری میں آج دوسرے یعنی بائیں دُغم پر پٹی باندھ کر آ گئے تھے۔
جاننا ہمارا کاک ٹیل پارٹی میں

ڈی۔ جے اور انگرکھا

"تمہارے پاس D.J. ہے؟" مسٹر ایئر ڈرن نے پوچھا۔
 "یہ کیا ہوتی ہے؟"

وہی جس کا کارلیہ سائٹن کا ہوتا ہے اور پتلون اور بیٹن بجانے والوں کی سی رہی پٹی لگی ہوتی ہے۔
 "سلوا تو لو۔ بینک سے ڈس ہونے کے بعد بینک کی انتظامیہ کی طرف سے بیٹن بجانے پر کوئی پابندی نہیں۔
 تم نے سنا ہوگا، ڈنر جیکٹ پہن کر تو ٹینکر کی بھی اشرفوں کی سی صورت نکل آتی ہے۔"
 "سرا میں ڈنر جیکٹ پہن کر کہاں جاؤں گا؟ اردو میں مثل ہے کہ جنگل میں مور تاجا کس نے دیکھا۔"

"How Stupid"۔ جاننا چاہیے کہ مور صرف اپنی مادہ کو دکھانے کے لیے ناچتا ہے اسے آدمیوں سے کیا
 رغبت ہو سکتی ہے؟ پروموشن کے بعد تم بوٹ کلب یا سندھ کلب کے ممبر نہیں بنے؟ کیا ساری تنخواہ دال روٹی پر ہی
 ضائع کر دیتے ہو؟ اب تو غیر یوروپین بھی ممبر ہو سکتے ہیں۔"

"میں بس سے آتا جاتا ہوں۔ میرا الٹی میٹ کالونی کے بس شاپ کے بھیڑ بھڑ کے، کسٹم پچھاڑ سے دل ڈرتا
 ہے۔ دو ڈھائی میل پیدل چل کر صبح گرو مندر سے بس پکڑتا ہوں تاکہ دفتر بغیر قمیص کے نہ پہنچوں۔"
 "بینک کے جنرل منیجر کو اس سے سروکار نہیں کہ تم اپنے نیم رضا مند وجود کو ڈرائنگ روم سے بینک میں کس
 طرح ڈھو کر لاتے ہو۔"

"بائی دی وے، میرے کوارٹر میں کوئی ڈرائنگ روم نہیں ہے۔ ہمارے حصے میں ایک کمرہ آیا ہے، جس میں
 قالین بھی نہیں WALL-TO-WALL بچے بچے رہتے ہیں۔"

"میں تمہاری مفلوک الحالی کی بے مثل منظر کشی سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ لیکن یاد رہے کہ مغرب میں ذاتی
 مشکلات کا "اسٹریپ ٹیز" بند اتنی بھی جاتی ہے۔ اچھا تو 27 تاریخ کو میرے ساتھ کاک ٹیل میں چلنا۔ پھر

جسہیں CALEDONIAN SOCIETY کے ANNUAL BALL میں بھی لے چلوں گا۔ اسکاٹ کلچر اور پہناوے دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ ڈنر جیکٹ فوراً بنالو۔ افسوس کہ تمہارا کوئی معقول "قابل ڈریس" نہیں۔ تمہارے جتنے بھی پہناوے ہیں سب کے سب "UNSCIENTIFIC" کیسے؟" ہم نے بات کو طول دیا کہ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔

"عجیب بات ہے۔ عورتیں تو اپنے خوب صورت چہرے کو نقاب اور ملحقہ ارتقاعی تجاوزات کو دوپٹے سے ڈھانک لیتی ہیں اور مرد؟ برانہ ماننا۔ میں نے کلکتہ میوزیم میں اودھ کے نواب کی تصویر دیکھی تھی۔ ڈھانک لیل کے انگر کھے میں سے ایک عدد نوابی چوچی بطور نمونہ باہر نکال رکھی تھی۔ دوسری بھی ویسی ہی ہوگی۔ VERY UNSCIENTIFIC۔ اپنے لباس پر غور تو کرو۔ 112 ڈگری نمبر پیر میں سر پر بیس گز لمبا صاف، اور جنوب میں دس گز گھیر کی شلوار! مانسون کی اُمس میں آپکن اور ناف سے لے کر گتھوں تک سرکس والوں کا سائٹل رویز، کیا کہتے ہیں اسے؟" "چوڑی دار پاجامہ۔"

"ALL VERY UNSCIENTIFIC"

"لیکن یور وین لباس اس سے بھی زیادہ اُن سائنٹیفک ہے۔ یورپ میں برف گر رہی ہو اور نمبر پیر نقطہ انجماد سے بیس ڈگری کم ہو تو ہٹے کٹے مرد تو گتھوں تک دوہرے اونی موزے LEGGING اور گرم پتلون پہنتے ہیں اور نازک اندام عورتوں کی ٹانگیں راتوں تک کھلی رہتی ہیں!" "تو دخور! تمہیں نگلی ٹانگوں پر کیا اعتراض ہے؟" "سرا مجھے تو باقی ماندہ لباس پر اعتراض ہے؟" "تم نے کل مجھے ٹیکسٹ فریک کا بھاؤ غلط بتا دیا۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔" اس نے اس طرح کہا جیسے ہمارا فقرہ سنا ہی نہیں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس زو سیاہ کو

یہ وہ زمانہ تھا جب برٹش کمپنیوں 'فوج' آئی سی ایس اور انگریزوں کی ماتحتی میں کام کرنے والے دیسی افسر اپنے آپ کو روشن خیال، سوشل اور اہل ثابت کرنے کی خاطر دل پہ جبر کر کے شراب پینا سیکھتے تھے۔ کچھ دن کی مشق کے بعد ایسے رواں ہوتے کہ نہ پینے کے لیے دل پہ جبر کرنا پڑتا تھا۔ روز کہیں نہ کہیں کاک ٹیل پارٹی ہوتی تھی اور آدمی ذرا سوشل اور خوش اخلاق ہوتا سال کے ۳۶۵ دن دوسروں کے خرچ پر خود کو ہر شام اُٹو بنا سکتا تھا۔ کاک ٹیل پارٹی بیک وقت انگریزوں سے تقریب بہر ملاقات، مفت نئے نوشی اور صاحبانِ امروز تک رسائی کا پاسپورٹ ہوتی تھی۔ عجب غصہ تھا۔ کچھ مسلمان افسر تو اس الزام میں نکال دیے جاتے تھے کہ وہ سوشل نہیں، یعنی شراب نہیں پیتے۔ بقیہ افسروں کو اس بنا پر درخواست کر دیا جاتا کہ وہ ALCOHOLIC ہو گئے ہیں اور بکسڈ پارٹیز میں دُمد چمانے لگے ہیں۔ دو چار ہی خوش قسمت ایسے ہوتے تھے جو درخواست ہونے کی ذلت سے بچ جاتے تھے۔ یہ وہ ہوتے تھے جو ڈکس ہونے سے پہلے ہی جگر کے "سروس" میں باعزت طریقے سے وفات پا جاتے تھے۔ راویانِ رنگیں یہاں سے روایت ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں انگلینڈ میں لوگ بھوت پڑیت کے بڑے قائل تھے۔ ہر کسی عورت پر چڑیل ڈائن کا شبہ کرتے۔ پھر یہ تحقیق کرنے کے لیے کہ وہ واقعی چڑیل ہے یا بے

سیارہ ڈائجسٹ کے عظیم الشان اسلامی نمبرز

آخر قیامت نمبر

قرآن وحدیث کی روشنی میں حالات قیامت اور آخرت اور حیات بعد موت کا احوال (قیمت: روپے 160)

اخلاق رسول نمبر

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کے پاکیزہ واقعات و مشق و عمل (قیمت: روپے 160)

صحابہ کرام نمبر

ان عظیم ستیل کی کہانی جنہوں نے صفت العالمین کی معیت میں زندگی بسر کی (قیمت: روپے 160)

فہم دین نمبر

سلیقہ زندگی اور عبادات کے فیلولی مسائل کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں (قیمت: روپے 160)

دعا نمبر

دعا تقدیر بدل دیتی ہے حدیث رسول (قیمت: روپے 160)

قصص القرآن نمبر

ان واقعات کا مجموعہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کاہر انکی امت کو بتلانا ضروری سمجھا (قیمت: روپے 175)

حقوق العباد نمبر

حقوق و فرائض انسانی بیان کرتا مجموعہ جس پر عمل کر کے ہی سچا مسلمان بن سکتا ہے (قیمت: روپے 160)

والدین نمبر

رسول نمبر

سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز (دو جلدوں میں - قیمت: روپے 320)

عکس سیر نمبر

حضرت محمد مصطفیٰ کی حیات طیبہ یعنی مقدس تالیف کتاب (قیمت عام اجلہ 275 حال ایڈیشن 450 روپے)

خلفائے راشدین نمبر

اسلام کی سر بلندی کیلئے خلفائے راشدین کی بہ مثال قربانیاں کا ذکر (قیمت: روپے 160)

انبیائے کرام نمبر

پیغمبران خدا کی حیات طیبہ جاوداں کے روح پرورد کرے (قیمت: روپے 160)

معجزات رسول نمبر

سرور کونین کی زندگی کے دوران دیکھنے و سنانے کے معجزات و معجزات و معجزات (قیمت: روپے 160)

صحابیات نمبر

100 سے زائد صحابیات کا تذکرہ جنہوں نے رسول اکرم سے بیعت کی (قیمت: روپے 160)

حج عمرہ اور زیارات نمبر

حج عمرہ کی اولین طرہ سے اسان و عام فہم زبان میں اہم مقامات کی تفصیلی اور دوامیپ (قیمت: روپے 160)

لازوال اسلامی واقعات نمبر

قرآن نمبر

ایمان افروز عقل پرور اور عمل آفرین پیشکش (تین جلدوں میں - قیمت: روپے 525)

اولیائے کرام نمبر

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی ایمان افروز داستانیں (چار جلدوں میں - قیمت: روپے 640)

فرمان رسول نمبر

عاشقان رسول کی خدمت میں ایک بے مثال تحفہ (قیمت: روپے 160)

ازواج مطہرات نمبر

اہمیت المؤمنین کی پاک زندگی کے واقعات و معجزات تک یک جگہ اکٹھے کیے جانے (قیمت: روپے 200)

قرآنی وظائف نمبر

ہماری آپ کی وہ ہر گز کی ہر شے کی انجمن و مشکلات کے حل کیلئے وظائف (قیمت: روپے 175)

اسلامی حکایات نمبر

دلچسپ اور نہ اڑھل و تحریر میں قوت لسانی سے مراد سبق آموز حکایات کا مجموعہ (قیمت: روپے 160)

توبہ نمبر

توبہ کی منزلت کو جاننے کی کوئی ہے نہ سب سے عزیز توبہ کے آداب و فضائل (قیمت: روپے 160)

شرعی احکام نمبر

گناہ، گاؤں کے شیخ خلیل اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے کتے اور بھاری پتھر سے ہاندھ کر نزدیک ترین دریا میں پھینک دیتے۔ اگر وہ ڈوب جائے تو یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ چڑیل نہیں، بالکل معصوم تھی۔ اور اگر نہ ڈوبے تو اس کا چڑیل ہونا مسلم۔ اس صورت میں اسے پانی سے نکالتے۔ گرم کپڑے پہناتے۔ اچھے اچھے کھانے کھلاتے اور پھر آگ میں زندہ جلا دیتے کہ چڑیل کی اس زمانے میں یہی سزا تھی۔ الزاموں کی نوعیت بدلتی رہی ہے، مگر زمانے کا طرزِ تعزیر آج بھی وہی ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اترا تھا

مسٹر اینڈرسن کچھ دن سے ہم پر مہربان تھے۔ ہم ان کے مشیر خاص تھے۔ مطلب یہ کہ ہر اہم مسئلہ پر وہ ہم سے مشورہ لیتے اور ہمیشہ اس کے خلاف عمل کر کے کامیاب ہوتے۔ دوسرے دن انہوں نے پھر تاکید کہا "۲۷ تاریخ نہ بھولنا۔ ایسی کاک ٹیل پارٹیوں کے دعوت نامے حاصل کرنا تمہارے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ چوٹی کے انگریزوں سے میں خود تمہارا تعارف کراؤں گا"۔ ادھر کچھ عرصہ سے ہم خود محسوس کر رہے تھے کہ ہر چند ہماری تنخواہ میں ایک پیسے کا بھی اضافہ نہیں ہوا، لیکن جب سے ہم چیف اکاؤنٹنٹ، سیکرٹری اور انسپکٹر آف برانچز کے عہدوں پر بیک وقت فائز ہوئے ہیں ہماری "ایجنسی" میں ایک خوشگوار تبدیلی آگئی ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اسی تنخواہ میں ہم بہتر سگرٹ دوکلوے کر کے بنے لگے تھے۔ ڈالڈا چھوڑ کر اب اصلی گھی کے نام پر دھوکا کھانا شروع کر دیا تھا۔ لباس اور اس کے لوازمات سے بھی نخوت جھلکتی تھی۔ یعنی ٹائی کی گرہ پھولی ہوئی ہوتی تھی۔ اب ایسے موزے بھی نہیں پہنتے تھے جن میں ایسا سوراخ ہو جس میں سے گردن نکال کر انگوٹھا آزادی کا سانس لے سکے۔

جس محلے میں تھا ہمارا گھر

چاؤ میں اگلے ہفتے مکان بھی تبدیل کر لیا۔ اس محلے میں ایک نہیں، کئی سوداگر رہتے تھے۔ علاقے کے POSH ہونے کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ ہماری چھوٹی بیٹا مسائے کے بچوں کے بارے میں ہم سے پوچھنے لگی، بابا! یہ ہر روز عید کے کپڑے کیوں پہنے پھرتے ہیں؟ گڈ ومیاں نے مسائے کی دیواروں پر ساگوان کی PANELLING اپنی چھ سالہ زندگی میں پہلی بار دیکھی تو ہم سے کہا کہ انہوں نے دیواروں پر بھی فرنیچر لٹکا رکھا ہے! چند روز بعد وہاں میں ہاتھ والی پڑوسن نے بتایا کہ بائیں ہاتھ والی پڑوسن کہہ رہی تھی کہ ہم اپنے بچوں کو اس کے نئے قالین پر حوائج ضروری سے فارغ کروانے لے جاتے ہیں۔ ملاقات و ملاقات تو محض بہانہ ہے۔ "کوئی پوچھے، انھیں اس LOCALITY میں آنے کی مار پڑی تھی۔ ایرانی قالین دیکھے بغیر لاڈلوں کا پیشاب نہیں اُترتا"۔ ہمارے غسل خانے میں کائی لگے گھڑوں اور ٹنکی کے بجائے اب گرم اور ٹھنڈے پانی کا اہتمام تھا۔ یعنی واش بیسن کی ٹونٹی سے گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد پانی لگتا تھا۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں کونکے سے دانت نہیں مانجھتے تھے، بلکہ ٹوب پر ٹوڈو ٹوڈو کر ٹوٹھ پیٹ کشید کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ ہر چیز سے افسری کی شان چمکنے لگی۔ بینک اکاؤنٹ سے بھی سرخی جھلکنے لگی۔

انہی دنوں اینڈرسن نے اپنا جی۔ای۔سی کا پرانا فریج ازراہ پرورش چار سو روپے میں ہمیں فروخت کر دیا۔ نیا ساڑھے سات سو میں آتا تھا۔ ہمارے ہاں مہینوں اس میں پیچے لڑھکتے اور ٹنکن برقاتے رہے۔ پہلے دن تو ہم نے اس میں کوری صراحی بھی رکھی دیکھی تھی۔ تین چار دن استعمال کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا موٹر اینڈرسن کے مزاج کی طرح ہے۔ یعنی جارِ باغیچہ منٹ چل کر آگ بگولا ہو جاتا اور شور و غوغا کرنے لگتا۔ اسے ٹھنڈا رکھنے کے

لیے ہم نے اسی کہنی کا بنا ہوا پٹکا سواتین سو میں خریدا۔ نئے فرنیچ کے مقابلے میں مجموعی سودا پھر بھی ۲۵ روپے سستا پڑا۔ اور انھی داسوں ایک کے بجائے دو چیزیں ہاتھ لگ گئیں۔ پٹکا چوبیس گھنٹے فرنیچ کے بلڈ پریشر کو بگڑنے سے باز رکھتا تھا۔ گرمی زیادہ پڑے تو ہم اپنی مصالحتی چار پائی پٹکے اور فرنیچ کے درمیان ڈال لیتے تھے۔

پیرھن یوسفی

اب ہم اُبلے پوٹی کا آٹھ آنے یومیہ تاوان ادا کر کے، پیر الٹی بخش کالونی لاٹری سے اپنے کپڑے اس ”ارجنٹ“ بیدردی سے نہیں ڈھلواتے اور پھڑواتے تھے کہ جو قمیص صبح دفتر جاتے وقت دے گئے وہ اسی شام شتابی چھو والی یا گھر پر ”ڈیلیور“ کر دی گئی۔ اس زمانے میں ہم اپنی میلی قمیص رات کو دھوبی کے پاس ہرگز نہیں رہنے دیتے تھے۔ اب ہم نے ۸ روپے سینکڑا پر تین قمیص دھونے کے لیے ایک نیا دھوبی لگا لیا۔ کپڑوں کی چوری بھی نہیں رہتا تھا۔ بلد طبیعت میں اتنی احتیاط تھی کہ پہلے ہی دھوب میں دو قمیصوں کے کاروں کی دونوں ٹوکوں پر سامنے ن طرف دھوبی مار کہ لگا دیا تھا تا کہ ان نشانوں کو دیکھ کر احباب پہچان جائیں کہ قمیص کے نیچے ہم ہی ہیں۔ پچھلا دھوبی کار پر تو استری اچھی نہیں کرتا تھا مگر موزوں اور انڈرویر میں خوب کلف لگاتا تھا۔ بنیان میں کلف لگا کر سکیڑنے کی شکایت ہم نے قصداً نہیں کی۔ اس لیے کہ ۳۲ انچ کا جو بنیان ڈھلنے جاتا تھا وہ ۶۴ کا ہو آتا تھا۔ میانوالی کے اس دھوبی کی چوڑی چھاتی سے تنگ آ کر ہم نے خود ڈھونڈ ڈھاڑ کر یہ لکھنؤ کا دھوبی لگایا تھا کہ اس کے ٹاپ ہم سے ملے تھے۔ لیکن ہم یہ دیکھ کر بھونچکے رہ گئے کہ بنیان پہلے ہی دھوب میں ۶۵ انچ کا ہو گیا۔ اور اس میں باسکٹ بال کی سی دونوں کریاں بھی بن گئیں۔ اگلی ڈھلائی پر وہ ایک لٹو چاند سا بنیان ہونے کی خوشی میں لایا۔ نومولود کا وزن ایک ٹن سیری بتایا تھا جس کی تصدیق ہماری بنیان سے بھی ہوتی تھی۔

باقی رہا دفتر، تو وہی کلرک جن کی ہم نے خوشامد کر کے کام سیکھا تھا، اب ہمیں پہلے قمیز سے ”سرا“ کہتے پھر آنکھ مار کے ہماری جمع و تفریق کی غلطی نکالنے کی جسارت کرتے۔ بعد ازاجمل خاں اب ہمیں تم کہنے لگا۔ پہلے ہی کہتا تھا۔ غرض کہ جیسا آپ نے ملاحظہ فرمایا ہماری قدر و قیمت اپنی نظروں میں کافی بڑھ چکی تھی۔ بعض لمحے ایسے بھی آنے لگے جب یوں محسوس ہوتا گویا ہم ہندو دیومالا کی وہ گائے ہیں جس کے سینگوں پر دنیا ٹھیری ہوئی ہے۔ جب وہ جھکن سے ٹھہر تھری لے کر سینک بدلتی ہے تو بھونچال آجاتا ہے۔ کراچیا کی بڑی بڑی دھوتوں میں بھی ہم مدعو ہونے لگے۔ بڑی دھوتوں سے ہماری سرادہ کی تقریبیں ہیں جن میں مہمانوں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہولور جہاں مدعوئین کی فہرست ٹیلی فون ڈائریکٹری نقل کر کے مرتب کی جاتی ہے۔ ان میں ہمیں، مع میزبان، کوئی نہیں پہچانتا تھا، سوائے متبوقا توں والے نظام دین کے آدمیوں کے جن سے روز روز کی ملاقات کے سبب خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔

کاک ٹیل کے آداب

حد اور اس کے بندے ماریں یا چھوڑیں، جھوٹ نہیں بولیں گے۔ جب اینڈرسن سے یہ سنا کہ یہاں شراب پینا فرائض منصبی میں داخل ہے تو ایک دفعہ تو عجب روحانی انشراح محسوس ہوا۔ دھیرے دھیرے پارٹی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ابھی دو ہفتے پڑے تھے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے (گولڈ میڈلسٹ) سے کاک ٹیل پارٹی کے آداب بے خودی کے بارے میں استحواب کیا تو انھوں نے کم و بیش وہی معلومات فراہم کیں جو شیخ سعدی کے زمانے میں بھی دستیاب تھیں۔ مثلاً یہ کہ شراب، شباب اور دولت..... انھیں پا کر جو مست نہ ہو، وہی مرد ہے۔ عرض کیا، جن پجاروں کو یہ لعنتیں میسر نہ ہوں ان کے مرد ہونے کا بھی کوئی چانس ہے کہ نہیں؟ بولے،

کیوں نہیں، مرد باید کہ ہر اسان نہ شود، ہر اسان پر عرتی کا ایک شعر سنو۔
جو شعر انھوں نے سنا یا اس کا عرتی سے ہی نہیں، ہر اسان ہونے سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ شعر کا سرور بڑھا
اور زبان کھلی تو فرمایا کہ غالب نے نئے کے مقابلے میں شہد کو نکس کی گئی کہا ہے۔ شعر اور شراب دونوں ہی دافع
حجاب ہیں۔ اور یہ نہ بھولو کہ تمھارے پیشے میں حجاب حرام ہے۔ کبھی تم نے غور کیا، شراب کو ”ڈرکس“ کہا جائے تو
کم حرام معلوم ہوتی ہے! اور ہاں! جب نظریں نظروں سے اور شرابیوں شرابیوں سے ملیں تو کاک ٹیل ہر جانی کے
پیار کی مانند تند و تیز ہو جاتی ہے۔

”کیا لوگ شرابیوں کا بھی ”دین الہی“ بتاتے ہیں؟“ ہم نے ان کے ہیرو اکبر اعظم پر چوٹ کی۔
”اسی کو تو کاک ٹیل کہتے ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں آیا ہے کہ.....“

ان کی علمی اڑان بڑھتی چلی گئی تو ہم نے ”نیل لینڈنگ“ کراتے ہوئے پوچھا ”پروفیسر! کاک ٹیل پارٹی
میں گلاس کون سے ہاتھ میں پکڑتے ہیں؟“ بولے ”آف کورس! دائیں ہاتھ میں“۔ پوچھا ”پھر مصافحہ کون سے
ہاتھ سے کریں گے؟“ ذرا دیر کو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر فرمایا ”اگر دوسرے نے بھی گلاس دائیں ہاتھ میں تھام رکھا
ہو تو پھر بائیں ہاتھ ہی سے مصافحہ واجب ہے۔“

مرزا عبدالودود بیک سے صلاح کی تو اس ابتدائی اعلان کے بعد کہ کاک ٹیل پارٹی ملک کی مضبوط ترین
پارٹی ہے، فرمایا ”دو پریکٹیکل ڈپ دیتا ہوں۔ اول یہ کہ یہ شے کڑوی ہوتی ہے۔ منہ نہیں بگاڑنا چاہیے۔ تمھارا تو
سارا بچپن جو شاندار ہے، کوئین مکسٹر کیسٹر آئل، ٹیگر آئیوڈین اور چکرورتی کی ارضیہ کھجک سے ہی شغل کرتے گزرا
ہے۔ پھر کیا ڈرنا؟ ہائے! کیا خوب کہا ہے ظالم نے:-

جو پینے والے ہیں وہ پی کے منہ بتاتے ہیں

جناب شیخ جو ہیں منہ بنا کے پیتے ہیں

پوچھا ”اور اگر ہم بالکل نہ پیئیں تو کس وقت منہ بنانا مناسب و مباح ہوگا۔“

”مگر یہ تو حضور والا کے چہرے کا نارل ایکسپریشن ہے! خیر۔ دوسرا ڈپ میں نے رسالہ MEN ONLY
میں دیکھا تھا۔ لکھا تھا کہ کاک ٹیل پارٹی میں کوئی بھی بیٹھ کر شراب نہیں پی سکتا۔ مکروہ ہو جاتی ہے۔“

پوچھا ”کیوں؟“

پہلے تو چکرائے۔ پھر سنبل کر بولے ”ہاں! کاک ٹیل میں سب کھڑے ہو کر پیتے ہیں۔ تاکہ جب گر پڑیں
تو اندازہ ہو جائے کہ اب اعتدال لازم ہے۔“

سیاہ جاول 'رم اور مغرور گردن والی

جیسے جیسے ۲۷ تاریخ نزدیک آتی گئی، ہماری گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ راہ راست سے بھٹکانے والا کوئی
رہبر نہ ملا کہ ہماری دوڑ پاک پوٹسمین کافی ہاؤس تک تھی۔ بالآخر نوابزادہ غفران اللہ خاں سے رجوع کیا جو کراچی
کے ہر کلب کے ممبر تھے اور جن کے بغیر شہر کی کوئی کاک ٹیل پارٹی کھل نہیں سکتی جاتی تھی۔ ہر فقرے پر خواہ اپنا
ہو یا پرایا، بے ساختہ قہقہے لگانے کے سبب THE LAUGHING CAVALIER کہلاتے تھے۔
صورت بھی ہال کی اسی نام کی شہرہ آفاق پینٹنگ سے ملتی تھی۔ اینڈرسن کے ہم پیالہ تھے۔ ہم پر شفقت فرماتے
تھے۔ باتوں میں وہ رس اور رچاؤ جو علم مجلس، ہتھکی جھٹکائی جنسی آسودگی، میٹھے سمجھاؤ اور پندرہ ہزار ایکڑ اراضی

سے پیدا ہوتا ہے۔ شہر سے باہر اُن کا بہت بڑا باغ تھا جس میں بوگن ویلیا کی سو سے زیادہ قسمیں تھیں۔ ویسے بڑے با اصول، انسان دوست اور جفاکش آدمی تھے۔ نان حلال اور آپ حرام پر گزرا رہ تھا۔ بڑے لطف و مرحمت سے پیش آئے۔ جاپان سے منگائے ہوئے گلابوں کے تختوں کی سیر کروائی۔ وہ قطعہ بھی دکھایا جس پر انہوں نے سیاہ چاول کاشت کیے تھے۔ ہم نے پوچھا، یہ کوئی افریقی درائشی ہے؟ بولے، نہیں۔ جنوبی امریکہ گیا تھا تو دو چار منگھی بیج اُورو کوٹ میں چھپا کر لے آیا۔ لندن سے HYDRANGEA پھول کے بلب بھی اسی طرح اسمگل کیے تھے۔ مٹی گن میں بھی جنگلی چاول ہوتا ہے، مگر وہ بات کہاں۔ اس سال میں سیر چاول نکلے۔ سات ہزار لاگت آئی۔ جاتے وقت ۱/۲ پونڈ سوغات لے جانا بھولنا۔ ہم نے پوچھا، انھیں کھاتے کیسے ہیں؟ فرمایا، سیاہ چاول تو مغرور گردن والی میلرڈ (مرغابی) اور گلابی زم کے ساتھ مزہ دیتے ہیں۔ دسمبر میں یاد دلانا۔ ان کا بھی بندوبست کردوں گا۔ سکندر مرزا بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ عرض کیا، حاجت روائی ہی مقصود ہے تو اب کی مہاوٹ حضور صرف مغرور گردن والی کا بندوبست فرمادیں۔ اور نسخہ کے بقیہ مقویات کسی اور حقدار کو پہنچا دیں۔ کہنے لگے، پہنچانے کی بھی ایک ہی کمی۔ تمہارا خیال ہے کہ چوہے دان خود چل کر چوہے کے پاس جاتا ہے؟ ہاں! تحلیل غذا کے لیے تمہیں آدھ گھنٹے ڈارو تھی (ان کی سیکرٹری) کے ساتھ ڈانس کرواؤں گا۔ اُٹھے تیرے بھاگ لپچے۔ اسی کی RECIPE سے ایک نئی ڈش بھی کھلاؤں گا جو فرانس میں انگوڑی تیل کی سوکھی ڈنڈیوں کی نشلی آنچ پر پکائی جاتی ہے۔ اس پر خمیری کا چھینٹا دیتے ہیں۔

بعد ازاں اپنی زمیں دوز بار میں لے گئے۔ چار پانچ ٹن دبائے تو رنگ برنگی روشنیوں سے ان کے چہرے پر وہ دلاویز نرمی اور شادابی نظر آنے لگی جو دھیمے پھل رنگوں میں ہوتی ہے۔ ایک کونے میں نیکرو عورت کا لائف سائز برہنہ مجسمہ رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شب تاب سیج تھی اور دوسرے میں انسانی کھوپڑی کا پیالہ۔ عورت کا جوڑا اٹھا کر دو پیگ ڈال دیں تو دوسری طرف غذائی غددوں سے وِسکی رسنے لگتی۔ ایک ممتا بھر تیل پر لپ اسٹک کا تازہ نشان اور دوسری سے سگار کی مہک آرہی تھی۔ گلے میں ایک ہب بندھا تھا جس پر مردانگی و شجاعت کے دیوتا ہرکولیز کی تصویر کڑھی تھی۔ بائیں جانب طاقتے میں گوتھک طرز کی ایک خانقاہ بنی ہوئی تھی اور اس کے آدھ نہیں، بلکہ محض اس غرض سے نقل کر رہے ہیں کہ یہ اس داستان کے مرکزی کردار اینڈرسن کا فلسفہ حیات تھا جس کی وہ تلقین کرتے رہتے تھے۔ یہ تھا وہ یونانی فلسفہ جو اسکاٹ لینڈ کی شراب کی بھینوں سے گزر کر ہم تک پہنچا تھا۔

Hermit hoar, in solemn cell,
Wearing out life's evening gray:
Smite thy bosom, Sage, and tell
What is bliss, and which the way?

Thus I Spoke: and speaking sigh'd:
Scarce repress'd the strating tear,
When the hoary Sage reply'd

فرمایا "چار مصرعوں کی زبانی کو تو ہندی میں چوپائی کہتے ہیں۔ آپ نے تو صحن چمن میں تپائی رکھ دی۔ میرے والد کی عادت تھی کہ کبھی کوئی بُری خبر سنتے، یا کھڑی فصل کو پالا مار جاتا، یا خاندان میں غمی ہو جاتی تو شعر پڑھا کرتے تھے۔ آپ تو خوش ہوتے ہیں جب بھی شعر پڑھتے ہیں!" پھر پوچھا "اور یہ کیا بلا ہے جو رنگت اور نُو سے مست فخر کا قازورہ معلوم ہوتا ہے؟" کہنے لگے "لاحول ولا قوۃ! یہ تو دنیا کی بہترین میسر میونخ میسر ہے۔ نازی انقلاب کی بنیاد میسر خالوں ہی میں رکھی گئی تھی۔"

اُردو زبان کی غمی دامن کی کا گلہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہمارے ہاں ہر تیز پانی کے لیے صرف ایک گالی ہے..... شراب! اسی طرح مٹنے کی اُردو میں لے دے کر دو قسمیں ہیں۔ دوسری کو برادر خورد کہتے ہیں۔ اور آپ کو حیرت ہوگی، فارسی میں تو گلاب تک کے لیے کوئی علیحدہ لفظ نہیں۔ دیکھا جائے تو انگریز نے ہمیں..... پورے برصغیر کو..... کتوں پھولوں اور شراب کی مختلف اقسام اور نفاستوں سے روشناس کیا۔" ہم نے گرہ لگائی۔ "ورنہ یہاں کیا دھرا تھا۔"

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھکڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھکڑا

فرمایا "آپ غلط پڑھ رہے ہیں۔ مویشی چرانے پہ عرب میں جھکڑا ہوتا ہے۔ اپنے ہاں چرانے پہ ہوتا ہے۔"

کاک ٹیل گانیڈ

لیجیے، دو ڈھائی گھنٹے کے سوال و جواب سے مکمل "رہنمائے کاک ٹیل پارٹی"..... پہلے پیک سے صبح کے HANG-OVER (خمار) تک..... تالیف ہوگئی۔

خلاصہ خرافات و خمریات نو آموزوں کی عاقبت سنوارنے کے لیے حاضر ہے:-

- ۱۔ پہلا اصول تو انھوں نے یہ بتایا کہ جب تک کوئی مشترک شناسا تعارف نہ کرائے، کسی سے بات نہ کرو۔ انگریز تو جب تک باقاعدہ انٹروڈکشن نہ ہو، کسی کی گالی کا بھی جواب نہیں دیتا۔
- ۲۔ ایک ہی جگہ اتنی زیادہ دیر جم کر کھڑے نہ ہو کہ جملہ پورا ہو جائے۔ سرکولٹ (گردش) کرتے رہو۔
- ۳۔ جو تم سے رتبہ میں چھوٹا یا بے فیض ہو، یا آگے چل کر کام نہ آ سکے، اس کی صحبت سے گریز کرو۔ لیکن جو تمھارا لوٹس نہ لے، تم بھی اُس کا لوٹس نہ لو۔
- ۴۔ سنجیدہ گفتگو سے پرہیز کرو۔ ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ تم ابھی سے TIPSY (ہلکے ہلکے) ہو گئے ہو۔

۵۔ اگر نماز کی گاد یا نمبو پانی پر ٹوکل کرتے ہو تو کسی سے یہ ہرگز نہ کہو کہ شرعی ممانعت کے سبب نہیں پی رہے ہو، یا PRACTICING MUSLIM ہو۔
خونی چیخ کا بہانہ بنا دو۔

۶۔ اگر مذکورہ بالا آلائی یعنی سافٹ ڈرنک پی رہے ہو، تب بھی لیڈیز سے ہلکی ہلکی باتیں کرو۔ کاک ٹیل کا سب سے بڑا

مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم
سب سے آخر میں نکلتا ہے۔
سناں احمد بوسفر

فائدہ یہ ہے کہ مردوں کو بدتمیزی کرنے کا ایک معقول بہانہ مل جاتا ہے۔ عورت اگر خوب صورت ہے تو فلٹریشن اس کا حق ہے، اور اگر بد صورت ہے تو اس کے ساتھ حتی الامکان فلٹر کرنا آدمی کا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے۔ تم بہت کم سخن کم آمیز ہو۔ بند بند سے رہتے ہو۔ میں نے آدمی کی پارٹی میں دیکھا کہ خواتین سے تعارف کے وقت، تم اپنی نظر، نیت اور نیک نائی ہی درست کرتے رہ گئے۔

کیا زنانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

بچہ! ایسے سنے تو پلک جھپکنا بھی روپ کا اہمان ہے۔

۷۔ کاک ٹیل پارٹی میں ہر ایک سے اعتماد کے ساتھ، جم کے بات کرو۔ دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلکہ نکال کے۔ دسکی کے ہر گھونٹ کے بعد اپنی بات کا وزن بڑھتا ہوا صاف محسوس ہوتا ہے۔ عرض کیا، بیرومرشدا یہ کیفیت تو ”لبریم“ کی گولی سے بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔ فرمایا، بڑا فرق ہے۔ استاد ذوق نے کیا خوب کہا ہے۔ آپ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔

چند مغال کے پاس وہ دائرہ ہے جس سے ذوق

نامرد مرد مرد جواں مرد ہو گیا

لبریم کے بعد ملی کوچوں کی حاجت نہیں رہتی۔ پھر اسے خواب میں چھپھڑے نظر نہیں آتے، بلے نظر آتے ہیں۔ لیکن شراب پی کر چوہے کی مونچھیں اتنی اکڑ جاتی ہے کہ اپنے بل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ ملی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے کہ کدھر گئی وہ نر دار؟

۸۔ جب ہر بات FUNNY اور ہر چہرہ حسین دکھائی دینے لگے تو فوراً کوئی تڑش چیز کھا لو۔ یہ دستیاب نہ ہو تو اپنی بیوی کی تصویر بڑے سے نکال کر ایک نظر دیکھ لو۔

۹۔ ڈھیلے کار کی قمیص پہن کر جاؤ۔ نشہ میں کوئی گر پڑے تو بھول کر بھی اس کی خیند میں غل نہ ہو۔ انگلینڈ میں اس صدی کے ادائل میں، جسے ایڈورڈین دور کہا جاتا ہے، اونچے کلبوں میں چھوٹے چھوٹے چھوکرے صرف اس کام پر تعینات ہوتے تھے کہ جیسے ہی معزز ممبر کرسی سے کھڑک کر گرے، وہ میز کے نیچے گھس کر کارڈھیلا کر دیں تاکہ دم گھٹنے سے کلب میں موت واقع نہ ہو۔

۱۰۔ واپسی میں اپنا سارا وزن کار کے بریک پر ڈالے رکھو۔ بجلی کے کھمبے سے کار روکنے سے گریز کرو۔ کھمبے گر جائیں تو کتوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔

۱۱۔ نشہ گہرا ہو جائے تو طبیعت سچ بولنے پر بے تحاشا مائل ہوتی ہے۔ لہذا گھر پہنچ کر بیوی سے بات چیت کرنے سے پرہیز کرو۔

۱۲۔ صبح آنکھ کھلتے ہی محسوس ہونے لگے کہ معاشرے میں اندھیر مچا ہوا ہے اور حکومت اپنی پالیسی سے قوم کو تباہی کے قار میں دھکیل رہی ہے تو ایک اسپرین کھا لو۔ دس منٹ کے اندر اندر حکومت کی پالیسی میں افاقہ محسوس ہوگا۔

زوٹھی دھرتی

انھوں نے موسم کی ترکاریاں اور پھل ہمارے ساتھ کیے۔ اور جیب میں بٹھا کر اپنے باغ اور فارم کی سیر کرائی۔ کہنے لگے، دس گھنٹے روزانہ کام کرتا ہوں۔ میرا باپ زمیندار تھا۔ مجھے بھی کھیتی باڑی سے لگاؤ ہے۔ اکثر ہوتا ہے کہ پارٹی سے رات کو ڈھائی تین بجے لوٹتا ہوں۔ مگر صبح ساڑھے چار بجے اپنے وقت پر اٹھ جاتا ہوں۔ گنہگار ہوں۔ (وہ

آبدیدہ ہو گئے) فجر کے بعد دو گھنٹے کھیتوں میں ضرور گزارتا ہوں۔ عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ پو پھٹنے سے پہلے ہر تیسرے منٹ مطلع اور منظر کا موڈ آنکھوں کے سامنے بدل نظر آتا ہے۔ اُجالے کی ہر لہر کے ساتھ چیزوں کی چہکار کی لے بھی بدلتی جاتی ہے۔ پھر ایک ایک پھول سے باتیں ہوتی ہیں۔ سب سے اپنی یاری ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی پھول ڈالی سے نہیں توڑا۔ گیہوں کی سنہری بالیں دیکھتے ہی جھومنے لگتی ہیں۔ کبھی کوئی بوٹا اُداس ماندہ دکھائی دے تو دن بھر خلش سی رہتی ہے۔ زندگی کو سمجھنا چاہو تو کوئی درخت، کوئی پودا، کوئی پھول..... ایک ہی سہی..... کیلشس ہی کیوں نہ ہو..... لگا کر دیکھو تو سہی۔ زمین کسان سے، اپنے چاہنے والے سے، ہر بار بے وفائی کرتی ہے۔ وہ پھر اس پہ اعتبار کرتا ہے۔ دھوکے پہ دھوکا کھاتا ہے۔ پھر بھی پیار کیے چلا جاتا ہے۔ اور جب وہ پیار کے لائق نہیں رہتا تو گاؤں چھوڑ دیتا ہے۔ شہر آ کر اپنا تھکا ہارا بھر کسی محل کے سپرد کر دیتا ہے۔ شہر میں پھر اسے جیتے جیتے زمین اپنی صورت نہیں دکھائی۔ دری چٹائی سنگ مرمر سینٹ ٹائٹلز کے فرش اور تارکول تلے اپنا منہ چھپائے رہتی ہے۔

باٹل سے دبنے والے اے آسمان نہیں ہم

ایک دوست نے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ دی جس کا "سائی لینن سر" پٹا ہوا تھا۔ اس کے اودھماکوں سے اپنی سلامی آپ دیتے اور لیتے ہوئے ہم پارٹی میں پہنچے تو آٹھ بج رہے تھے۔ اس وقت کاک ٹیل پارٹی اپنے شباب پر تھی۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس کے نصف حصے میں تو شباب بھی شباب پر تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رنگ پہ آنے کے بعد کاک ٹیل میں اتنی تاخیر سے شریک ہونا ایسا ہی ہے جیسے تیز چلتے ہوئے MERRY-GO-ROUND (پھر کی کی طرح گھومنے والا جھولا) میں بیٹھنے کی کوشش کرنا۔ لان پر بڑے جگ جگ تھے۔ درختوں اور جھاڑیوں میں اُدے اُدے، نیلے نیلے، پیلے پیلے قہقہے انہی رنگوں کے پیر ہنوں کو آنکھ مار رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ بیشتر مہمان نہ صرف آچکے ہیں بلکہ بعض تو اس قابل بھی نہیں رہے کہ واپس جاسکیں۔ بات بے بات ہنسی کہ اُن ہوئے کو پیار آئے۔ آنکھیں گلابی پنڈے گرم چہرے گلزار۔

دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام

لان کے پر لے کنارے پر پیر نے منزل بادشاہوں کی یونیفارم، مع راجپوتی گچڑی، پہنے ڈرنکس بنا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ہیرا نظر بچا کر چیکو سلوا کیے کے بنے ہوئے گلاسوں کو منہ کی بھاپ سے نم کر کے پٹا نہ تابدار کو اور بھی تابدار کر دیتا تھا۔ کافی مہمان ایسے تھے جو کسی کاک ٹیل سے آرہے تھے یا کسی اور کاک ٹیل میں جانے والے تھے۔ ہم اصول نمبر ۳ پر سختی سے کار بند تھے کہ جو شخص اپنے سے کم مرتبہ نظر آئے یا آگے چل کر کام نہ آ سکے، اس کا نوٹس نہ لو۔ کچھ دیر بعد یکا یک منکشف ہوا کہ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ کوئی ہمارا نوٹس نہیں لے رہا ہے! چاروں طرف نظر دوڑائی، ہمیں کوئی اپنے سے کم حیثیت نظر نہ آیا، سن ہو گئے۔ اب جو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بڑے لوگ ہمیں "انٹوز" کرنے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔ کنارہ کش ہوتے ہوتے ہم نے خود کو ایک کونے میں چینی تارگی کی جھاڑی کے پاس ایستادہ کر لیا۔ اور نمکین بادام اور خضال کے ٹکڑوں میں انگی ہوئی مرغی کی کیلچی سے شغل کرنے لگے۔

توک سے

اس سے پہلے ہم کسی کاک ٹیل میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ سنا ہی سنا تھا۔ چنانچہ بے حد سراپہ دشمن۔ ایک INHIBITION ہو تو بیان کریں۔ ہمارے ساتھ کے اکثر لوگ کبھی کے کبھی گھسا کر ہڈی کی چکنی پیٹا

ہو گئے تھے۔ لیکن ہم ہنوز اس درجہ دقیا نوسی اور ناتراشیدہ تھے کہ ڈرکس کا ترجمہ شراب اور غم غلط کرنے والوں کو شرابی کہتے تھے۔ انہی ایام حیرت کی بات ہے، ہم نے مرزا سے کہا کہ شراب اسلام میں حرام ہے۔ پھر کیا وجہ کہ جتنا ذکر، جتنے قصیدے شراب کے اُردو اور فارسی شاعری میں ہیں، اتنے دنیا کی تمام زبانوں کو بلا کر نہیں نکلیں گے!

فرمایا ”چودہ سو سال سے طاق حصیاں پہ رکھے رکھے، اس کا تیرہ صدی بہ صدی تیز تر ہوتا چلا گیا۔“ بعد ازاں تشریح فرمائی کہ مغل بادشاہوں نے کبھی اس گناہ کو تعزیری جرم قرار نہیں دیا۔ اگر ایسا کرتے تو بیشتر تاجداروں کی زندگی زنداں میں کلفتی، تخت پر کون بیٹھتا؟ فیض کے اسباب..... پل، چاہ مسجد اور بھینسوں کے غسل خانے یعنی تالاب کون بنواتا؟ لیکن مستثنیات کہاں نہیں۔ جناب محمد باقر شمس، معصنف تاریخ لکھنؤ، مرزا یحییٰ آصف الدولہ وزیرالہما لک رستم جنگ کے پاس شریعت اور دینداری کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ ”دیندار بھی بہت تھے، پہلے شراب پیتے تھے۔ غفران مآب کے موصیے سے متاثر ہو کر توبہ کی اور بھگ پنا شروع کی۔ انہوں نے بھگ کی حرمت بھی بیان کی اور اس کو بھی ترک کر کے انہوں پر استغفا کر لی۔“ ہم تاریخ داں تو نہیں، لیکن ہماری چھٹی حس کہتی ہے کہ مرزا یحییٰ آصف الدولہ نے اس مرحلہ پر غفران مآب کی صحبت کو بھی ترک کر دیا ہوگا۔

لسی پت کے دیو

سوا آٹھ بجے ہمارے پیرمٹھاں جتنے کھلکھلاتے وارد ہوئے اور ہماری جان میں جان آئی۔ انہوں نے خواتین و حضرات سے ہمارا تعارف کرانا شروع کیا۔ اور ہم نے ”سرکولٹ“ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر مرتبہ کھوٹے سکے کی طرح واپس کر دیے گئے۔ ایک صاحب نے تو ہم سے صرف دو انگلیوں سے مصافحہ کیا۔ سو سوا سوا مردان خوش اوقات کی اس محفل میں ہمیں ایک بھی ایسا نظر نہ آیا جس کی آمدنی ہم سے کم ہو۔ جدھر نگاہ اٹھائی، جہاں گئے، وہی ایک منظر..... مایا کو مایا اور روپ کو روپ پیے ملے کر کر لے ہاتھ۔ اس لٹکا میں کبھی باؤن گزے تھے۔ اور یہاں یہ حال کہ فضیلت، نہ عزت نہ فرمانروائی، ہر دیو سے ہاتھ ملانے کے بعد ہم نے اپنا قد ایک انچ کم ہوتا محسوس کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے تک ہم لان پر ریٹنے لگے۔

ہم نے مرشد سے جا کر پوچھا، حضرت! آپ نے تو ہدایت فرمائی تھی کہ خلوئے معدہ دہسکی نہیں پینی چاہیے۔ آپ نے دو پیگ ہماری آنکھوں کے سامنے نوش فرمائے اور مرغ کی کچلی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ فرمایا تمہاری نظر ٹھیک کام کر رہی ہے۔ ہاتھ نہ لگانے کی وجہ یہ کہ انگریزوں کے ہیرے مرغی ذبح کرتے وقت ٹھیک سے کلمہ نہیں پڑھتے۔ ایسا گوشت مکروہ ہوتا ہے۔ ممانعت آئی ہے۔

یکے بعد دیگرے ٹھانڈے جوس کے چار گلاسوں کے بعد ہماری زندگی کا واحد نصب العین یہ رہ گیا کہ، بلا منتہی نہ۔، ٹائلٹ کا نزدیک ترین راستہ دریافت کر لیں۔ (کاک ٹیل میں بیروں، بوڑھوں اور اپنی بیوی سے بات کرنے سے ہمیں سختی سے منع کر دیا گیا تھا) اتنے میں ایک قات کے پیچھے سے ایک بوڑھے انگریز کو ایک ہاتھ سے اپنا سر اور دوسرے سے پتلون تھامے آتے دیکھا تو جن تاریک راہوں سے وہ نکلا تھا، اسی طرف ہم ایسے ہوئے ہوئے قدموں سے روانہ ہوئے کہ پیٹ کا پانی نہ بٹنے پائے۔ جان کلی جاری تھی، خیر اس کا تو غم نہیں۔ خدشہ تھا جان نکلنے سے پہلے کچھ اور نہ نکل جائے۔ پچاس ساٹھ مختا قدموں کے بعد، گویا مینا خانہ بارودش ہے،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹھکانہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



ہم نے اپنی منزل مقصود کو جالیا۔ باوردی بیروں کی قطار ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے رنگین تولیے لیے کھڑی تھی۔ ایک نستعلیق سے پارلش بیرے نے بڑھ کر پوچھا:-
”حضورؐ فرمائیں گے یا چھوٹا حاجت؟“

نیوٹن جونینر

راستے میں میکفرن مل گیا۔ کہنے لگا کیا بات ہے؟ ابھی ابھی کچھوے کی طرح گئے اور الائیڈز بینک کے گھوڑے کی طرح کد کڑے لگاتے واپس آئے! تم اتنی دیر تک بجلی کے کھمبے کی طرح تن تہا کھڑے رہے۔ زندگی بہت مختصر ہے۔ آؤ تمہیں ایک امریکن شعلہ بدن سے ملواؤں۔ ڈپلویٹک کور کی پارٹیوں کی جان ہے۔ پاک امریکی دوستی کی حامی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی خیر سگالی کا مظاہرہ گھر پر ڈھیلی گرہ کالا چاباندہ کر کرتی ہے۔ ذرا دیر باتیں سنو گے تو گردیدہ ہو جاؤ گے۔ کس طرح کی لذت ہے ٹو پچھ دیکھ برے پار!

میکفرن بڑی خوبیوں کا آدمی تھا۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ کہ اس بھری محفل میں وہ تنہا یورپین تھا جس سے ہماری شناسائی ہی نہیں، بے تکلفی بھی تھی۔ دوسری خوبی یہ کہ وہ کسی کو اداس نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہنس مکھ، بذلہ، سنج حاضر جواب۔ ان دنوں اس نے نیوٹن کی کشش عقل کی تھیوری میں ایک انقلاب آفریں ترمیم کی تھی۔ معاشیات اور کم لباسی پر ان کے فرمودات محفل کو گھنٹوں گرم رکھنے کے لیے کافی تھے۔ ان کی تھیوری یہ تھی کہ ۱۹۵۲ء کے بعد سے زمین کی کشش ہر چیز کو نیچے کھینچتی ہے، سوائے قیمتوں، پاکستانی بیورو کریٹ کے سر اور ماڈرن BRA کے مشمولات کے جوئی زمانہ صرف آسمان کی کشش کے تابع ہیں۔ اس فلکیاتی دریافت کی بنا پر یہ کلب میں نیوٹن جونینر کہلاتے تھے۔ ہمیں اداس اور بے آسرا جان کر عزیز رکھتے اور اکثر اپنی چلبلی گفتگو سے ہماری سوئی ہوئی ہلکے خرائے لیتی ہوئی اُمگوں کو بیدار کرتے۔ اس وقت ہمیں لپٹانے لگے کہ اسے ایک نظر دیکھو گے تو دل ہی نہیں، تمہاری گھڑی کی دھڑکن بھی تیز ہو جائے گی۔

بے وقوف

دو بے وقوفوں کو ٹرانسفارمر لگانے کی غرض سے کھمبے کی اونچائی معلوم کرنے کیلئے بھیجا گیا۔ کافی دیر تک وہ اسے اُچھل اُچھل کرنا پنے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکامی ہوئی۔ اس دوران ایک شخص کا وہاں سے گزر ہوا، یہ سب دیکھ کر اس نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دھات کا بنا ہوا ہے اس کو زمین سے کھود کر لٹا لو اس طرح لمبائی ماپنے میں آسانی رہے گی۔“ اس شخص کے جانے کے بعد دونوں بے وقوف قہقہے لگانے لگے۔ پھر ایک نے کہا۔ ”دنیا میں کیسے کیسے بے وقوف پڑے ہیں..... اس گھامڑ کو اتنی عقل بھی نہیں ہے کہ ہم کھمبے کی اونچائی معلوم کرنے آئے ہیں لمبائی نہیں۔“

تجہ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

نیوٹن جو نیئر نے اس لذت چشیدہ کے بارے میں جو معلومات اپنا منہ ہمارے کان سے لگا کر فراہم کیں، ہم نے اس لذیذہ کو ان سے کچھ زیادہ ہی پایا۔ مردوں میں شتر بے مہار پھر رہی تھی۔ میکٹرن نے یہ مژدہ بھی سنایا کہ شاید طلاق ہو جائے۔ موٹی اسامی کی گھات میں ہے۔ جلتے ہوئے مکان کو کرائے پر اٹھانا چاہتی ہے! وہ اس وقت اس تنکے میں پرویا ہوا کھنا زیتون کھا رہی تھی۔ ہاتھ ملایا تو محسوس ہوا گویا اسے ۱۰۵ ڈگری بخار ہے۔ باتوں میں بھی سرسای کیفیت۔ سمندری نیلے رنگ کے چست لباس پر سے نگاہیں اور چست تر فقرے پھسل رہے تھے۔ واشگاف لائیک لائن نے سمندر جھاگ گھاٹی میں ایسی آدمی دباؤ ڈکی لگائی تھی کہ، ہوتیر نے والا شرمندہ اور ڈوبنے والا ناز کرے۔ پیٹھ بھی انگریزی کے U کی طرح تاجہ ادب کھلی ہوئی۔ لیکن ہمارے لیے ان سب سے زیادہ یہ دلکشی کہ اس کا شوہر ایک امریکن کہنی کا منبر تھا اور اس کے اکاؤنٹ سے ہمارے دن پھر سکتے ہیں۔ ڈگنا تنکا سالانہ انگریمنٹ مل سکتا تھا جس سے ہم نئی عینک بنا سکتے تھے۔ قالین خرید سکتے تھے۔

یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا

یوروپین بیسیوں کے بارے میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ کچھ بھی پہن لیں، بھلی لگتی ہیں۔ کچھ بھی نہ پہنیں تو پکڑھٹ ہو جاتی ہے۔ مگر سارا الزام جدید یوروپین فیشن پر رکھنا صریحاً ناانصافی ہوگی۔ یونہی ہوتا آیا ہے۔ سو سال پہلے اسی طور فقیر اکبر آبادی اس زمانے کی کتریہونت اور اپنے دو طرفہ رد عمل کا اظہار فرما گئے ہیں:-

آگما بھی کھل رہا ہے، پیچھا بھی کھل رہا ہے

یاں یوں بھی واہ واہ ہے اور ووں بھی واہ واہ ہے

اسی سے ملتا جلتا نقشہ نواب درگاہ علی خان نے دلی کی نامی گرامی طوائف امر بیگم کا اپنی قاری توارخ میں کھینچا ہے جس کا اردو ترجمہ ”نادر شاہی قتل عام کی دہلی“ حضرت خواجہ حسن نظامی نے کیا ہے۔ فرماتے ہیں ”اس کا کمال یہ ہے کہ یہ حسین اور طوائف ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر تنگی رہتی ہے اور مجلسوں میں بالکل برہنہ آتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جسم کے اسفل حصہ کو بالکل عریاں کر کے اس پر پاجامے کی نقاشی کرواتی ہے۔ کخواب کے تھان کی طرح اور نئے دار پانچامے کی مانند اس کے زیریں جسم پر پانچامے کی تصویر بنی ہوتی ہے جو بالکل پانچامہ معلوم ہوتی ہے جب امر بیگم امیروں کی مجلسوں میں عریاں پانچامہ پہنے ہوئے آتی ہے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تنگی ہے۔ اس راز کو اس کے مخصوص آشنائی جانتے ہیں۔ امر بیگم بہت محبوب خلایق ہے۔“ خیر امر بیگم کے محبوب خلایق ہونے کی وجہ تو ظاہر ہے، مگر اگلے وقتوں کے بزرگوں کی شان ہی کچھ اور تھی۔ ہر بات میں ثواب کا پہلو نکال لیتے تھے۔ چنانچہ سلیس و لذیذہ اردو میں ترجمہ کے بعد حضرت خواجہ حسن نظامی نے کہ دلی کے روڑے اور شیدائی تھے صرف یہ حاشیہ لگایا ہے کہ ”اس سے دہلی کی مقوری کا کمال ظاہر ہوتا ہے!“ ہائے ہائے! نہ ہوئی امر بیگم۔ سن لیتی تو پانچامہ پیٹ کے رہ جاتی۔



”خود جلیں دیدہ اغیار کو بینا کر دیں“



husain_sayyed2001@yahoo.com

قلندر حسین سید سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلم کار ہیں۔ گزشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سید نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیلوں کی کھٹاس، کوڑا کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

حاصل مطالعہ

☆ ”اٹی ہائیٹک“ دوائیوں کے کچھ سائیڈ ایفکٹس ایسے بھی ہیں جنہوں نے گردے کی پتھری نکالتے نکالتے معدے اور پتے کوئی طرح متاثر کر دیا۔ دیکھتا ہے میرے منہ کی طرف قائد اعظم کا پاکستان دیکھ

☆ جو عدالتیں عوامی احتجاج سے متاثر ہو کر فیصلے بدل دیں وہ عدالتیں نہیں بادیانی کشتیاں ہیں جن کی منزلوں کا تعین ملاح نہیں ہوا میں کرتی ہیں۔

☆ جو قومیں اپنے سے بدتر جاہل اور بدکردار لوگوں کو اپنا آقا بنالیں۔ ان کے لیے کبھی کوئی موسیٰ نہیں اُترا کرتا۔

☆ جو وطن اپنے شہریوں کو روٹی نہیں دے سکتا،

☆ زمانہ بُرے لوگوں کی بُرائی کی وجہ سے خراب نہیں ہوتا بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی کی وجہ سے خراب ہوتا ہے (حضرت علیؓ)

☆ گلی گلی شہر شہر ملاں کا شور ہے کہ ”مسجد زیر تعمیر ہے“ چندہ دے کر ثواب دارین حاصل کریں۔ بچے پرانے کپڑے بھوکے پیٹ تنہا بچہ سوچ رہا ہے کہ کاش ”میں بھی مسجد ہوتا۔“

☆ آج کل تعلیم سے ہم صرف اتنا سیکھ رہے ہیں کہ اوروں کو کہہ سکیں ”جاہل“۔

☆ ہمیں سے لوگوں کو مارنا دہشت گردی کہلاتا ہے اور بھوک سے مارنا جمہوریت ہے۔

حسب روایت خفیہ شادی، تصدیق 'تردید' تصدیق کا سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ یہ شادی ختم بھی ہوگئی کہ ان کا Pair ٹوٹ چکا تھا۔ عدیل کسی اور "سیٹ" پر کسی نئی اداکارہ کو یقین دلارہا تھا کہ وہ اس کی آخری محبت ہے۔ فلمی اور غیر فلمی دونوں۔

لیکن نہ جانے ایسا کیوں ہوا؟ کہ چاہنے کے باوجود کسی کے قریب نہ جاسکی۔ اپنے آپ کو بار بار یقین دلانے کے باوجود وہ اپنے شعور کو قائل نہ کر سکی تھی کہ اسے عدیل سے وقتی محبت تھی یا شاید یکے بعد دیگرے تین شادیوں کی ناکامی سے دل برداشتہ ہوگئی تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو اب وہ محبت اور شادی، دونوں کو بکواس گردانتی تھی۔ کسی نئے جوڑے کو دیکھ کر اس قسم کی پیش گوئیاں کرنا اس کا مشغلہ تھا "دیکھنا چند ہی دن میں خمار اتر جائے گا"۔ "سب وقتی جذبے ہیں" وغیرہ۔ اس مثنیٰ رویے کے باعث لوگ اس سے چڑنے لگے تھے۔ مگر اس کی بلا سے۔ وہ اس ملک کی چوٹی کی اداکارہ تھی۔ بڑے بڑے فلمساز پروڈیوسر، اس کے گھر کے چکر لگاتے نہ تھکتے تھے۔ پبلک آج بھی اسی کی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ سال میں کئی بار علالت کے سبب قارن کے چکر، کینالوں پر پھیلی آراستہ کوٹھی، نئے نئے ماڈل کی کاریں۔ اسے اور کیا چاہئے تھا؟ اسے ہر وہ نعمت میسر تھی۔ جس کے لیے بیویاں دن رات، اپنے خاوند کو کوسنے دیتی ہیں۔ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔

کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے وہ کہیں کھو جاتی۔ سیٹ پر، میک اپ روم میں، گھر میں، دوستوں کے درمیان۔ اچانک اس کی نگاہیں کسی ان دیکھی چیز پر ٹک جاتی تھیں۔ اس لمحے اس کی خوبصورت آنکھیں بے تاثر ہو جاتی تھیں اور صرف انہی کمزور لمحوں میں اس کا چہرہ ایکٹنگ کا نقاب اُتار کر اپنے ہونے کا ثبوت دیتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ یہ لمحے کسی کی گرفت میں آئیں۔ وہ سنبھل جاتی "Excuse me"

اس کے وجود کا کوئی جواز نہیں ہے، بھوک سے مرنے کے لیے مادر وطن کی ضرورت نہیں ہوتی بھوک سے کہیں بھی مرا جاسکتا ہے۔

☆ ہمیں پاکستان کی ایک ایک اینٹ سے اس قدر عشق ہے کہ ہم نے پاکستان کی بنیادوں کی اینٹیں نکال کر اپنے گھر تعمیر کیے ہیں۔

☆ ماں کل بھی روتی تھی کہ میرا بیٹا روٹی نہیں کھاتا اور آج بھی روتی ہے کہ میرا بیٹا روٹی نہیں دیتا۔

"آزادی"

☆ اپنی سوچ دہا کر رکھنے سے بڑی غلامی اور کیا ہے؟ (یوسپڈیس)

☆ آزادی اظہار کے اس کے علاوہ کیا معنی ہیں کہ وہ کہنے کی آزادی ہو جو لوگ نہیں سننا چاہتے (جورج اورویل)

☆ اگر آزادی اظہار سلب ہو جائے تو پھر گلوں بہروں کے ہجوم کو ایسے ہی ہانکا جاسکتا ہے جیسے بھیڑوں کے ریوڑ کو ڈنچ خانے کی جانب (جارج واشنگٹن)

☆ مجھے کسی بھی آزادی سے پہلے آزادی ضمیر چاہیے (جارج ملٹن)

☆ جو بھی کسی قوم کو غلام بنانا چاہے اس کی ابتدا آزادی اظہار چھیننے سے کرنی چاہیے۔ (بئنمن فرینکلن)

☆ اگر ہم اپنی حکومت پر تنقید نہیں کر سکتے تو پھر یہ حکومت ہماری کیسے ہوگی؟ (مائیکل لمپٹ)

(وسعت اللہ خاں کا کالم بی بی سی ڈاٹ کام سے اقتباس)

.....
ہمارے حکمرانوں کا نظریہ یہ ہے کہ بھلے سارا شہر جل جائے مگر ہمارا گھر محفوظ رہے۔
.....
"تصدیق" 'تردید' تصدیق
کسی سیٹ کے رومانوی ماحول سے متاثر ہو کر وہ اور عدیل ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔

قریب چھٹی قالین پر گھٹنوں میں سر دیئے، مٹی سگری پڑی تھی۔ آواز دی، ہاتھ لگایا تو لڑھک کر ایک طرف ہو گئیں۔ ایک کہرام مچ گیا۔ ٹیلی فون 'تار' اخبار سب حرکت میں آگئے۔ اس اچانک موت کا سبب ہارٹ ایف تھا۔ کئی دن ہنگامہ رہا، بیانات جاری ہوئے۔ لوگوں کو مس کی جائیداد کی فکر تھی۔ کون وارث ہوگا، اتنی ڈھیر ساری جائیداد کا، اس سارے ہنگامے میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو موت کا سبب اور دولت کے مصروف سے واقف تھا۔ وہ تھا محسن، وہ ملازم جس نے سب سے پہلے مس کو مردہ حالت میں دیکھا تھا اور اسے ایک ایسے راز کی حفاظت مرتے دم تک کرنا تھی جو اس کے سوا کسی پر ہویا نہ ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ البم گھوم رہی تھی جو اس کے گھٹنوں میں دبی ہوئی تھی۔ جس میں ان کے ساتھ عدیل اور ایک بچہ بھی تھا اور پھر۔ اس بچے کی ڈھیروں تصویریں، قالین پر کچھ خلوط بکھرے پڑے تھے کچھ نئے اور کچھ پرانے۔ دل کے روٹھ جانے کا سبب شاید مٹی میں بندہ غلط تھا جو اس کے بیٹے نے لکھا تھا:

"ای! اب تو میں نے اُردو بھی سیکھ لی ہے، مجھے آپ اپنے پاس بلا لیں (I miss you)۔ کل پاکستانی لڑکے نے بڑی عجیب سی بات کہی۔ اس نے مجھے کہا کہ تم ایک (Bastard) لڑکے ہو۔ یہی تمہاری ماما تمہیں اپنے پاس نہیں رکھتیں۔ ای! کیا یہ سچ ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں خود کو شوٹ کر دوں گا، ورنہ مجھے اپنے اور ابو کے پاس بلا لیں کون ہیں میرے ابو؟"

آپ کا رضی
 ("سچے جھوٹ" شہاب گیلانی کی کتاب سے اقتباس)
"تاج محل"

علی گڑھ میں تین دن قیام کے بعد ہم نے اگلی منزل کا رخ کیا۔ پاکستان سے روانہ ہونے سے قبل علی گڑھ اور دہلی کے ساتھ آگرہ کا ویزہ بھی حاصل کر لیا تھا تاکہ دنیا کے سات عجائبات میں شامل تاج

دراصل میں کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہی" اور پھر ایک جان دار قہقہہ۔ وہ اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنے کا فن بہت اچھی طرح جانتی تھی وہ ایک پیدائشی اداکارہ تھی۔ وہ ایسے جرنلسٹوں سے، ایسے لوگوں سے دور بھاگتی تھی جو اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کریں۔ اپنے فن کی پیلیٹی کی خاطر اداکاری کی خاطر۔ وہ گھٹنوں اٹرو پودے سکتی تھی لیکن بات جہاں بھی معاملات پر پہنچی۔ بڑی خوبصورتی سے ٹال دی گئی "Exeuse me" دراصل یہ اس کا تکیہ کلام تھا "مجھے اس وقت ایک پارٹی میں جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے پھر سکی" اور اپنی مسکراہٹ کی آڑ لے کر وہ غائب ہو جاتی۔ کسی سر پھرے جرنلسٹ نے ایک دفعہ خبر لگائی کہ باخبر ذرائع کے مطابق میڈم رات کو بہت ڈسٹرب رہتی ہیں۔ اس خبر سے کسی قسم کا Reaction Show نہیں ہوا۔ "ان لوگوں کو کچھ تو چاہئے نا، اپنا اور اخبار کا پیٹ بھرنے کو" محض اس نے اتنا کہا اور ٹال گئی۔

پھر ایسی بات نہ لکھی گئی کہ کچھ ہوتا تو لکھتے نا! بستر سے اٹھنے سے لے کر رات بستر میں جانے تک، اس کی آہٹ لینے والے کئی لوگ تھے مگر کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہ دکھائی دی نہ سنائی دی حتیٰ کہ تھک ہار کر اخباروں رسالوں نے اپنی توجہ دوسرے لوگوں کی جانب کر لی۔ وقت بہت ظالم ہے، اپنے خونخوار بیٹوں سے اس کے چارم کو کھروچتا رہا۔ گھنے سیاہ بالوں پر پھپھوندی نے ڈیرے ڈالے۔ چہرے کی ملائم جلد پر مٹھی نے جالے بن دیئے۔ خمدار ہونٹوں پر لب اسٹک کی تہہ کے باوجود دراڑیں نمایاں ہوتی گئیں لیکن ڈھلتا شباب اور ڈھلتا سورج کب تک چھتے ہیں بھلا! سووی ہو اُمس دروانہ کے ساتھ، سچ کافی دیر تک بیڈنی طلب نہ کی گئی تو ملازم نے دروازہ بجایا۔ جواب نہ دار دہمت کر کے کھولا تو مس دروانہ بستر کے

محل دو دیگر عمارات دیکھ سکیں۔
ہندوستان میں قیام کے چوتھے روز علی الصبح چھ بجے علی گڑھ سے آگرہ کے لیے بذریعہ کار روانہ ہوئے۔ ہماری گاڑی شہر سے باہر سڑک پر رواں دواں تھی۔ راستے بھر رکھتے، گندم کی فصل کھڑی تھی اور بجلی سے چلتے ٹیوب ویل نظر آرہے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف گھنے درخت اور سورج کی اولین کرنیں عجب دلربا منظر تھا۔ ہندوستانی عوام کی طرز زندگی کا مشاہدہ کرتے سوا آٹھ بجے آگرہ شہر میں داخل ہو گئے۔

جہانگیر کے بعد شاہجہاں بادشاہ بنا تو اس نے ہی تاج محل بنوایا۔ آگرہ کی تاریخی حیثیت اپنی جگہ مگر تاج محل نے اس کی شہرت کو دوام بخشا ہے اور آج تاج محل کے باعث آگرہ معروف عالم ہے۔ ہم آگرہ شہر سے گزرتے ہوئے۔ تاج محل کی طرف جارہے تھے کہ ہماری گاڑی ایک چوک میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے ایک بڑی قلعہ نما فصیل نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ تاج محل کو آلودگی سے بچانے کے لیے کسی گاڑی کو تاج محل تک نہیں جانے دیا جاتا۔ گاڑیاں یہیں رُک جاتی ہیں۔ یہاں سے آگرہ ڈوپنٹ اتھارٹی (اے ڈی اے) کی بیٹری سے چلنے والی بس کے ذریعے صدر دروازے تک گئے۔ ان بسوں میں 96KV کی الیکٹرک بیٹری نصب ہے اور کرایہ صرف دو روپے ہے۔ ہم نے قلعہ نما گیٹ کے کونے میں قائم فلٹ بوتھ سے جس کے باہر نمایاں انداز میں تحریر ہے..... بھارتی شہری ہیں روپے غیر ملکی 750 روپے، فلٹ خریدے اور سرخ پتھر کی مٹی سے بنے مین گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ اس عظیم الشان گیٹ پر کالے سنگ مرمر سے آیات کریمہ کندہ ہیں۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے رات دس بجے تک تاج محل کھلا رہتا ہے۔ مین گیٹ کے ساتھ سائیڈ گیٹ پر ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ جہاں چند منٹوں کے بعد ہماری باری آنے

پر تلاشی لی گئی اور ہاتھ کے اشارے سے آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ سکیورٹی اتنی سخت تھی کہ آپ خمر یا کھانے کی کوئی چیز اندر نہیں لے جاسکتے۔ مرکزی گیٹ جو سرخ پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ لاقعدا سیاح تو مرکزی دروازہ دیکھ کر ہی حیرت زدہ کھڑے تھے۔ اندر داخل ہوئے تو نظروں کے سامنے تاج محل تھا۔ اس عظیم دلکش اور پر شکوہ عمارت کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس کی منظر کشی کے لیے الفاظ کا انتخاب مشکل ہے۔ یقین نہیں آ رہا تھا جس کا ذکر ہم بچپن سے سن اور پڑھ رہے تھے وہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ بے اختیار پروفیسر رشید احمد صدیقی کا تاریخی جملہ ذہن میں آ گیا کہ مغل بادشاہوں نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں۔ اُردو زبان، مرزا غالب اور تاج محل۔ 142 ایکڑ رقبے پر محیط دریائے جمنا کے مغربی کنارے واقع تاج محل سفید سنگ مرمر سے تعمیر شدہ بے حد خوب صورت، دلربا اور فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ اسم بائسکی ہے۔ اگر اسے دنیا کی خوبصورت ترین عمارت قرار دیا جائے تو قطعی بے جا نہ ہوگا۔ اس کی تعمیر میں جو پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ دن ہو یا رات چاندنی رات ہو یا اندھیری، سورج کی روشنی ہو یا بادلوں کی اوٹ یہ عمارت ہر حال میں اپنا حسن قائم رکھتی ہے۔

میں نے تاج محل کے بارے میں ساحر لدھیانوی کے اشعار تاج محل کو گواہ بنا کر آہستہ سے پڑھ دیئے:-

یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ نقشِ درودیوار، یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
شاہجہاں اور ساحر دونوں عشق پیشہ تھے لیکن ساحر
غریب بندہ تھا۔ ایسی صحت حال میں کربھی کیا سکتا تھا۔

طرح ایک قدم بائیں طرف اٹھائیں تو دایاں مینار نظر آتا ہے۔ اُلٹے پاؤں چلیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تاج محل آپ کے پیچھے آرہا ہے۔ یہ سب فن تعمیر کا کمال ہے۔ یہ صدیوں پرانی عمارت ہے لیکن زمانے کے سرد و گرم جھیلنے اور ٹوٹ پھوٹ کے باوجود یوں لگتا ہے کہ ابھی ابھی تعمیر ہوئی ہے۔ تاج محل صرف ایک مقبرہ کا نام نہیں۔ یہ صرف تین گنبدوں اور چار میناروں کا مجموعہ نہیں بلکہ کئی عمارت کا مجموعہ ہے۔ اس میں صدر دروازے شاندار باغ، مسجد اور فصیلیں شامل ہیں۔ شاہجہاں اور ان کی محبوب اہلیہ ممتاز محل کی اصل قبریں مقبرے کے تہہ خانے میں ہیں۔ البتہ فرش پر قبروں کے تعویذ موجود ہیں۔

(”امن کی آشا“ حکیم راحت نسیم سوہدروی کا کالم جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

”کلام بہادر شاہ ظفر“

لگتا نہیں ہے جی میرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم نا پائیدار میں
بلبل کو پاسباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید تھی لکھی فصل بہار میں
کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بیس
اتنی جگہ کہاں ہے دل داغ دار میں
اک شاخ گل پہ بیٹھ کے بلبل ہے شادماں
کانٹے بچھا دیئے ہیں دل لالہ زار میں
عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہوگئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے گنج حزار میں
کتنا بد نصیب ہے ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ مل سکی کوئے یار میں

(دیوان بہادر شاہ ظفر سے انتخاب)

”سوال“

میرا سوال بہت سادہ ہے کہ بی بی کے جان

تاج محل کی تعمیر مغلوں کے محروف بادشاہ شاہجہاں نے کرائی۔ وہ اپنی دوسری اہلیہ ارجمند بانو جسے وہ ممتاز محل کا نام دیتا تھا کو بہت چاہتا تھا۔ ان کی شادی 1612ء میں ہوئی اور ان کے ہاں چودہ بچوں کی ولادت ہوئی۔ ممتاز محل شاہجہاں کے ساتھ رہتی تھی۔ 1631ء میں برہان پور کے مقام پر اپنے آخری بچے کی پیدائش پر وہ زچگی کے دوران انتقال کر گئیں۔ شاہجہاں کے لیے یہ صدمہ بڑا تھا۔ روایت ہے کہ ممتاز نے اپنے انتقال سے قبل بادشاہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی یاد میں شاندار مقبرہ بنوائے گا۔ دوسری شادی نہیں کرے گا اور بچوں پر مہربان رہے گا۔ شاہجہاں نے ممتاز محل کی وفات کے بعد وعدہ ایفا کرتے ہوئے فوری طور پر تاج محل کی تعمیر کا حکم دیا۔ شاہجہاں کا خلوص جب ان سنگ و خشت میں ڈھلا تو دنیا کی خوبصورت ترین عمارت معرض وجود میں آگئی جو برصغیر میں مسلم ثقافت کی پہچان ہے۔ جسے دیکھنا ہر آنکھ کی حسرت بن چکا ہے۔ یہاں شاہجہاں اور ان کی اہلیہ کا مقبرہ پہلو پہ پہلو ہیں۔ یہ عمارت ساڑھے تین سو سال قبل سترہویں صدی کے وسط میں تعمیر کی گئی۔ اس فن تعمیر کی شاہکار عمارت کی تکمیل پر تقریباً بائیس سال کا عرصہ صرف ہوا تھا۔ تاج محل کا داخلی دروازہ بے حد خوبصورت ہے۔ یہاں سے دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ عمارت بہت دُور اور چھوٹی ہے۔ بچوں بچوں قریب جائیں تو اس کا گنبد بڑا ہوتا جاتا ہے۔

مین گیٹ اور تاج محل کے درمیان پانی کی گزر گاہیں اور فوارے نصب ہیں۔ اس پانی میں تاج محل کا عکس نہایت خوبصورت اور دلربا منظر پیش کرتا ہے۔ تاج محل کے صحن میں داخل ہونے والے پہلے دروازے کی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر تاج محل پر نظر ڈالیں تو کوئی مینار نظر نہیں آتا لیکن اگر ایک قدم اور دائیں طرف اٹھائیں تو بائیں مینار نظر آتا ہے۔ اسی

تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ موقع لگا تو کسی نیک دل واقف حال امریکی سے پوچھ لیں گے۔

ہم نے کل یہاں ایک خاتون کو دیکھا، فرسٹ کلاس گاڑی سے نکلیں لباس عمدہ تھا خود بھی خوب صورت اور سفید فام مگر ایک پاؤں میں اونچی ایر می کی جوتی اور دوسرے میں ایک جاگر پہنا ہوا تھا۔ ہم حیران ہو کر وہیں ٹھہر گئے ہم نے سوچا شاید پاؤں میں نقص ہو مگر وہ سگریٹ خرید کر نکلیں پاؤں ٹھیک ٹھاک تھے۔ نشہ میں بھی وہ نہ تھیں۔ ایک اور نیک بخت کو دیکھا کہ بنوں والے ٹھیک ٹھاک سوئٹر کو اُلٹا پہنا ہوا تھا۔ یعنی بنوں والا حصہ پیچھے تھا۔ پتہ نہیں پیچھے بنوں کس نے لگائے تھے۔ ایک اور خاتون کو ایک عجیب حرکت کرتے دیکھا۔ سخت بارش تھی ہم بس شاپ پر کھڑے تھے۔ بس آئی ایک نوجوان خاتون اُتریں دیکھا کہ بارش ہے انہوں نے آد دیکھا نہ تاؤ اپنا گرم بلاؤز اٹھا کر سر پر ڈالا اور بھاگ کر سڑک کراس کر گئیں۔ سر تو بارش سے بچ گیا بلا سے باقی کچھ چھپایا نہیں چھپا۔

دنیا کا سب سے طویل پل

ہماری نگاہ میں شہر کی سب سے بڑی خصوصیت یہاں کا مشہور عالم پل ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ دنیا کے اس عجوبہ روزگار پل کا شہرہ امریکہ اور دنیا بھر میں کہیں نہیں ہے۔ سمندر کے اوپر کنکریٹ کا پل ڈالنا ہماری نگاہ میں معجزہ ہے۔ ایک بھی نہیں دو پل ساتھ ساتھ چلتے ہیں ایک آنے کے لیے دوسرا جانے کے لیے۔ ہر چند میل پر دونوں پلوں کو ملانے والے کشادہ حصے ہیں۔ 16 میل کے فاصلے پر پلوں کو اٹھا کر جہازوں کو راستہ دینے کا سسٹم ہے۔ ہر آدھے میل پر ٹیلی فون بوتھ نصب ہیں۔ دونوں پلوں پر پچاس پچاس منٹ کے بکس ہزار سے زیادہ (Span) ہیں۔ ہر سپان کے نیچے چھ ستون ہیں گویا تین لاکھ ستون، سب پل اور ستون سینٹ کے بنے ہیں۔ کیسے بنے ہیں اور سمندر میں کس طرح

دیئے زرداری کے جیل کاٹنے اور نواز شریف کی بے وطنی نے اس ملک اور اس کی عوام کو کیا دیا؟ یہ سب قربانیاں نہیں، پاور پلے تھا اور تخت سے لے کر تختہ دار تک یہ سب کچھ اس ہیکسج کا حصہ ہوتا ہے۔ دارالعلوم 'شجاع' مراد جمہوریت نہیں بادشاہت کے لیے مارے گئے تھے۔

عوام کے حصے میں بھوک، افلاس، بے روزگاری، بد امنی کے علاوہ نہ کچھ تھا نہ ہے اور نہ ہی ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ سوائے ان قرضوں کے جو بتدریج بڑھتے جا رہے ہیں۔ عوام کو نہ کسی کی جان چاہیے، نہ جلا وطنی انہیں صرف اتنا 'علم' علاج اور ٹھوڑی سی عزت کی ضرورت ہے۔ جسے سابقہ 66 سالوں میں کوئی پورا نہیں کر سکا۔

"دیکھ کبیر رویا" ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی کتاب (سفرنامہ) سے اقتباس

طرفہ فیشن

یہاں لوگوں کو لباس کے بارے میں عجیب لا پرواہی برتتے یا اس کا تماشا بناتے دیکھا۔ یہاں خاص کپڑا جین ہے۔ جین کے ٹکر، سکرٹ، کوئی کوٹ، قمیص، پتلون، جیکٹ عام پہناوا ہے۔ تلی جین پر سب فدا ہیں۔ چلو جین پہننے میں تو کوئی عیب نہیں۔ گھر در 'موٹا' نہ پہننے والا دیر پا کپڑا ہے مگر جب تماشا اس وقت دیکھنے میں آتا ہے جب پتلون کی جین کو چاقو، قینچیوں بلکہ دانتوں سے کاٹ کر بد نما کیا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں (امریکہ) اچھے خاصے شریف خاتمن کے خواتین و حضرات کی پتلون کو قینچی سے ٹکٹوں تک کٹا ہوا پایا۔ کاٹا اس طرح جاتا ہے کہ دھاگے اور ریٹھ لٹکتے نظر آئیں۔ بعض زیادہ من چلوں/چلیوں نے پتلون کو کٹی جگہ سے پھاڑا ہوتا ہے۔ مزے کی بات ہے کہ اوپر والے کپڑے ٹھیک ہوتے ہیں مگر صرف پتلون اور وہ بھی جین کی پتلون کے ساتھ یہ ناگفتہ بہ سلوک کیا جاتا ہے۔ وجہ آج

زبان کون سی ہے۔ اس سوال کا آج قطعی جواب دینا آسان نہ ہوگا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قدیم ترین زبانوں کی حالت تہذیبیں اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ جہاں تک لسانیات، آثار قدیمہ اور علم الانسان کے ماہرین کی تحقیقات کا تعلق ہے تو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں دو نام نمایاں تر نظر آتے ہیں۔ ان میں سے پہلی ”سامی“ (یا آرامی) کہلاتی ہے جبکہ دوسری کا نام ”میری“ (یا کاری) ہے۔ اول الذکر حضرت نوح کے عہد کی زبان تھی مگر ”عہد نامہ حقیق“ کے بموجب بائبل میں مینار تعمیر کرنے کی پاداش میں ان کی زبانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا گیا اور وہ سب جدا ہو کر مختلف علاقوں میں الگ بستیاں بنا کر رہنے لگے تو ان کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو گئیں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ان کے الفاظ اور تلفظ میں اتنا فرق پیدا ہو گیا کہ اصل سے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔

نصب کیے گئے ہیں۔ خدا جانتا ہے۔ ہماری عقل تو جواب دے گی ہے۔ ہل سائنسی ترقی کے موجودہ دور سے 35 سال قبل 1956ء میں صرف 51 ملین ڈالر کے خرچے سے چودہ ماہ کے عرصے میں بنایا گیا۔ یہ اس دور کی نشانی ہے جب ریاست لوساٹا کیل کی دولت سے مالامال ایک مالدار ریاست تھی۔ لوساٹا کا صدر مقام (Baton Rouge) ہنو اور لین سے سومیل کے قافلے پر ہے۔ اس علاقے میں پیٹروکیمیکل انڈسٹری کا راج ہے۔ اس علاقے کو گنے کی پیداوار اور پیٹروکیمیکل کی بہتات کی وجہ سے امریکی پیٹروکیمیکل گولڈ کوسٹ اور امریکی مٹنی کا پیالہ (Sugar Bowl) بھی کہا جاتا ہے۔ ہم نے جب یہ مل دیکھا تو حیرت و استعجاب سے ہماری آنکھیں کھل کی کھل رہ گئیں۔ ہم اسے دنیا کے ساتویں نمبر سے کم نہیں سمجھتے۔

”قدیم ترین زبان“

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی قدیم ترین

”دہشت گردوں کے حملے“

پاکستان کے حساس اداروں پر دہشت گردوں کے حملوں کی تفصیل:-

تاریخ	جی ایچ کیو	مہران ہیس	کامرہ ایئر بیس	پشاور ایئر پورٹ	کراچی ایئر پورٹ
10 اکتوبر 2009ء	27 مئی 2011ء	16 اگست 2012ء	15 ستمبر 2012ء	8 جون 2014ء	
وقت	صبح 11 بجے	شام 10 بجے	رات 2 بجے	شام 10 بجے	شام 10 بجے
حملہ آور	6	6 جبکہ دو فرار	9	10	10
لباس	فوجی وردیاں	عام	پاک فضائیہ کی وردیوں میں	عام	اے ایس ایف کی وردی
شہادت	پاکستانی	غیر ملکی	4 پاکستانی	6 غیر ملکی اور 4 پاکستانی	غیر ملکی مکانہ
آہریشن کی مدت	22 گھنٹے	16 گھنٹے	4 گھنٹے	4 گھنٹے	5 گھنٹے
ذمہ داری	تحریک طالبان پاکستان	تحریک طالبان پاکستان	تحریک طالبان پاکستان	تحریک طالبان پاکستان	تحریک طالبان پاکستان

کی مثال دی جاسکتی ہے۔ جہاں خط سمجھی میں لکھی ہوئی چلماش کی داستان دنیا کی قدیم ترین داستانوں میں ممتاز مقام کی حامل ہے۔ یہ صرف ایک ہی مثال ہے۔ اگر قدیم تہذیبوں اور زبانوں کی شاعری اور نثر کے نمونے آج دستیاب ہو سکتے تو ان کے مطالعے سے ان کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ان کی زبان اور اس کے ذخیرہ الفاظ کے بارے میں بھی کارآمد معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ (”اردو زبان کیا ہے؟“ ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب سے اقتباس)۔

”غیرت ایسی بے غیرت“

ہم دہشت گردوں سے لے کر ملک لوٹنے والے سیاسی و دیگر مہم جوؤں کو سزائیں نہیں دے سکتے ہم ان مگر مچھوں کو تو نشان عبرت بنانے کے قابل نہیں لیکن کیا ہم غیرت کے نام پر سرعام بے غیرتی کا ارتکاب کرنے والوں کو بھی لگام نہیں دے سکتے؟ کیا ان کے سامنے بھی ہمارے اپنی ہاتھوں کو فاجعہ ہو جاتا ہے؟

یہ کیسے غیرت مند ہیں جن کی بے غیرتی میں لٹی غیرت کسی ڈھنگ کے معاملے میں بھی بیدار نہیں ہوتی۔ ارد گرد قلم زیادتی، جبر و استحصال کے ہالیہ کھڑے ہیں لیکن غیرت سوتی رہتی ہے، کسی دکان پر تول پورا نہیں۔ غیرت خرائے لیتی رہتی ہے۔ گلیوں بازاروں میں کسی عورت کا تنہا لکنا ممکن نہیں۔ غیرت خواب دیکھ رہی ہوتی ہے۔ ساتھ گیس، بجلی چوری ہو رہی ہوتی ہے، سب جانتے ہیں چونکہ چور نکلنا ہوتا ہے اس لیے غیرت خواب خرگوش کے مزے لینے کو ترجیح دیتی ہے۔ محلے علاقے میں فلاحیت کے ڈھیر لگے ہیں، گٹر نے ابل ابل کر ڈور ڈور تک سوئمنگ پول بنایا ہوتا ہے لیکن غیرت اس گندے جوہڑ کے کنارے محو خواب رہتی ہے۔ سب کو خبر ہوتی ہے کہ فلاں کے بچھواڑے میں جعلی کپھول بھرے جارہے ہیں۔ دو نمبر کچھ اپ بن رہی

حضرت لوح کے بیٹے کا نام سام تھا جن کے نام پر ان کی زبان ”سامی“ کہلائی۔ سام کے بیٹے آرام، عیلام اور آشور تھے۔ ان سب کے ناموں پر بھی زبانیں بنیں۔ آرام کی نسل حجاز سے لے کر کریمین تک کے علاقے میں آباد تھی، ان کی زبان ”آرامی“ کہلاتی تھی۔ یہ چار ہزار ق۔ م کی بات ہے، آشور کی اولاد شام (جس کا قدیم نام سوریا تھا) میں آباد تھے۔ ان کی زبان ”سریانی“ تھی جبکہ عابر کے نام پر عبری یعنی عبرانی زبان بنی۔ قدیم بائبل میں ”سری“ اور ”لکاری“ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ یہ زبانیں تاریخی تغیرات کے باوجود ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتی رہیں اور تقریباً 2 ہزار برس ق۔ م تک یہ کسی نہ کسی صورت میں بولی جاتی تھیں۔ اب یہ سب ختم ہو چکی ہے۔ البتہ توریت کی صورت میں سریانی محفوظ رہ گئی یا پھر ہمارے زمانے میں اسرائیل نے اپنی مردہ زبان عبرانی کو زندہ کر کے دفتر اور تعلیم و تدریس کی زبان بنادیا۔

حضرت لوح کے بیٹے بنیوں سے نسل انسانی پھیلی۔ چنانچہ دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلی انسانی آبادی کو اب ان ہی ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ بیٹے سام، حام اور یافث تھے۔ سام کی نسل سے آریں اور بیشتر یورپین اقوام کا تعلق ہے۔ حام کی نسل افریقہ کے سیاہ فام باشندوں پر مشتمل ہے یعنی حبشی اور قدیم ہندوستان کے دراوڑی۔ جبکہ یافث سے منگول اور زرد فام نسلوں کا تعلق ہے۔ یوں دیکھیں تو سفید (سام)، سیاہ (حام) اور زرد (یافث) نسلوں سے ہی زبانوں کے بڑے گروہوں نے بھی جنم لیا۔

قدیم ترین یا مردہ زبانوں کا سراغ لگانے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ وہ تہذیبیں ہی باقی نہ رہیں۔ جن سے ان زبانوں کا تعلق تھا۔ واضح رہے کہ وہ تہذیبیں اپنے زمانے کے لحاظ سے خاصی ترقی یافتہ ہوں گی۔ اس ضمن میں قدیم عراق کی تہذیب

مگر مچھ اور کچھویے کی

حیران کن دوستی

دوستی پر فخر سے متعلق بول تو ہر کسی کی زبان پر کبھی تا کبھی ضرور آئے ہوں گے۔ اور اس کی مثالیں حقیقی زندگی میں بھی اکثر و بیشتر انسانوں کے حوالے سے سامنے آتی رہتی ہیں۔ لیکن یہاں پر کسی انسانی جوڑی کی بات نہیں کی جارہی بلکہ یہ ایک کچھویے اور مگر مچھ کی دوستی کی کہانی ہے جو ایک دوسرے سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ ناصرف اکثر و بیشتر ساتھ نظر آتے ہیں بلکہ کبھی کبھار تو کچھویے میاں بڑے مزے سے مگر مچھ کے مضبوط خول پر بیٹھ کر دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر جانے کیلئے سواری کے مزے لیتے نظر آتے ہیں۔ انسان ہو یا جانور ہمیشہ اپنے سے کئی گنا تیز چلنے والی سواری پر بیٹھنا پسند کرتا ہے۔ لیکن کچھویے اور مگر مچھ کی اس دوستی میں اور ہی نظارہ ہے جہاں سست رفتار کچھویے نے اپنے سے کئی گنا سست رفتار مگر مچھ کو سواری کیلئے منتخب کیا ہے۔ (مرسلہ: ارم خان، فیصل آباد)

یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے۔

سوال: ترقی یافتہ ممالک میں تحقیق کا معیار کیا ہے؟
جواب: ہمارے اور ان کے تحقیقی کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں تحقیق کرنے والے طلبہ کو حکومت جو سہولتیں دیتی ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے ہاں لائبریریوں کی کوئی سیکورٹی نہیں ہے۔ صرف ایک کارڈ پر پانچ کتابیں ایٹھ کر سکتے ہیں جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں صرف پاکستانی 70 روپے ایک سمسٹر کی رجسٹریشن کراتے ہیں۔ دو ہزار آٹھ سو ڈالر ریاست دیتی ہے۔ فرانسپورٹ مفت ہوتی ہے۔ میڈیکل طالب علموں کا فری ہوتا ہے۔ گیمز کھلائی جاتی ہیں،

ہے۔ جعلی دودھ تیار ہو رہا ہے لیکن غیرت اسکا بے غیرت ہے کہ جاننے کا نام نہیں لیتی۔ پورا محلہ جانتا ہے کہ تھانے دار جسے چھتر مار مار کر اٹھالے گیا وہ بے قصور ہے لیکن غیرت کروٹ بدلنے کے بعد دوسری طرف منہ کر کے سوئی رہتی ہے۔

سب کچھ گل سڑ چکا ہے، پوری طرح ادھڑ چکا ہے۔ اگر عدالت کے احاطے میں ایک عورت سرعام سنگسار کی جاسکتی ہے تو کون سی ریاست؟ کیسی رٹ؟ کہاں کی بلٹ ٹرینیں اور کون سی میٹرو؟
(”چھوہلا“ حسن قادر کے کالم جگ ڈاٹ کام سے)

”انٹرویو“

قاسم خاں پیٹھے کے لحاظ سے ماہر نفسیات ہیں۔ 70 کی دہائی سے سلسلہ تعلیم جرمی گئے۔ ان کا ایک سفر نامہ ”تہذیب کا سفر“ یورپ کا تہذیبی، لسانی، ثقافتی اور سیاسی منظر نامہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ جس میں انہوں نے قوموں کی تہذیب، ثقافت، تاریخ رہن سہن کے حوالے سے اپنے تجربات، مشاہدات کو منفرد انداز میں متعارف کرایا ہے۔ قاسم خاں جرمی کے علاوہ سرزمین روم، سینا، یونان، فرانس، آسٹریا، ترکی، پولینڈ، بلغاریہ سمیت بہت سے خطوں کا بارہا سفر کر چکے ہیں۔ ان سے کئی گفتگو قارئین کی نذر ہے۔

سوال: تحقیق پر آپ نے گراں قدر کام کیا ہے۔ پاکستان میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے، اس سے آپ مطمئن ہیں؟

جواب: ہمارے ہاں تحقیق کا معیار یہ ہے کہ جس موضوع پر طالب علم تحقیق کر رہا ہے اسے بازار یا مارکیٹ کا پتہ بتا کر وہاں بھیجا جاتا ہے۔ وہ متعلقہ موضوع پر کسی کے پہلے سے ہوئے تحقیقی مقالے کے شروع اور آخر کے صفحات پھاڑ کر کچھ مواد خود لکھ کر اپنے نام سے تحقیقی مقالہ شائع کرا لیتا ہے۔ پی ایچ ڈی کے بیشتر مقالے چوری شدہ ہوتے ہیں۔ مضامینی

دنیا میں اردو کے پانچ جیڑز ہیں تو میرا دعویٰ ہے کہ
دس سال میں 50 سے زائد جیڑز ہوں گے۔

نئی نسل میں سیکنے کی صلاحیت نہیں، ہر نوجوان
شاعر خود کو احمد فراز سمجھتا ہے۔

(حکایتہ بلوچ کا کالم جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

"تشکک کی آلودگی"

لڑکپن کا زمانہ بھی عجیب زمانہ ہوتا ہے۔ نظر کا
دائرہ تنگ ہونے کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی چیزیں
اصل سے بہت بڑی نظر آتی ہیں اور دماغ چونکہ بے
یقینی اور تشکک کی آلودگی سے پاک ہوتا ہے، اس
لیے ہر بات پر بہت جلد یقین آ جاتا ہے۔

مجھے اپنے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا،
جس میں کوتاہ نظری اور "یقین" کا کرشمہ ملاحظہ ہو۔

آج سے کوئی پچاس برس پہلے کا ذکر ہے راقم پٹالہ
میں تعلیم پاتا تھا۔ ایک دن ملا کے کتب خانے کی قسمی
کتابیں نکال نکال کر دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً تنہو دیا کی
کتاب پر نظر پڑی۔ اسے کھول کر دیکھا تو ایک نئی دنیا
نظر آئی۔ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اور اس میں
کیما، سیما، ہیمیا، ویسیا کے بے شمار قصے، لوگوں کی
نظروں سے غائب ہو جانے کی ترکیبیں، پوشیدہ دفعوں
کا پیچ چلانے کا ڈھنگ، غرض بے شمار پراسرار باتیں
درج تھیں۔ لڑکپن کا زمانہ تھا اس کتاب نے راقم کے
خیال کا اس طرح احاطہ کیا، دن رات اس کتاب کے سوا
اور کسی چیز کا ہوش نہ تھا اور بزمِ خویش یہ سمجھ لیا گیا کہ اب
کیا ہے؟ دنیا بھر کے خزانوں کی گنجی ہاتھ آگئی ہے۔
جب چاہیں گے سونا بنالیں گے اور جب جی میں آئے گا
گڑھے دے خزانے نکال لیں گے۔

اس گوہر بے بہا کی یافت کی حدت اتنی زیادہ
تھی کہ دل میں سانس نہ سکی۔ راقم نے اپنے ایک ہم
جماعت بشیر کو اپنا راز دان بنایا اور بڑے تامل
اور اہتمام کے بعد وہ کتاب اسے دکھائی۔ دوست
بھی اس کتاب کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ ہم دیر تک

سوئچنگ کرائی جاتی ہے۔ ذہن کو تروتازہ رکھنے کے
لیے طلبہ کو تمام سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ کھانا فری
ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں آیا کپڑے دھو کر استری
کر کے کمرے میں پہنچا دیتی ہے۔ جیب سے کچھ بھی
ادا نہیں کرنا پڑتا۔ تحقیق کے دوران جرمی میں طلبہ کو
ایسی سہولیات مہیا کی جاتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم
کسی قادیانہ شاربوتل میں قیام کر رہے ہیں۔

سوال: کیا ہمارے ہاں سینٹر ادیب جوئیر کی
رہنمائی کا حق ادا کر رہے ہیں؟

جواب: ہمارے ہاں سینٹر جوئیر کی تربیت
کرنے سے عاری ہیں ہر بڑا ادیب اس دم میں مبتلا
ہے کہ میں بڑا ہوں۔

سوال: آپ کو کتنی زبانوں پر عبور ہے اور ادب و
ثقافت کے لیے کون سی زبان پسند کرتے ہیں؟

جواب: پاکستانی زبانوں میں اردو، پشتو، ہندکو پنجابی
سرائیکی زبانوں پر عبور ہے۔ بین الاقوامی زبانوں میں
انگلش، اطالوی، جرمن، قدیم یونانی، لاطینی، ہسپانوی زبان
میں کام کر چکا ہوں۔ تمام زبانوں میں لاطینی زبان پسند
ہے اسے تمام زبانوں کی ماں کہتا ہوں۔

سوال: دنیا کی کون سی زبان اردو کے
قریب ترین لگتی ہے؟

جواب: میرے خیال میں اردو نے لاطینی زبان
سے استفادہ کیا ہے۔ اردو میں بہت سے الفاظ
لاطینی سے لیے گئے ہیں۔ اس موضوع پر مکمل کتاب
بھی لکھنے کا ارادہ ہے۔ ہم احساس کمتری کا شکار لوگ
ہیں۔ آج بھی طلبہ کو پڑھاتے ہیں کہ اردو لشکری
زبان ہے۔ اردو میں ترکی کے الفاظ شامل ہیں۔ بھئی
ترکی زبان کو مرے ہوئے بھی سو سال ہو گئے۔ جب
پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو ترکی کی زبان ختم ہو گئی
تھی۔ اس وقت جو ترکی زبان چل رہی ہے وہ لاطینی
والی ترکش زبان ہے۔ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو
ہمیں اردو کو لاطینی زبان میں ضم کرنا ہوگا۔ اگر آج

دہانے میں سے صرف تھوڑا سا آسمان دکھائی دیا۔ بدلو کا یہ عالم تھا کہ دماغ پھٹا جاتا تھا اور تلوؤں اور پتروں کے ٹکڑے ہڈیاں اور دوسری الابلا چیزیں چبھ رہی تھیں۔ اندھیرے میں دم گھٹ رہا تھا اور موت سامنے دکھائی دے رہی تھی۔

دلہٹا خیال آیا کہ پارس پتھر تو گیا بھاڑ میں، یہاں سے جان لے کر لٹکا کیونکر ہوگا، بشر کو آواز دی۔ ارے میاں میں مر چلا، مجھے باہر نکالنے کی تدبیر کرو لیکن بشر صاحب ابھی تک کیسیا اور سونے ہی کے خیال میں متفرق تھے۔ ایک دم بول اٹھے شاہاش پالا مار لیا۔ اب ذرا ہاتھ مار کر دیکھو تو، کہیں پارس پتھر بھی ہے یا نہیں۔ راقم نے جھنجھلا کر کہا ”کم بخت میری جان کل رہی ہے اور تجھے پتھر پارس کی پڑی ہے۔ اگر میری زندگی چاہتا ہے تو خدا کے لیے اس ”زندان سیاہ چاہ“ سے کسی طرح مجھے نکال۔ اب تو بشر کو بھی فکر ہوئی کہ آخر گھونسلے سے باہر نکلنے کی کیا تدبیر کی جائے۔ بڑے غور و فکر کے بعد قرار پایا کہ بشر درخت پر چڑھ کر اپنی پگڑی کا ایک سرا درخت کے بڑے ٹہنے سے باندھ دے اور دوسرا تنے کے اندر لٹکا دے تاکہ راقم اس کے سہارے سے باہر آ سکے چنانچہ یہی کیا گیا اور کوئی ایک گھنٹے بعد راقم اس تنگ نائے سے باہر نکلا لیکن گرنے اور نکلنے کے دوران میں چہرے، بازوؤں اور ٹانگوں پر اس قدر خراشیں آئیں کہ سارا جسم لہو لہان ہو گیا اور کپڑے پھٹ گئے۔ ہم دوست اپنی حماقت پر افسوس کرتے ہوئے گھر کو روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ دن اور یہ دن ہم نے کبھی پارس کا خیال بھی نہ کیا اور نہ وہ کتاب کہیں نظر آئی ہے اور نہ اس ”تنزدیہ“ پر اعتبار ہی باقی رہ گیا ہے۔

(مولانا عبدالحجید سالک کا لڑکپن ”آتشِ دیرپا“ آغا شیدا کا شمیری کی کتاب سے اقتباس)

اکٹھے بیٹھ کر اس کتاب کو پڑھتے رہے اور آخر یہ قرار پایا کہ اس کے کسی نسخے کو آزمانا بھی چاہیے۔ اس کتاب میں ایک مقام پر درج تھا کہ اتوار کے دن جب ”کچھ پختہ“ ہوا کر کوئی شخص شہر کے باہر جا کر چل یا آلو کے گھونسلے کی تلاش لے تو کچھ عجب نہیں کہ اسے پارس پتھر مل جائے جس کے چھونے سے ہر چیز سونا بن جایا کرتی ہے۔ یہ کام نسبتاً بہت آسان معلوم ہوا کہ آئندہ اتوار ہی کو پک پختہ آرہا ہے۔

انتظار کے دو چار دن بے انتہا مشکل سے گئے۔ آخر خدا خدا کر کے اتوار آیا اور ہم دونوں شہر کے باہر نکل گئے۔ بشر نے بتایا کہ فلاں درخت پر آلو کا گھونسلہ ہے وہاں چل کر پارس پتھر ڈھونڈیں گے چنانچہ ہم اس درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ قرار پایا کہ راقم اس درخت پر چڑھ کر آلو کے گھونسلے کی تلاش لے۔ چنانچہ راقم اس درخت پر چڑھ گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ آلو کا گھونسلہ اسی درخت کے تنے میں ہے جو اعد سے کھوکھلا ہے۔ تنہا میں سے کوئی نو دس بٹ اونچا تھا۔ جس میں سے دو تین بڑے بڑے ٹہنے نکل کر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ جس مقام سے وہ ٹہنے نکل کر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے وہاں گھونسلے کا دہانہ تھا اور اس کے اعد بالکل اندھیرا معلوم ہوتا تھا۔

بشر نے کہا بس یہی گھونسلہ ہے اس میں بے تکلف اتر جاؤ۔ راقم نے اس دہانے کے کناروں پر دونوں ہاتھ جما کے ٹانگیں تنے کے اندر لٹکا دیں لیکن پاؤں کو گھونسلے کی ”قہا“ نہ ملی۔ بشر نے پھر کہا ”ہاتھ چھوڑ کر کود پڑو نا! بہت زیادہ گہرا نہیں ہے۔“

چنانچہ میں نے ہاتھ چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا پر چھوڑا اور ہضام سے کود پڑا۔ ایک دم ایسا معلوم ہوا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور کوئی شخص گلا گھونٹ رہا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ اس درخت کا تنہا اوپر سے نیچے تک کھوکھلا تھا اور راقم اب تنے کے اندر زمین کی سطح کے برابر کھڑا تھا۔ اوپر نگاہ اٹھائی تو گھونسلے کے

رم جھم برسات اور اس کی بیماریاں

صغیرہ بانو شیریں

چھوٹی چھوٹی باتیں، بڑے بڑے فائدے..... کارآمد نہیں!

ڈال رہے ہیں۔ برسات کا عجب ہی لطف تھا مگر اب تو برسات کے ساتھ ساتھ بیماریاں بھی آتی ہیں۔ برسات میں زکام، فلو، مینفائیڈ، دمہ، ہیضہ اور معدے کی خرابیاں، جسم کا درد، بھوک کا نہ لگنا اور

برکھارت آئی۔ پہلے زمانے میں جہاں بارش کا چھینٹا پڑا، گھر کے اندر خواتین نے کڑھائی چڑھا کر پکواؤں کا انتظام سنبھالا۔ پکڑے، گلگلے تلے جا رہے ہیں۔ آم بالٹیوں میں ٹھنڈے پانی میں دھو کر



ہوتی ہے۔ ہسپتال میں ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو الرجی کا شکار ہوتے ہیں۔

برسات میں عموماً ہیضہ اسہال پیٹ درد معدہ کی تکالیف ہماری اپنی بد پرہیزی کی وجہ سے ہوتی ہیں بچے ہیضہ سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ خصوصاً گاؤں اور دیہات میں تو وبا کی طرح یہ بیماری پھیلتی ہے۔ صاف ستھرا پانی نہ پینے سے یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ گندے ہاسی کیڑے زدہ پھل، ہاسی کھانا اور احتیاطی تدابیر سے ناواقف ہونے کی بناء پر بے شمار بچے ہیضہ سے مر جاتے ہیں۔ گندا پانی صحت کے لیے مضر ہے۔ برسات کے موسم میں پانی صاف ستھرے برتن میں اُبال کر شہنشاہ کر کے پئیں۔ اس سے جسم میں پانی کی کمی نہیں ہوتی۔ ہلڈ پریش نادرل رہتا ہے۔ قبض بھی نہیں ہوتا اور پیشاب نکل کر آتا ہے۔

مکھیوں کی بھرمار

برسات میں مکھیاں بہت نظر آتی ہیں۔ آپ اپنے گھر میں خصوصاً کچن میں صفائی کا خاص خیال رکھئے۔ صبح شام فینائل سے فرش دھوئے۔ کوڑے کی باسکٹ ڈھانک کر رکھئے۔ پھلوں کے پھلکے ادھر ادھر نہ ڈالئے۔ ان پر زیادہ مکھیاں آتی ہیں۔ بازار سے تھوڑا سا لیوٹر کا تیل خرید لائیے۔ اسٹینج کا ایک ٹکڑا لیجئے۔ شیشے کی پلیٹ میں اسٹینج کے ٹکڑے کو کھولتے گرم پانی میں بھگو کر پلیٹ میں رکھیے اور اس پر آدھا چھچھو لیوٹر کے تیل کا ڈالئے۔ اس سے سارا کچن خوشبو سے مہک جائے گا۔ دن میں دوبار گرم پانی سے اسٹینج کو بھگوئیے۔ ہفتہ میں صرف ایک بار لیوٹر کا تیل ڈالنا ہے۔ مکھیاں نہیں آئیں گی۔ پودینہ کا گلدستہ بنائیے دس بارہ ٹہنیاں پودینہ کی لے کر کسی گلدان یا گلاس میں لگائیے۔ پودینہ کی ٹہنیاں پانی سے دھو کر لگانی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ کچن میں جب بھی ٹاکی لگائیں اسے پہلے فینائل یا ڈیٹول سے

اب تو سب سے زیادہ مجھروں کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ڈینگنی بخار سے سب گھبراتے ہیں۔ ہمارے ہاں صفائی کا نظام ناقص ہے جگہ جگہ پانی ٹمھر جاتا ہے۔ گندے پانی میں مجھروں کی افزائش ہوتی ہے۔ کیڑے، مکوڑے، وحشرات الارض بھی ایسا لگتا ہے پانی کے ساتھ اُبل پڑے ہیں۔ آلودہ پانی صحت اور صفائی کی طرف سے لاپرواہی ہیضہ کی بیماری پیدا کرتی ہے۔ معدے کی سوزش اور انتڑیوں میں ایک جراثیم کی وجہ سے ہیضہ ہوتا ہے۔ پانی کی طرح دست آتے ہیں جس سے جسم کا پانی تیزی سے ختم ہونے لگتا ہے۔ بروقت طبی امداد نہ ہو تو مسئلہ خراب ہو جاتا ہے۔ پیٹ میں درد ہو مروڑ ہونے آ رہی ہو کمزوری بڑھ رہی ہو تو فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے۔ پانی پینا چاہئے۔ کولامشروبات کے بجائے صاف پانی استعمال کریں۔ کھانا سادہ اور تازہ زود ہضم کھائیں۔ ہاسی کھانے، گلے سڑے پھلوں، بازاری چٹ پٹے کھانوں سے مکمل پرہیز کریں۔ مکھیاں جس کھانے پر بیٹھ جائیں وہ اسے خراب کر دیتی ہیں۔ ڈھانک کر چھریں رکھیے۔ پھل اگر تھوڑا سا بھی خراب ہے تو گلا ہوا حصہ نکال کر پھینکنے کے بجائے پورا پھل ضائع کریں۔ صحت کا دھیان رکھیے۔ کہنے کو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں مگر ان پر عمل کیا جائے تو انسان بہت سی بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ برسات میں ہارشیں ہوتی رہتی ہیں۔ سبزہ گھاس پھوس تیزی سے بڑھتا ہے۔ گھاس اور خودرو پودوں میں نمی کی زیادتی سے پولن کا اخراج بڑھ جاتا ہے۔ گلے ناک اور دمہ کے بیمار لوگوں کو سانس لینے میں دقت ہوتی ہے۔ پولن الرجی سے بے شمار لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ماحولیاتی آلودگی سے الرجی

نہیں آئیں گی۔ بعض دلدھ نمک دانی کے سوراخ برسات میں سیلن اور نمی سے بند ہو جاتے ہیں۔ نمک دانی میں تھوڑے سے ثابت چاول چکی بھر ڈالیں۔ سوراخ بند نہیں ہوں گے۔ آٹے کے کنستر کو ڈھانک کر رکھیں اس میں چیز پات کے چند پتے ڈال دیں تاکہ برسات میں کیڑا۔ سُسری نہ لگے۔ آٹا خراب نہ ہو۔

برسات میں یہ چیزیں ضرور گھر میں رکھیں۔
 ۱۔ آرائس (تمکول) کے پکٹ 'سوف' پودینہ 'چھوٹی الائچی' لیموں 'ہر ادھیا' پودینہ 'اسبغول' کا 'چمکا' شہد 'اجوائن' پھلوں کا سرکہ 'ہورد' کی قلمون 'انار' دانہ سفید ذریعہ 'اورک' وغیرہ گھر میں ضرور رکھیں۔
 برسات میں ماحول کی آلودگی بڑھ جاتی ہے۔ آپ لوگ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ ہر ادھیا گھر میں لگانے سے کافی حد تک آلودگی کم ہو جاتی ہے۔ پہلے لوگ گھروں میں ہر ادھیا پودینہ ضرور کیا دیوں میں لگاتے تھے۔ اب یہ جدید تحقیق بھی ہر بے دھنی کی کاشت پر زور دے رہی ہے۔ تاکہ ماحول صحیح رہے اور آلودگی ختم ہو جائے۔ ہر ادھیا کھانے کا جزو ہے۔ اس کی چٹنی لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ ہر ادھیا یا خشک دھیا ہیں کر تھوڑے سے پانی میں اس کا رس ملا کر پینے سے قے ڈک جاتی ہے۔ اسی طرح حاملہ خواتین بھی قے کے لیے برسات میں اسے لے سکتی ہیں۔ پودینہ کے پتے ہیں کر لیموں کا رس ڈال کر کھانے سے بھی کھلی ڈک جاتی ہے۔ برسات میں میں دل حلائے تو فوراً ٹھنڈے پانی کے گلاس میں ایک لیموں چھوڑ کر چینی ملا کر گھونٹ گھونٹ کر کے پینے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اکثر خواتین لیموں کاٹ کر اس پر پسی ہوئی کالی مرچ کا سنوف اور چینی اچھی طرح لگا کر چوستی ہیں۔ اس سے بھی کھلی کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ صرف نمک کالی مرچ 'لیموں' کے

دھوئیں تاکہ کیڑے مکوڑے فرش پر نظر نہ آئیں۔

لال بیگ (کاکروچ)

برسات میں کٹر بند ہو جائے یا پانی کھڑا ہو تو لال بیگ بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ان میں کچھ بڑے اڑنے والے بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح چوہے بھی کٹر سے نکل آتے ہیں۔ یہ سب بیماریوں کی وجہ بنتے ہیں۔ بازار میں چوہے مار گولیاں ملتی ہیں آپ وہ لا کر ڈالیں۔ چوہے مر جائیں تو انہیں کسی لفافہ میں ڈال کر پھینکیں۔ اسی طرح تھوڑا سا پیپر منٹ اور اتنی ہی سفید ٹھیکری باریک ہیں کر ملائیں اور گھر کے ہر کونے میں چھڑکیں۔ چوہے بھاگ جائیں گے۔ چھروں کے لیے آپ ہر ہفتہ لوہان 'حل' کلونچ 'نیم' کے چوں کی دھونی دیجئے۔ نیاز بوجسے تلسی بھی کہتے ہیں اس کے پھولوں کی ٹہنیاں گلدان میں سجائیے۔ چھڑ نہیں آئیں گے۔ چھپکلیاں ہوں تو مور کا پر رکھیں بھاگ جائیں گی۔ مگن کی کیبنٹ میں اخبار کا کاغذ مت بچھائیے۔ یہ کاکروچ کو بہت پسند ہے۔ برسات سے پہلے مگن کی کیبنٹ صاف کر کے بازار سے خاکی کاغذ لا کر بچھائیں۔ بچھانے سے پہلے آپ یہاں کیوٹیکس پاؤڈر ضرور چھڑکیں۔ یہ سستا اور کیڑے بھگانے کے لیے اچھا ہے۔ برساتی سفید لے کیڑے چھوٹے وغیرہ نہیں آئیں گے۔ کاکروچ کے لیے آپ بازار سے بورک پاؤڈر خریدیں۔ ایک کپ بورک پاؤڈر ایک کپ پسی چینی ایک کپ میدہ اور ایک کپ خشک دودھ ملا کر اس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر ہیر جھنٹی گولیاں بنائیے۔ مگن میں الماریوں میں یہ گولیاں رکھیے کاکروچ نہیں نکلیں گے۔ ڈھائی مہینہ بعد نئی گولیاں بنا کر رکھ دیں۔

چینی کے ڈبہ میں چوٹیاں گھس جاتی ہیں۔ باریک باریک منھ کی مخلوق بہت تنگ کرتی ہے۔ چینی کے ڈبہ میں چوہے ثابت لوگ ڈالیں۔ چوٹیاں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیکرو ویب سائٹ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ آر ایچ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



گاڑی کوھی چلتے پھرتے

سونمگ بول میں تبدیل کر ڈالا

ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا، آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں پر بھی یہ بات صادق آتی ہے جن کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اپنی گاڑی کو ہی چلتے پھرتے سونمگ بول میں تبدیل کر ڈالا۔ اپنی گاڑی کے عقبی حصے کو پانی سے بھرا اور پھر تیز رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے سڑکوں پر خوب ہنگامہ چلایا جو پولیس کو ایک آنکھ نہ بھایا اور اب تیزی سے ان پچھلوں کی تلاش جاری ہے۔

(مرسلہ: بشیر حسین - نارووال)

میں کی گلی امریکہ کی ایک شخصیت سے پتہ چلا ہے کہ بڑھاپے کے اثرات کو اجوائن کم کرتی ہے۔ حافظہ کی قوت برقرار رکھتی ہے۔ یادداشت میں کمی نہیں ہونے دیتی۔ بھلکھوپن نہیں ہوتا بلکہ بوڑھے لوگوں کا حافظہ صحیح رہتا ہے۔ اجوائن معدے اور جگر کے لیے مفید ہے اس کا عرق بھی ملتا ہے گھریلو طور پر آپ ایک پاؤ اجوائن لیں۔ اسے صاف کریں، مٹی کنکر نیچے نکال کر کسی شیشے کے کھلے پیالے میں ڈالیں۔ اس میں پانچ تولے کالا نمک پس کر ملائیں اور اب اس پر اتنا لیموں کا عرق ڈالیں کہ اجوائن اور نمک اچھی طرح حل ہو جائیں اور لیموں کا رس اوپر تک آجائے۔ اب اسے لکڑی کے جچے سے دن میں دو تین بار ہلائیں لیموں کا رس خشک ہو جائے تو اور ڈال دیں۔ اس طرح پانچ دفعہ لیموں کا رس ڈالیں خشک ہونے پر پس کر رکھ لیں۔ اجوائن اور نمک کا یہ آمیزہ پیٹ کے درد گیس، اچھارہ کو دور کرتا ہے۔ کھانے کے بعد چنگی بھر کھالیں تو کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔ ایک ماشہ سے زیادہ نہیں کھانا چاہیے۔ یہ چورن مزیدار ہے اور پیٹ کی گیس کی بیماریوں میں

کھڑے پر لگا کر چوسنے سے فائدہ ہوتا ہے جو لوگ اپنا وزن کم کرنا چاہتے ہوں وہ ایک لیموں کا رس نیم گرم پانی کے ایک گلاس میں ڈالیں۔ تھوڑا سا شہد بھی ملا سکتے ہیں۔ اس سے چربی آہستہ آہستہ کم ہوتی ہے۔ شیشے کے پیالے میں دو لیموں کا رس نچوڑیے اور اتنا ہی پیاز کا رس ملائیے۔ چینی ملائیے۔ حسب ضرورت انگلی سے تھوڑا تھوڑا چائے سے قے اور متلی میں فائدہ ہوتا ہے۔ گھریلو خواتین برسات کے موسم میں لیموں کا استعمال ضرور کرتی ہیں۔ لیموں کا اچار ہری مرچ کے ساتھ ڈالا جاتا ہے۔ کھانے کے ساتھ استعمال کرنے سے ہاضمہ رہتا ہے۔

اردی بیگن ماش چنے کی دال، گھو بھی آلو وغیرہ بنائیں تو اس میں آپ اورک ضرور ڈالیں۔ پیاز کاٹ کر دھو کر اس پر ہر ادھیا پودینہ ہری مرچ کاٹ کر ڈالیں ہضم ہو جائے گا۔ ہاسی کھانا بالکل استعمال نہ کریں۔ خواتین چاول فریج میں رکھ کر دو تین دن بعد بھی استعمال کرتی ہیں۔ ایک دن سے زیادہ نہ رکھیے۔ اسی طرح آپ پھلوں کا سرکہ لیں۔ جیم کی بوتل دھو کر اس میں ایک کپ پیاز کاٹ کر ڈالیے۔ تھوڑی سی اورک کاٹ کر ملائیے۔ ہری مرچ دو عدد کاٹ کر ڈالیے اور ایک یا دو چھوڑے کاٹ کر ملائیے۔ نمک ڈال کر کھانے کی میز پر رکھیے۔ سرکہ ہاضم ہے۔ برسات میں استعمال کیا جائے تو پیٹ ٹھیک رہتا ہے۔ سرکہ جیم کی بوتل میں اتنا ڈالیے کہ پیاز سے ایک انچ اوپر رہے۔ دال کے ساتھ ضرور کھائیے۔ گیس، پیٹ درد نہیں ہوگا۔

اجوائن کے ننھے بیج

اجوائن کے بیج ہمارے ہاں استعمال ہوتے ہیں مچھلی فرائی بنتی ہے تو اجوائن ضرور ملاتے ہیں۔ پکڑوں میں بھی ذرا سی اجوائن ڈالنے سے ہاضمہ رہتا ہے اور ذائقہ بھی بہتر ہو جاتا ہے۔ حال

کریں۔ ٹھنڈا کر کے اس میں اتنی چینی ملا کر پیس کر رکھیے۔ دو تین چھوٹی الاچھی کے دانے بھی ملائیے۔ بدھنسی ہوئے کھانا نہ کھائیں تو ان کو کیسے یہ سونف کھائیں۔ مزے کی ہے، اس کے کھانے سے بھوک لگے گی۔ ثابت سونف بھون کر رکھیے۔ اس میں تھوڑے سے بادام کاٹ کر ملائیے۔ ثابت چھوٹی الاچھی مصری کے چھوٹے ٹکڑے ملائیے۔ کسی خوب صورت بوتل میں بھر کر رکھیے۔ سونف بدھنسی نہیں ہونے دیتی معدے کو طاقت دیتی ہے۔ اس میں ایک ٹکڑا ناریل کا بھون کر باریک کاٹ کر ملائیں تو اس کا ذائقہ بڑھ جاتا ہے۔ سونف، الاچھی، پودینہ کا تودہ بنا کر رکھیے پیٹ کے امراض میں مفید ہے۔ دن میں تین چار بار لیں۔ بدھنسی اور پیٹ کا مسئلہ ٹھیک ہو جائے گا۔ بچوں کے لیے سونف مفید ہے۔ تھوڑی سی سونف پیالی پھر پانی میں پکا کر رکھ کر ٹھنڈا کر کے بچوں کو دینے سے پیٹ کا درد گیس کا مسئلہ صحیح رہتا ہے۔ پودینہ کے سب کو سیکھول کہتے ہیں، نوڈ پوائزننگ میں دیا جاتا ہے۔ پودینہ اور اجوائن کا سب ملتا ہے۔ گھریلو طور پر اسے ہم وزن ملا کر دھوپ میں رکھنے سے گاڑھا سیال بن جاتا ہے۔ کچھ اس میں کافور کا سب ملاتے ہیں۔ آج کل تو ہر چیز میں ملاوٹ ہے آپ بازار سے قلم خرید کر گھر میں رکھیے۔ خدانہ کرے برسات میں ہیضہ یا پیٹ درد تھے وغیرہ ہو تو تین قطرے تھوڑی سی چینی پر ڈال کر دینے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح O.R.S دینے سے پانی کی کمی نہیں ہونے پاتی۔ کہنے اور لکھنے کو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں مگر ان کے فائدے بہت بڑے ہیں۔ آپ ان باتوں پر عمل کریں گے تو یقیناً برسات میں ہونے والی تکالیف سے بچ سکتے ہیں۔ برسات کے موسم سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں کیونکہ صحت ہے تو سب کچھ ہے۔

فائدہ مند پانی کے ساتھ کھائیے۔ اجوائن کے چند دانے کھانے سے بھوک لگتی ہے۔ پیٹ کے امراض دور ہوتے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ پیٹ کی چربی بھی کم ہونے لگتی ہے۔

برسات میں چشمتیاں ضرور کھانیے

انار دانہ کی چشمتی بنائیے۔ انار دانہ صاف کر کے چوتھائی کپ، لہسن کے چھ دانے اور ادراک کا چھوٹا سا ٹکڑا۔ پودینہ کے پتے ڈیڑھ کپ، آدھا کپ ہرے دھنیے کے پتے لیں۔ سفید زیرہ چائے کے دو چمچے ہری مرچ چھ عدد ثابت سرخ مرچ چار عدد نمک حسب خواہش لے کر چشمتی پیس کر کے رکھ لیں۔ کھاب کے ساتھ پراٹھے کے ساتھ یہ چشمتی استعمال کریں۔ اس سے بھوک لگے گی ہاضمہ رہے گا۔

کیری کی چشمتی

کچے آم دو عدد چھل کر کھلی نکال کر ٹکڑے کریں۔ ایک کپ پودینہ کے پتے لیں دو ہری مرچیں، تھوڑا سا نمک، سفید زیرہ، دو چائے کے چمچے ثابت لال مرچ سات عدد، لہسن کے چار دانے لے کر پیس کر رکھ لیں۔ تھوڑی سی چشمتی علیحدہ پیالے میں نکال کر ایک نخل سپون چینی ملا لیں۔ یہ کیری کی میٹھی چشمتی بن جائے گی اور دوسری سادہ۔ دال سبزی کے ساتھ، دال چاول کے ساتھ کپالوں کے ساتھ کھائیے۔ سوکھے آلو بخارے کی چشمتی بھی ہاضم ہوتی ہے۔ خشک آلو بخارے لے کر پانی میں پکاتے ہیں۔ چینی ملا کر اس میں چار مغز ملاتے ہیں۔ ایک پاؤ خشک آلو بخارے میں آپ ڈگنی چینی ملائیے تقریباً دو کپ پانی ہو اور اس میں ایک چمچ چار مغز، تھوڑی سی ادراک کاٹ کر ملائیں۔ یہ سادی چشمتی سب کو پسند آتی ہے۔

سونف

آدھ پاؤ سونف لے کر صاف کریں اور اسے فرائی پان میں ہلکا سا بھون لیجئے۔ بادامی یا سرخ نہ

چھاؤں

جاوید بسام



ایک شخص کی پتا، جسے دُور گاؤں میں مٹا کی چھاؤں میسر آگئی تھی

بے اختیار دک گئے۔ بسا اوقات غیر متوقع نظارہ
انسان کو اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔ ایک پرانے گھر کے
احاطے میں پھیل کے درخت کی چھاؤں میں بہت
ساری بطنیں موجود تھیں، چھوٹی اور بڑی، بھوری اور کالی
لیکن زیادہ تر دودھ کی طرح سفید تھیں، ایک طرف

ایک موڑ مڑ کر جب میں اس گلی میں داخل ہوا تو
ایسا لگا جیسے کسی آبی تالاب کے کنارے آگیا ہوں۔
پرندوں کی قیں قیں کی آوازوں سے گلی گونج رہی
تھی۔ میں حیرانی سے آگے بڑھتا رہا۔ اگلا موڑ
قریب ہی تھا۔ مڑنے پر تجسس تو دور ہوا لیکن قدم

پاس لے آیا "ذرا مضبوط پکڑو لگتا ہے تم نے کبھی کوئی جانور نہیں پکڑا" وہ بولیں۔

میں زیر لب مسکرایا کیونکہ یہ حقیقت تھی میں نے بچپن میں چند چوڑوں اور طوطوں کے علاوہ کبھی کوئی جانور نہیں پالا تھا۔ انہوں دوائی لٹائی اور بولیں "اس کی دہنی ٹانگ آگے کرو" یوں میں نے دوا لگانے میں ان کی مدد کی۔

"سبز چائے پیا کرو، نزلے کو فائدہ دیتی ہے" انہوں نے کہا۔

میں نے سعادت مندی سے گردن ہلاتی، کچھ دیر اور وہاں بیٹھا اس ماحول سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر سلام کر کے باہر نکل گیا۔

میرا پیشہ قدیم دور کے سوداگروں جیسا ہے۔ بعض چیزیں میں شہر سے گاؤں اور قصبوں میں لے جاتا ہوں اور بعض چیزیں وہاں سے شہر لے آتا ہوں۔ اس آدے بدلے سے جو یافت ہوتی ہے اس سے میرا گزارہ ہوتا ہے۔ وہاں میں کافی عرصے سے جا رہا تھا۔ ایک دکاندار سے میری اچھی نہد رہی تھی۔ مینے میں ایک بار میرا وہاں ضرور چکر لگتا تھا۔ سٹیشن سے نکل کر میں پیدل بازار تک جاتا۔ آج اتفاق سے اس گلی میں جا نکلا تھا۔ دکاندار کا نام عبدالکریم تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے "مرحبایا اغنی!" کا نعرہ بلند کیا اور اٹھ کر گلے ملا "آؤ بیٹھو آج تو منہ پر رونق نظر آرہی ہے لگتا ہے سفر اچھا کتنا ہے؟"

میں نے سامان کا تھیلا اسے دیتے ہوئے کہا "سفر تو جیسا کتنا ہے ویسا ہی کتنا البتہ تمہارا گاؤں بہت اچھا ہے۔"

"گاؤں تو تم بہت عرصے سے دیکھ رہے ہو آج کیا نیا دیکھ لیا؟"

میں نے اسے اماں جی کا بتایا "اچھا ام بٹہ کی بات کر رہے ہو میں نے بھی انہیں ہمیشہ بٹھوں کے

ایک چھوٹا سا تالاب بھی تھا کچھ اس میں تیر رہی تھیں۔ قریب ہی ایک عمر رسیدہ فرہ عورت ایک موٹر سے پریشانی انہیں ہالٹی سے خوراک نکال کر کھلا رہی تھی۔ میں دلچسپی سے انہیں دیر تک دیکھتا رہا۔ گاؤں دیہات میں عموماً ہر کوئی مرغیاں اور بلیاں پالتا ہے لیکن نہ جانے کیوں اس دن اس نظارے نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔

پھر مجھے پیاس محسوس ہوئی میں نے کہا "اماں جی! ایک گلاس پانی مل جائے گا؟"

"ہاں بیٹا!" انہوں نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھر بیٹھ گئیں۔ میں نے دیکھا ان کے گھٹنوں پر مونے کپڑے لپٹے تھے۔ لگتا تھا وہ جوڑوں کے درد میں مبتلا ہیں۔

"بیٹا! میرا اٹھنا مشکل ہے تم خود ہی پی لؤ" انہوں نے منکے کی طرف اشارہ کیا میں احاطے کا چھوٹا سا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ بلیاں اجنبی کو دیکھ کر چونکیں کچھ تو ڈر کر پیچھے ہٹ گئیں اور کچھ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور بہادری سے گردن نیچے کیے مجھ پر چڑھ دوڑیں۔ اماں جی نے کوئی مخصوص آواز نکالی تو وہ رُک گئیں۔ میں نے منکے سے پانی نکالا "بیٹھ جاؤ بیٹا" انہوں نے دوسرے موٹر سے کی طرف اشارہ کیا، میں اس پر بیٹھ گیا۔

وہ اپنے کام میں لگی تھیں کبھی بٹھوں سے باتیں کرتیں تو کبھی انہیں ڈانٹتے لگتیں۔ پھر انہوں نے پوچھا "کیا شہر سے آئے ہو؟" "جی" میں نے کہا۔ اس کے بعد انہوں نے اور کچھ نہ پوچھا شاید کچھ اور پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر وہ بمشکل انہیں اور بولیں "اس کالے سردالی بلیخ کو پکڑنے میں میری مدد کرو گے" میں نے کہا "آپ بیٹھیں میں پکڑتا ہوں۔"

اس لکڑی بلیخ نے مجھے پورے احاطے میں نہ پایا اور مشکل سے پکڑی گئی۔ میں ہانپتا ہوا اسے ان کے

اچھی باتیں

☆ سمجھوتہ کرنا سیکھو، کیونکہ تھوڑا سا جھک جانا کسی رشتے کو ہمیشہ کیلئے توڑ دینے سے بہت بہتر ہے۔

☆ فقط انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر صرف بولنے سے پہلے تک، بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ہے۔

☆ ڈکھ انسان کے مرنے سے نہیں ہوتا بلکہ اپنائیت، محبت اور غلوں کے رشتوں کے ٹوٹ جانے کا ہوتا ہے۔

☆ ایک دیوتا کے سامنے سو سال تک سر جھکائے کھڑے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ ایک پرہیزگار شخص کی صحبت میں تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔

☆ الفاظ اپنے اندر بڑی تاثیر رکھتے ہیں۔ یہ کبھی شعلہ اور کبھی جہنم کبھی زخم تو کبھی مرہم بن جاتے ہیں۔ کبھی زندگی میں رنگ بکھیرتے ہیں تو کبھی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔

(ایس۔ امتیاز احمد۔ کراچی)

”جی..... کھیل تو لیں گے لیکن میں انہیں رکھوں گا کہاں؟“ میرے چھوٹے سے قلیٹ میں نہ دھوپ آتی ہے نہ ہوا! میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش ہو گئیں پھر کچھ دیر بعد بولیں ”کبھی بال بچوں کو ملانے کے لیے لے آؤ۔“

”جی کسی دن لاؤں گا“ میں نے کہا لیکن وہ دن کبھی نہ آسکا۔ ایک روز کریم کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”میں گاؤں میں آکر رہنا چاہتا ہوں۔“

”ماشاء اللہ یا اخی! ایسا ہرگز نہ کرنا، لوگ شہروں کو جا رہے ہیں اور تم شہر سے بھاگ رہے ہو“ وہ تیزی سے بولا۔

میں حیران تھا کہ یہ بات میرے منہ سے کیسے نکل گئی، میں نے کبھی یہ بات نہیں سوچی تھی۔ شاید

دورمیان دیکھا ہے“ کریم کو عربی زبان سے بہت دلچسپی تھی ایک موٹی لفت ہر وقت اس کے پاس ہوتی تھی، فرصت میں وہ اسے پڑھتا رہتا تھا۔

”مجھے ان کے بارے میں بتاؤ“ میں نے کہا۔

”بس اخی! وہ بھاری اکیلی ہے ایک بیٹا فوج میں تھا۔ غیروں کی جنگ میں لڑنے کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب وہ بطنیں ہی اس کی دوست اور معاشی سہارا ہیں۔“

اس دن کے بعد میں جب بھی اس گاؤں میں جاتا میرے قدم از خود اس گلی کی طرف اٹھ جاتے۔ وہ ہمیشہ اسی طرح بیٹھی نظر آتیں۔ میں سلام کر کے موٹے حاسنہال لیتا۔ بطنیں اب مجھے پہچاننے لگی تھیں۔ اماں جی پوچھتیں ”اور سناؤ تمہارا شہر کیسا ہے؟“

”ویسا ہی بگ ڈٹ بھاگتا ہوا، پیار پیار سا“ میں جواب میں دیتا۔ ”بیمار تو نہیں بھاگتے“ وہ مسکرا کر کہیں۔

میں خاموش ہو جاتا۔ شہروں کے بارے میں میری سوچ دوسروں سے الگ تھی۔ وہاں کی مصروف زندگی مجھے پسند نہیں تھی۔ وہ بھی چپ سا دھ لیتیں۔

انہوں نے میرا کام، میرے حالات یہاں تک کہ کبھی میرا نام بھی نہیں پوچھا۔ میں بھی ان سے ذاتی سوالات نہیں کرتا تھا۔ وہ مجھے چھوٹے سے کپ میں سبز چائے پلاتیں۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہتا پھر سلام کر کے اٹھ جاتا۔ وہ لحات جو میں اس گھر میں گزارتا تھا میرے اندر نئی ہمت اور تازگی بھر دیتے۔ قنصع اور خود غرضی سے پاک اس کچے محن میں ایک الگ دنیا آباد تھی۔ جتنی دیر میں وہاں رہتا اپنے خوف، فکر میں اور اندیشے بھلا دیتا۔ میرا دل مسرتوں سے لبریز ہو جاتا اور واپس آنے کے بعد بھی کئی دنوں تک میں خوشی اور خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا۔

ایک دن میں وہاں بیٹھا تھا وہ بولیں ”یہ بچ کے دو چوڑے لے جاؤ تمہارے بچے کھیل لے گئے۔“

ان کی نظریں میرا چہرہ ٹٹول رہی تھیں۔

”کیسی چاپ؟“ میں نے ہونٹوں کی طرح پوچھا۔

”بچے نہ بنو، وہ ستر سال سے اوپر کی ہیں۔“

میں اس سے نظر چرا کر باہر دیکھنے لگا۔ اس نے اپنی لغت اٹھائی اور کوئی لفظ تلاش کرنے لگا۔

اس دفعہ جب میں وہاں گیا تو راستے میں بارش شروع ہو گئی۔ سامان زیادہ تھا۔ ریل سے اتر کر میں سیدھا کریم کے پاس پہنچا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خاموش ہے اور مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا۔ سامان کا حساب کر کے جب ہم فارغ ہوئے تو میں نے پوچھا ”کیا حالات ہیں؟“ اس نے دھیرے سے کہا ”یا اخی! ام بٹہ کا انتقال ہو گیا۔“ میرے ہونٹ سختی سے منچ گئے۔ مجھے ان سے کچھلی ملاقات یاد آ رہی تھی۔ کریم نے مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں لگانے کی کوشش کی لیکن میں نے دلچسپی نہیں لی۔ پھر میں وہاں سے اٹھ گیا ”ادھر جاؤ گے؟“ اس نے پوچھا۔

”شاید“ میں نے کہا اور سلام کر کے چل دیا۔

میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے قدم ایک بار پھر مجھے وہاں لے آئے۔ آج بھی گلی سنسان پڑی تھی، کوئی آواز نہ تھی، کوٹھری میں پرانا زنگ آلود تالا لٹکا تھا۔ خالی صحن میں سوکھے پتے ہوا سے اڑتے پھر رہے تھے۔ موٹروں پر گرد جی تھی۔ احاطے کی دیوار پر ایک کوا خلاف عادت خاموش بیٹھا گردن گھما گھما کر جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری بے چین نگاہیں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں، اچانک مجھے لگا کہ گرمی کی شدت بڑھ گئی ہے۔ سورج نیچے چلا آیا ہے اور وہ چھتیا درخت کٹ کر گر چکا ہے۔ جس نے دوڑتی اور جھلستی زندگی میں کچھ دنوں کے لیے مجھے اپنے سایے میں لے لیا تھا۔ جب میرے پیر وجود کا بوجھ اٹھائے اٹھائے احتجاج کرنے لگے تو میں بوجھل قدموں سے گلی پار کر گیا۔



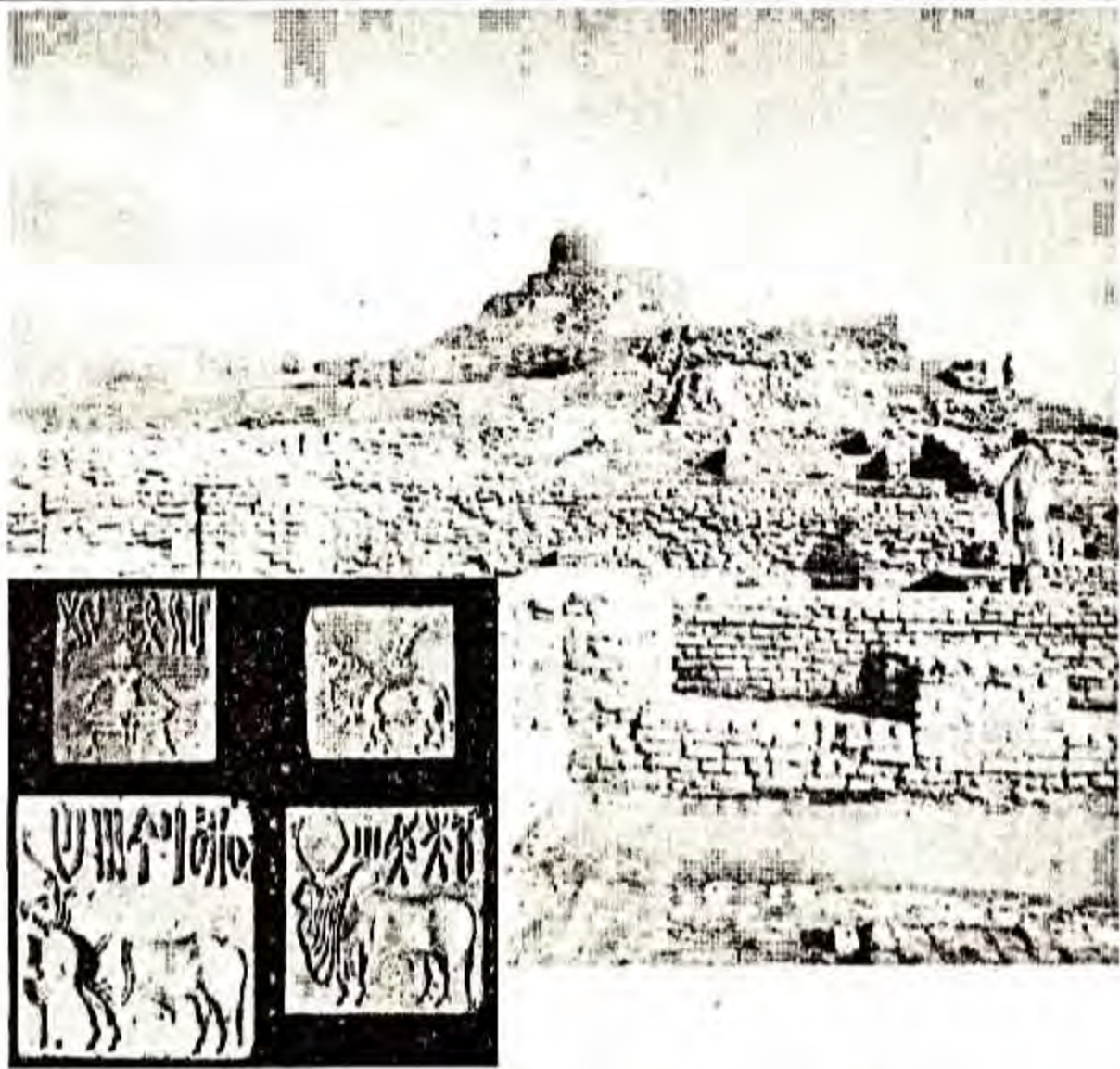
میرے لاشعور میں کہیں موجود تھی جو اچانک زبان پر آ گئی۔ بہت عرصے تک میں وہاں اسی طرح جاتا رہا۔ ایک دن جب میں وہاں گیا تو گلی میں قدم رکھتے ہی چونک پڑا۔ میرے کان وہاں آتے ہی آوازوں کے عادی ہو چکے تھے لیکن اس دن وہاں خاموشی طاری تھی۔ موڑ مڑ کر دیکھا تو احاطہ خالی پڑا تھا۔ ایک بھی بلیخ وہاں نہیں تھی۔ میں حیران و پریشان کھڑا تھا کہ سامنے کوٹھری سے ایک ادھیڑ عمر عورت باہر آئی۔ میں نے اسے اکثر پڑوس کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اماں جی کہاں ہیں؟ اس نے کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ میں جھجکتا ہوا اندر چلا گیا۔ مدہم روشنی میں وہ جھلنگ سی چارپائی پر بیمار پڑی تھیں۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور بولیں ”آگئے..... تمہارا شہر کیسا ہے؟“ ”آپ بتائیں آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بس اللہ کا شکر ہے“ وہ دھیرے سے بولیں۔ ”دوائی لی ہے؟“ ”ہاں لی ہے“ ”شہر چلیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔“ ”تم تو کہتے تھے کہ شہر بیمار ہے“ انہوں نے ہنسنے کی کوشش کی۔ ”چھوڑیں، میرے ساتھ چلیں“ میں نے کہا۔

”نہیں..... نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے“ وہ غلامی دیکھتے ہوئے بولیں۔ میں نے بہت ضد کی لیکن وہ نہیں مانیں، میں نے بلیخوں کا پوچھا ”دے دیں..... انہیں تو دینا ہی تھا“ انہوں نے چہرہ گھماتے ہوئے کہا۔ میرا دل بوجھل ہو رہا تھا میں وہاں سے اٹھ کر کریم کے پاس چلا گیا۔ کریم نے بتایا کہ انہوں نے بیوپاری کو بلا کر تمام بلیخوں کا سودا کر دیا مکان بھی انہوں نے ایک فلاحی ادارے کو دے دیا ہے۔

”لیکن کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ بولا ”یا اخی..... ام بٹہ پیش بین ہیں، انہیں چاپ سائی دینے کی ہے۔“



عارف محمود اہل

موہنجوداڑو کی تصویری تحریریں

ماہرین ابھی تک ان تصویری تحریروں کو پڑھنے سے قاصر ہیں!

نے اس علاقے میں کسی وقت میں حکومت کی اُس کا نام موہن تھا اور اسی کے نام کی نسبت سے یہ علاقہ موہنجوداڑو کے نام سے مشہور ہو گیا۔ موہنجوداڑو ایک ایسی جگہ ہے، جہاں قدیم وادی سندھ کی تہذیب کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

موہنجوداڑو کا علاقہ تقریباً 2500 قبل مسیح میں آباد ہونا شروع ہوا۔ انٹرنیشنل ایجوکیشنل سوسائٹی کی وہ

برصغیر میں قبل از مسیح کا انسان کس طرح زندگی بسر کرتا تھا؟ اس بات کا اندازہ صدیوں پرانی تہذیب ”موہن جو داڑو“ سے لگانا قطعاً مشکل نہیں۔ یہ پاکستان میں آثار قدیمہ کی ایک عظیم نشانی ہے۔ اگر لفظی اعتبار سے اس کا ترجمہ کیا جائے تو موہن ایک نام اور داڑو کا مطلب قلعہ ہے۔ یعنی موہن کا قلعہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس شخص

ہے میں وہ لوگ رہتے تھے جو اس شہر پر حکومت کرتے تھے۔ اس سے میں خوبصورت گھروں کے علاوہ بڑے بڑے غسل خانے بھی بنے ہوئے ہیں۔ جہاں غسل کرنے کی ہر خاص و عام کو اجازت ہوتی تھی۔ مونجواڈو کے زیریں سے میں عام لوگ رہائش پذیر تھے۔ اس علاقے میں گھروں کے ساتھ گلیاں بالکل 90 ڈگری کے زاویے پر بنائی گئی تھیں۔ جن کی زیادہ سے زیادہ لمبائی 35 فٹ تھی۔ اس کے بعد ایک دوسری گلی شروع ہو جاتی تھی۔ گلیوں کے ساتھ ہی ٹکاسی آب کے لیے نالیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ مونجواڈو میں ٹکاسی آب کے لیے بنائے جانے والا سسٹم اس وقت کے لحاظ سے ایک جدید اور بہترین سسٹم تھا جس کی مثال آج کے زمانے میں بھی نہیں ملتی ہے۔

اگر موجودہ دور کے ٹکاسی آب کا مقابلہ اس زمانے سے کیا جائے تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ مونجواڈو کا ٹکاسی آب کا نظام زیادہ بہتر ہے۔ یہاں پتھر کے چوکور ٹکڑوں سے گھر تعمیر کیے گئے تھے جن میں کھلے روشن دان بھی ہوتے تھے۔ اُن میں سے کچھ گھر تو بہت بڑے تھے اور کچھ کا سائز درمیانہ تھا۔ اُن میں اکثر گھروں پر باقاعدہ پلستر بھی ہوا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔ مونجواڈو کے بارے میں لوگوں کی متضاد آراء ہیں کچھ کا کہنا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا۔ جس سے یہ پورا کا پورا شہر تباہ ہو گیا تو کسی کا کہنا ہے کہ اس علاقے میں ایک بہت بڑا زلزلہ آنے کی وجہ سے یہاں پر آباد تمام لوگ ہلاک ہو گئے۔ ماہرین کے نزدیک مونجواڈو آج بھی ایک معمر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماہرین ابھی تک یہ جان نہیں پائے کہ اعلیٰ تہذیب و تمدن کا گہوارہ ”مونجواڈو“ کیوں کر تباہ ہوا؟

فہرست، جس میں دنیا کے محفوظ ترین آثار قدیمہ کے نام درج ہیں، اُن میں مونجواڈو کا نام سرفہرست ہے۔ 20 ویں صدی کے آغاز میں ایک انگریز سر جان مارشل نے اس جگہ کی کھدائی کروانا شروع کی۔ کھدائی کے بعد یہاں سے ایک مکمل شہر دریافت ہوا جو آج ہر کسی کی زبان پر مونجواڈو کے نام سے مشہور ہے۔ سر جان مارشل نے اس علاقے کی کھدائی کے آغاز کے وقت ہی یہ کہہ دیا تھا کہ یہاں کسی زمانے میں کوئی ایسی بستی قائم تھی جہاں لوگ اس طرح روزمرہ زندگی کے امور نمٹاتے اور زندگی گزارتے تھے جیسے آج لوگ زندگی گزار رہے ہیں۔ اس شہر کی کھدائی کے دوران بے شمار تصویری تحریریں بھی ملی ہیں مگر بے حد کوششوں کے باوجود ماہرین ان تصویری تحریروں کو مکمل طور پر سمجھنے اور اُن کا مفہوم اخذ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

آج بھی مونجواڈو کے عجائب گھر میں سر جان مارشل کے زیر استعمال گاڑی کھڑی ہے جو انہوں نے علاقے کی کھدائی کے دوران استعمال کی۔ مونجواڈو کی کھدائی کے بعد اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس علاقے میں باقاعدہ گھر، کوٹھیاں اور گلیاں بنی ہوئی تھیں جو اب بھی اسی حالت میں قائم ہیں۔ مونجواڈو میں رہنے والے لوگوں کی آبادی تقریباً پانچ ہزار لوگوں پر مشتمل تھی۔ یہاں لوگ ایسے گھروں میں رہتے تھے جہاں غسل خانے، صحن، برآمدے اور باورچی خانے بھی بنے ہوئے تھے۔ علاقے میں حفاظت کے لیے اس کے گرد پتھروں کی مدد سے مضبوط دیوار تعمیر کی گئی تھی۔

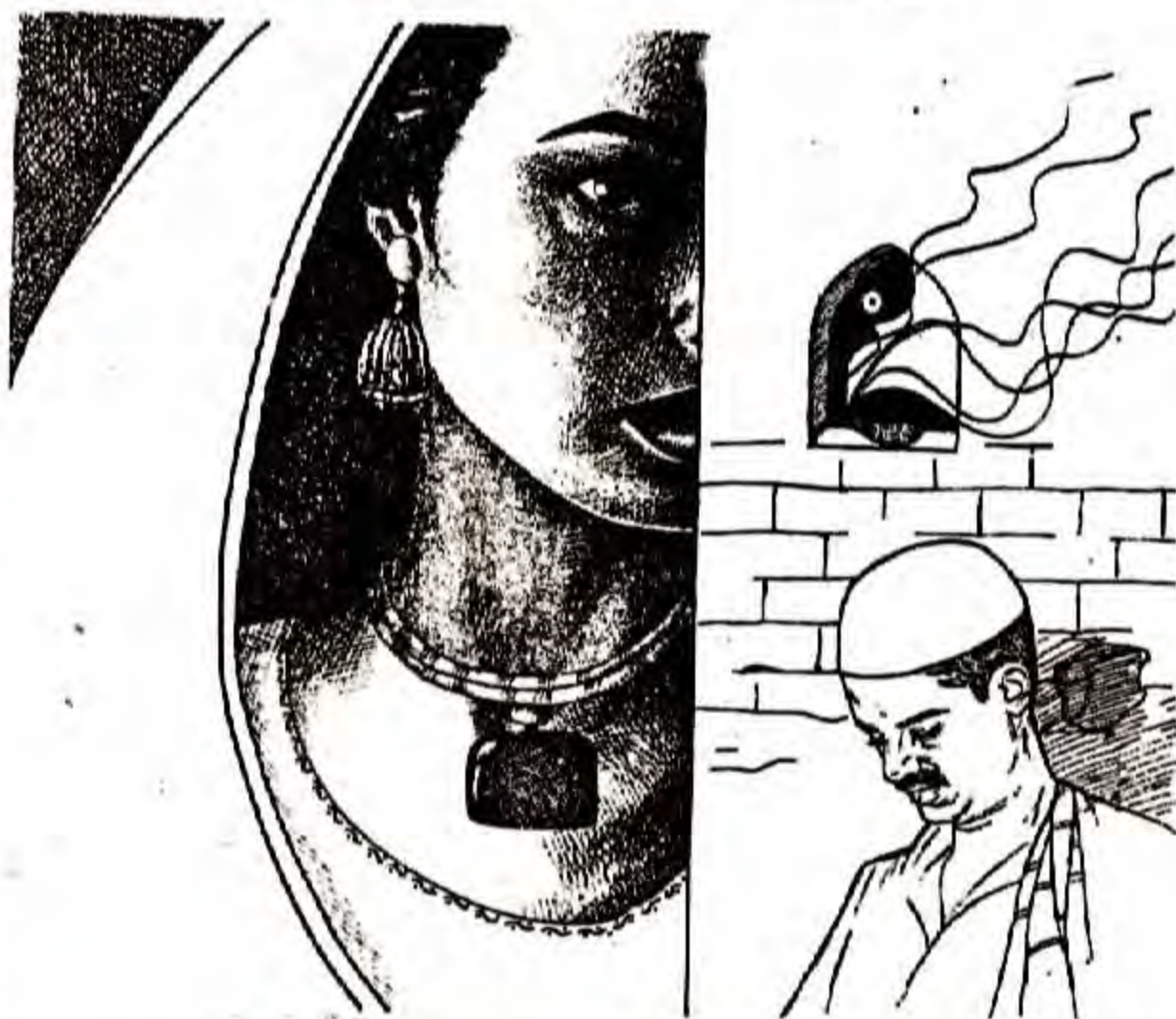
پینے کے پانی کے لیے ہر ایک اینٹوں کی مدد سے بہت ہی خوبصورت کنواں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے دو بڑے بڑے ہال بنے ہوئے ہیں۔ ہال میں داخل ہونے کے لیے اُن کے درمیان راستہ بنایا گیا ہے۔ یہ شہر دو حصوں میں تقسیم تھا، ایک بالائی حصہ اور ایک زیریں۔ بالائی

یک درگیر

اشرف مہجری

اس نے تمام روزانہ بندے سے شروع ایک روزانہ

ایک آدمی کا قصہ جو ایک فاحشہ، سفیہ و اطرحا المرسان، غصہ و شر و...



اُجڑے دیار کی کہانی، اُردو کے نام و را دیب اشرف صبوحی کی زبانی

ہو گئی تھی کہ ہر وقت عورتوں اور مردوں کا تانا بکھڑا رہتا۔ جنوں کی مسجد کے متعلق ہزاروں روایتیں مشہور تھیں کہ فلاں عامل نے چلہ کھینچنا چاہا، آدمی رات نہ گزری تھی کہ کسی نے گروں مروڑ دی۔ لوگوں کو دن دہاڑے

جنوں والی مسجد کے حاجی صاحب کو جانتے ہو؟
وہ جھاڑا پھونگی کرتے ہیں، نہ تعویذ گنڈا۔ کوئی بچپس
برس ہوئے جب انہوں نے اس مدتوں کی غیر آباد
مسجد میں ڈیرا بھایا تو دس یا چھ ہی دن میں وہ شہرت

جائے کو کون تیرنا سکھائے۔ اگرچہ محبوب نے نہ باقاعدہ گانا سیکھا تھا، نہ بجانا لیکن اس کی گھٹی میں تو یہی چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ استاد نہ سہی امیر خاں کا بیٹا سمجھ کر سب اُس کی خاطر کرتے۔ ہر مزی ایک طوائف اُس کے باپ کی شاگرد تھی۔ رنڈیاں عمر سے اتر کر عموماً مرد پرست ہو جاتی ہیں۔ محبوب کا اُلٹا شباب تھا۔ اُس کی جو نظر پڑی، بلا میں لینے لگی، محبوب کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اچھے سے اچھا کھلاتی اور کپڑے لٹے سے ایسا بنا سنوار کر رکھتی کہ نوچیاں تک جلتے لگیں۔

ادھیر عمر کا اٹھتی جوانی سے کیا میل۔ اُدھر تو محبوب کو قدرتی طور پر ہر مزی کی لگاؤٹ بازیاں پسند نہ تھیں، اُدھر بندی جو ہر مزی کی لے پالک تھی۔ وہ بچ میں آکودی۔ محبوب اور بندی میں وہ سہاگ بڑھا کہ بی ہر مزی جان آخر صبر نہ کر سکیں۔ پہلے تو دونوں کو الگ الگ اپنے اپنے طریق پر سمجھایا جب سمجھانے سے کام نہ بنا تو ایک دن چوہے میں سے جلا ہوا سوختہ نکال لائی اور بندی سے کہنے لگی تو بہ کر، نہیں تو تیری جوانی کو ابھی آگ لگائے دیتی ہوں۔

محبوب اس وقت تھا نہیں۔ بندی بے چاری نے ڈر کر توبہ کر لی محبوب آیا تو اسے بھی آنکھیں دکھائیں۔ محبوب اور بندی میں پہلے ہی سے صلاح مشورے ہو چکے تھے۔ اسی رات موقع پا کر دونوں نکل بھاگے قطب صاحب میں جا کر دونوں نے پناہ لی۔ ہر مزی نے صبح اٹھتے ہی شور مچا دیا۔ کوتوالی پہنچی رہٹ لکھوائی کہ محبوب میرا نوکر میری بیٹی بندی کو پانچ ہزار روپے کے دیورات کے ساتھ بھاگ لے گیا ہے۔

پولیس والے رنڈیوں کے ایسے معاملات میں رقیں چرنے کے سوا کبھی کچھ نہیں کرتے چنانچہ نہایت معمولی تفتیش کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہر مزی روپیٹ کر بیٹھ رہی اور وہ دونوں مہرولی میں

وہاں جن دکھائی دیتے تھے۔ ایسی جگہ کوئی آکر ٹھہرتا اور سلامت رہتا تو اس کے کال ہونے میں کیا شک ہو سکتا تھا لیکن حاجی صاحب نے ایک کو منہ نہیں لگایا۔ اول تو کسی سے بات ہی نہ کرتے پھر اگر کوئی زیادہ سر ہوتا تو وضو کر، نماز پڑھنے لگتے یا کہیں نکل جاتے اس لیے رفتہ رفتہ آنے والوں نے بے فیض سمجھ کر اُن کے پاس آنا چھوڑ دیا اور یہ جب تک زندہ رہے خدا کی یاد کے سوا کسی نے کبھی کوئی حقل کرتے نہیں دیکھا۔ کھانے پینے کا سامان تھا؟ اس کا بھی کسی کو پتہ نہیں چلا۔ کب مرے؟ اس کی خبر نہیں۔ ہاں کئی برس ہوئے مسجد کے محن میں ایک پختہ قبر بنی ہوئی ضرور دیکھی گئی کہ پہلے نہ تھی۔ قبر حاجی صاحب کی ہے یا کسی اور کی، اور اگر انہی کی ہے تو کس نے دفن کیا؟ خدا ہی خوب جاننے والا ہے۔

اچھا تو یہ حاجی صاحب کون تھے؟ ڈوم بیچے، چاندنی محل کے رہنے والے، محبوب نام تھا۔ امیر خاں قوال کا بیٹا۔ امیر خاں کی جوانی تو رنڈیوں کی استاد میں گزری چکنا چڑا سا نولا سلوانا ک نقتے کا درست لڑکا تھا۔ آواز میں بھنہری تھی، گلے کے ساتھ آنکھیں کچھ اس طرح چلتیں کہ صوفیوں کی رال ٹپکنے لگتی یہاں تک کہ تھوڑے ہی دن میں محبوب صوفیوں کا ایمان مشہور ہو گیا۔

محبوب کی عمر کوئی چودہ پندرہ برس کی ہو گی کہ امیر خاں کا انتقال ہو گیا۔ قوالوں کی دوسری چوکیوں نے اسے اپنے ساتھ ملانا چاہا اور یہ دوسرے کے قریب کئی چوکیوں کے ساتھ عرسوں میں جاتا بھی رہا لیکن اسے بہت جلد ان صوفیوں سے نفرت ہی ہو گئی۔ جس کو حال آتا، وہ اچھلتا ناچتا اسی پر آگرتا۔ آخر ان داڑھیوں کے ہجوم سے نکل کر اس نے طوائفوں کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ ہر جگہ پہنچے سارے عموماً اسی کے بھائی بند تھے۔ پھر وہ جو کہتے ہیں کہ مچھلی کے

چرا۔ یہ پر چھوڑ کر کہیں چلا جائے گا اور گھر کے دھندوں میں۔ ا۔ ی۔

اگر طبیعت میں ٹھوٹ نہیں اور دل کا آئینہ صاف ہے تو دوسرے کی صورت کچھ دھندلی نظر آتی۔ بندی نے چونکہ محبوب کے ساتھ اب تک کسی قسم کی بے وفائی یا محبت میں کوتاہی نہیں کی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ وہ بھی میری ناقدری نہیں کرے گا اور درحقیقت محبوب کے خیالات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے سوا کہ وہ کبھی کبھی یہ سوچا کرتا کہ آئندہ زندگی بسر کرنے کے لیے کیا تدبیر کرنی چاہیے؟ اسی سلسلے میں بعض اوقات اس کی طبیعت میں غلجان سا پیدا ہو جاتا۔ جس دن سے کل ہر مری کا واقعہ ہوا تھا اس کے مزاج کی کیفیت برآمد ہوتی جارہی تھی چنانچہ اب اس کے جذبات کچھ اور ہو گئے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ یا تو نکاح ہو جائے یا بالکل علیحدگی۔

محبوب پڑھا لکھا نہ تھا نہ اسے پڑھے لکھوں کی صحبت میسر آتی تھی تاہم اس کے جذبات اچھے تھے۔ آج جو بندی سے جھڑپ ہوئی اور اپنی تلخ بات کے جواب میں اس کی نیت کا حال معلوم ہوا تو وہ فوراً بستی کے قاضی صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ قاضی صاحب غیر معمولی ٹیک آدی تھے۔ پڑوس میں رہنے کے سبب محبوب سے اُن کی جان پہچان بھی تھی۔ عرسوں کے موقعوں پر اسے گاتے بھی سنا تھا۔ پوچھنے لگے ”کیوں میاں اکس لیے تکلیف کی؟“

محبوب نے ساری داستان کہہ سنائی اور درحضورت کی کہ ”آپ ہم دونوں کا نکاح پڑھا دیں“ قاضی جی بڑی خوشی سے تیار ہو گئے اور کہا کہ ”جاؤ اس کو بھی نہلاؤ، آپ بھی نہلاؤ، پاک کپڑے پہنو، میں ابھی آتا ہوں۔“

قصہ مختصر یہ کہ سر کے بعد قاضی صاحب نے آکر پہلے دونوں سے توبہ کرائی، گناہوں سے بچنے،

چھپے مزے اڑایا کیے۔

مہرولی کی بستی میں آئے پورے بارہ مہینے ہو گئے تھے۔ بندی ایک پوٹلی میں کچھ زیور ضرور لائی تھی لیکن خالی بیٹھے بیٹھے قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جائے۔ دوسرے چونکہ ابھی ان دونوں میں میاں بیوی کا پکارشتہ قائم نہیں ہوا تھا جو آئندہ زندگی بسر کرنے کے لیے کوئی دھندالے کر بیٹھے اس لیے دونوں وقت اچھا کھاتے اور گھر کے اندر ہی پڑے پڑے ملہا رہا کرتے رہے۔

اتفاق یہ ہوا کہ ان دنوں میں ایک روز رٹری کو کسی نہ کر دیا۔ محبوب اور بندی نا سمجھ بچے تو تھے نہیں جو اس واردات کو اس کان سننے اور اس کان اڑا دیتے۔ دونوں سوچ میں پڑ گئے کہ ہماری حرام کاری کا انجام دیکھیے کیا ہوتا ہے کیونکہ جوں جوں رقم کم ہوتی جاتی تھی اور ساتھ ہی عیش سے دل بھرتا جاتا تھا۔ ایک کو دوسرے کے ساتھ دلچسپی کم ہوتی جاتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن یوں ہی ذرا سی بات پر کھٹ پٹ ہونے لگی۔ آخر ایک دن محبوب نے کہا ”دیکھو بی! اس رات دن کے کھولنے اور چلانے سے کیا فائدہ، میرے ساتھ نباہ نہیں کر سکتیں تو اپنا رستہ لو۔“

بندی بولی ”میاں! ہوش کی دوا لؤ اندر باہر سے لوٹ کر اب رستہ دکھاتے ہو مجھے نباہ نہ کرنا ہوتا تو تمہارے ساتھ آتی کیوں۔ تم اپنی کھڑبھی دوزخ کے دروازے میں دھکیل کر اگر تمہیں کہیں جنت مل جائے تو شوق سے میرا پاپ کاٹ دو۔“

محبوب کی فطرت بُری نہ تھی۔ بندی کی ان باتوں سے اُس پر بڑا اثر ہوا اور کچھ کہے سے بغیر باہر نکل گیا۔ بندی کچھ اور سمجھی لیکن خود بخود اسے ایک قسم کی تسکین سی ہوئی کہ محبوب ایسا بے مروت نہیں۔ میں نے اسے کیا دکھ دیا ہے جو وہ مجھے اس طرح

بن گیا۔ اللہ کی شان ہے، ایک ڈوم بچے کی کیا کایا پلٹ ہوتی ہیں یہ الفاظ صرف اُس کے منہ سے نکلا کرتے تھے کیسی نماز کیسا روزہ، اور اب مسجد کے سوا کہیں اس کا دل ہی نہ لگتا تھا۔ اُن جان آدمی یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ محبوب سدا کار نمازی نہیں۔ جو دیکھتا، یہی جانتا کہ کسی اچھے نمازی گھر کا لڑکا ہے۔ اسی طرح بندی کا بھی خدا نے یکا یک ایسا دل پھیرا کہ رٹھی پتا اس میں نام کو نہیں رہا۔ بننے سنورنے کے سارے جذبات فنا ہو گئے۔ معشوقانہ انداز جن کی تعلیم اس نے برسوں پائی تھی سب چرے اور چکی میں صرف ہونے لگے۔ اندھیرے سے اٹھ کر چکی عیسیٰ پھر کھانے پکانے سے فارغ ہو کر چرخا کاتی۔ ہاتھوں میں گئے پڑ گئے تھے لیکن اس کی زبان سے کبھی نہ خدا کی شکایت سنی نہ قسمت کا گلہ۔ نہ اس نے ہنسی مذاق کے طور پر بھی محبوب سے یہ کہا کہ تمہارے ساتھ آ کر تو میری تقدیر پھوٹ گئی، وہاں رہتی تو نہ جانے کیسی کیسی میری ناز برداریاں ہوتیں۔ چاہنے والے مجھے آنکھوں پر بٹھاتے، عطر میں نہانی، سونے کا نوالہ کھاتی، بلکہ جب پایا گن اپنے حال میں خوش۔ مذہب سے البتہ اسے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اڈل معلوم نہیں کہ کس کی لڑکی تھی، دوسرے جس گھر میں پلی بڑھی وہاں دین ایمان کا کیا کام۔ شراب کباب، گانے اور حرام کاری کی باتوں کے سوا نماز روزے وغیرہ کا ذکر بھولے سے بھی آ جاتا ہوگا۔

محبوب کے ساتھ بھانجے تک بندی صرف اتنا جانتی تھی کہ میں مسلمان ہوں۔ کلمہ بھی اسے یاد تھا۔ مہرولی میں آنے کے بعد روزے نماز اور اسی قسم کے دو چار دوسرے فرائض بھی اس نے پاس پڑوس کی عورتوں سے سن لیے تھے لیکن اب تک نہ رمضان میں ایک روزہ رکھا تھا نہ ایک وقت کی نماز

نکی کے راستے چلنے اور نماز روزے وغیرہ کی تاکید کر کے دونوں کے سر جوڑ دیئے۔ محبوب اور بندی کا نکاح ہو گیا۔ چلتے وقت قاضی جی نے یہ بھی کہا کہ جلال کی کمائی میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ گانا بجانا چھوڑ دو، کوئی اور وحدہ کرو، لوکری ڈھو کر سوکھے نکلے کھانا حرام کی آمدنی کے قورے پلاؤ سے بدرجہا بہتر ہے۔

اللہ جس کو توفیق دے قاضی جی کے کہنے کا اُن دونوں پر ایسا اثر ہوا کہ محبوب نے تو مزدوری شروع کر دی اور بندی بہتی میں جانی اور چکی عیسیٰ۔ ساتھ ہی محبوب کو نماز کی بھی لوگ مگنی۔ نماز آتی نہ تھی، قاضی جی سے پانچ سات دن میں سیکھ لی اور اب وہ پانچوں وقت مسجد میں دکھائی دینے لگا۔

لیکن مہرولی کی بہتی دلی کے قریب تھی، اس کے علاوہ حضرت قلب صاحب کا حزار شریف، رٹھیاں ڈوم صوفی برابر آتے رہتے کچھ تو شرم کہ کسی نے مزدوری کرتے دیکھ لیا تو کیا کہے گا، کچھ یہ ڈر کہ کسی کی اگر نظر پڑ گئی تو پکڑا نہ دے اس لیے مصلحت یہ سمجھی کہ کسی ایسی جگہ چل کر رہنا چاہیے جہاں جاننے پہچاننے والا کوئی نہ ہو۔ صلاح کر کے دونوں اپنا پور یا بستر سمیٹ بلب گڑھ روانہ ہو گئے۔ بلب گڑھ پہنچ کر سرائے میں اترے پھر مکان تلاش کیا۔ مکان کے بعد ایک چرخا اور چکی خریدی۔ بندی چرخا کاتی چکی عیسیٰ اور محبوب بھی ادھر ادھر سے مزدوری کر کے کچھ نہ کچھ کمالاتا۔ پیٹ بھرنے کے لیے اس سے زیادہ کیا چاہیے۔

اتفاق سے مکان کے برابر ہی شہر کی بڑی مسجد تھی۔ محبوب ہر نماز کے وقت سویرے سے جا بیٹھتا اور اللہ اللہ کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ اذان بھی دینے لگا۔ آواز سریلی اور گلا لوج دار تھا۔ لوگ اس کی اذان کے مزے لینے لگے اور کچھ دن بعد وہ باقاعدہ موزن

ایمان افراد عقل پرور عمل آفرین

سیارہ ڈائجسٹ
کا عظیم الشان

قارئین کے اصرار
اور مانگ کے تحت دس
سال کے بعد نیا ایڈیشن
شائع ہو گیا ہے۔

قرآن مجید

- ☆ دائمی اہمیت اور افادیت کا حامل ☆ ایک متاع بے بہا
 - ☆ ایک دستاویز ☆ اعلیٰ رنگین طباعت
 - ☆ ضخامت 1500 صفحات ☆ تین جلدوں میں
- اپنی خدمات، مصنوعات کا اشتہار جلد جاری فرمائیں

عمل
پیت 525/-

قارئین کرام براہ راست بذریعہ منی آرڈر یا وی پی قرآن نمبر منگوا سکتے ہیں

سیارہ ڈائجسٹ 240 ملین مارکیٹ ریواز گارڈن، لاہور۔

فون: 042-37245412

بندی ”تم نے کبھی مجھ سے نماز کے لیے کیوں نہیں کہا؟“
 محبوب ”میں نے تو نکاح کرنے کو بھی تم سے نہیں کہا تھا۔“
 بندی ”اے واہ کیا کہنا میں ہی تو قاضی کو بلا کر لائی تھی۔“

محبوب ”تم! کیا تمہیں گناہوں سے بچا لیا۔“
 بندی ”میں کب کہتی ہوں لیکن دوزخ کے دروازے کا ایک پتہ بند کر کے دوسرا تو کھلا رکھا۔“
 محبوب ”ایک پتہ اگر میں نے بند کر دیا تھا تو دوسرا تم بند کرتیں۔“
 بندی ”مجھے بند کرنے کی ترکیب تو بتائی ہوتی، ایک دفعہ تو نماز پڑھنے کو کہا ہوتا۔“
 محبوب ”ایک دفعہ نہیں، دن میں پانچ مرتبہ کہتا ہوں۔“

بندی ”کیوں جھوٹ بولتے ہو؟“
 محبوب ”جھوٹ نہیں بولتا منہ سے نماز پڑھنے کو نہیں کہتا مگر تمہیں جتنا کر نماز پڑھنے جاتا ہوں تاکہ تمہیں بھی نماز کا خیال آجائے اب تم نہ سمجھو تو اس کا کیا علاج۔“

بندی نے شرما کر آنکھیں نیچے کر لیں اور محبوب کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر کہا ”اچھا اب مجھے نماز سکھا دو۔ کتنے دن میں آجائے گی۔“

محبوب ”نماز کوئی گانا بجانا تو ہے نہیں کہ برسوں سے کھو پھر بھی کسر رہ جائے۔ اس سے آسان کون سی بات ہوگی۔ اللہ شوق دے تو دو چار دن میں نماز سیکھ سکتی ہو۔ قرآن کی دس پانچ چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کر لو اور بس۔“

بندی نے اسی وقت سے نماز میں جو پڑھا جاتا ہے یاد کرنا شروع کر دیا۔ حافظہ اچھا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس قابل ہو گئی کہ اپنی جہیں عبودیت

پڑھی تھی۔ پڑھتی کس طرح؟ نہ وضو کرنا آتا تھا، نہ یہ کہ نماز میں کیا پڑھتے ہیں۔ محبوب کو روزانہ اپنے ساتھ اٹھتا دیکھتی۔ مسجد سے اس کی زبان سنتی اور مزے لیتی۔ بہت دل چاہتا کہ خود بھی نماز پڑھے، دل مسوس کر رہ جاتی۔

اس طرح پورا سال گزر گیا۔ محبوب اب پکا نمازی تھا۔ کچھ بھی حال ہوتا کیسی ہی سروری پڑتی یا گرمی، آندھی چلتی یا مینہ برستا، وہ سارے نمازیوں سے پہلے مسجد میں جا پہنچتا۔ محبوب کے اس رنگ کا آخر بندی پر اثر پڑنا تھا اور پڑا۔ خدا کو کب تک بھولی رہتی۔ شوہر نماز کا اتنا پابند اور بیوی اتنی آزاد۔ ناممکن سی بات تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے دل میں بھی نماز کا شوق پیدا ہوا۔ ایک روز عشاء کی نماز پڑھ کر جو محبوب گھر میں آیا تو بندی کہنے لگی ”اب تو تم ملا جی ہو گئے ہو۔ ایک بات پوچھتی ہوں، بتاؤ گے؟“

محبوب ”نیک بخت! ملاؤں کے تو بڑے درجے ہیں، چار ٹکریں مارنے سے کوئی ملا تھوڑی بین جاتا ہے مگر خیر تم کیا پوچھتی ہو، پوچھو، مجھے نہیں معلوم ہوگا تو کسی دوسرے سے پوچھ کر بتا دوں گا۔“

بندی ”میں یہ پوچھتی ہوں کہ کیا عورت ذات کو نماز معاف ہے؟“

محبوب ”نماز تو کسی کو معاف نہیں، عورت ہو یا مرد۔“

بندی ”پڑوس والی سیدانی کہتی تھی کہ شادی ہونے کے بعد عورت کی نیکی بدی کا ذمہ دار مرد ہوتا ہے۔“

محبوب ”میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں؟“

بندی ”جب تک ہم تم آشکار ہے اس کو جانے دو جیسی میں تھی، ویسے تم تھے مگر نکاح کے بعد بھی تم نے تو مجھے ویسا ہی سمجھ رکھا ہے۔“

محبوب ”بات کیا ہے کل کر کیوں نہیں کہیں۔“

کرمولوی صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔ اُن کی باتوں میں شیرینی اور آنکھوں میں عجیب طرح کی کشش تھی۔ محبوب کے لیے ان سے بڑھ کر بھر نہ تھا جھٹ مرید ہو گیا اور بیوی کو بھی مرید کرا دیا۔ عورت اس معاملے میں مردوں سے بہت زیادہ خوش اعتقاد ہوتی ہے۔ بندی جو اپنے آپ کو گنہگار سمجھتی تھی بند کی خدمت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگی۔ بندوں کو ایسے ہی مرید چاہئیں۔ مولانا نے بھی پاؤں پھیلا دیئے۔ جس دن کہیں دعوت نہ ہوتی محبوب کے ہاں کھانا تناول فرماتے۔ بندی بڑے شوق اور محبت سے ان کے لیے کھانا پکاتی۔ اگر خود کو کھاتی تو انہیں گیسوں کھلاتی۔ آپ جیل میں گزر کرتی تو بند کی خاطر کھی منگاتی۔

کوئی پندرہ سولہ دن بعد مولانا اپنا کام کر کے چلے گئے تو جتنا محبوب اور بندی کو اُن کی جدائی کا صدمہ تھا بستی بھر میں شاید کسی کو نہ ہوگا۔ رات کو جب آخری دعوت کا کھانا دونوں میاں بیوی کھلا رہے تھے تو محبوب نے بڑی عاجزی سے کہا۔ حضور! حج کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو ہمارے حالات تو معلوم ہی ہیں۔ ہمارے گناہوں کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ کیا تعجب ہے کہ وہ اپنے گھر کا طواف کرتے دیکھ کر ہماری خطاؤں سے چشم پوشی کرے۔

پھر صاحب ”بڑا مبارک خیال ہے لیکن تمہارا روپیہ تو گندہ نہیں؟“

محبوب ”میری بیوی نے جکی پیس نہیں کر اور چرخا کات کات کر کئی برس میں سو روپے جمع کیے ہیں۔ اگر اچھے میں کام ہو جائے تو خدا کے لیے مجھے کسی کے ساتھ کرو بیچے کہ میں نبی جی کے روئے کی زیارت کراؤں۔“

وقت کی بات ہے اور بچے شوق کا اثر محبوب نے یہ فقرے کچھ ایسے موثر لہجے میں کہے کہ مولوی

بارگاہ ایزدی میں جھکا سکے۔

اب محبوب کی اذان میں پہلے سے زیادہ حقانی سر لگنے لگے۔ جب وہ اذان دینے کھڑا ہوتا تو اس کے دماغ کی عجیب کیفیت ہوتی یہ تصور اُس کے اندر کچھ اور لطف پیدا کر دیتا کہ بندی بھی چرخا چھوڑ کر وضو کے لیے کھڑی ہو گئی ہوگی۔ بندی کو بھی اذان کی آواز سننے ہی کام میں مزہ نہ آتا۔ یوں تو جکی پیسے کی غرض سے وہ سورج نکلنے سے گھنٹے دو گھنٹے پہلے ہی اٹھ بیٹھتی تھی دوسرا آٹا پیس چکتی تو سورج نکلتا اور اس میں اسے خاص قسم کی مسرت محسوس ہوتی لیکن وہ مسرت اور اطمینان کچھ اور ہی تھا جو پہلے دن صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے اپنے قلب و دماغ کے اندر پایا۔

گندگی سے نکل کر پاکیزگی کے ساتھ رہتے سہتے کئی برس ہو گئے تھے۔ محبوب بھی اپنی اس حالت میں خوش تھا اور بندی بھی ایسی نہال کہ کسی نواب کے محل میں جا کر بھی شاید یہ اطمینان اور مسرت کی زندگی میسر نہ آتی۔

مردوری کے سلسلے میں ایک مرتبہ صبح سے چار بجے تک کے لیے محبوب کو قریب کے کسی گاؤں میں جانا پڑا۔ واپس آ کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک سفید لمبی داڑھی والے بزرگ مسجد میں رونق افروز ہیں۔ مولوی قسم کے پردیسی عالم اس مسجد میں ٹھہرا کرتے تھے۔ گریبان شرعی تحصیل داروں کا یہ ڈاک بٹلا تھا۔ مولوی صاحب کی ظاہری صورت اور وضع نہایت حبرک تھی۔ تقریر بھی ایسی دلچسپ اور وقت کے لحاظ سے اس قدر برجستہ اور موزوں کرتے کہ دیہاتی مسلمان اُن کا کلمہ پڑھنے لگتے۔ مولانا کے عقلموں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو دن میں دو دو بار لوگ بلا کر لے جاتے۔ اس اثناء میں محبوب تو ان کی صورت کا ایسا دیوانہ ہو گیا کہ سارے کام چھوڑ

دھنوں اور چھری مریدی کے ڈھکوسلوں پر۔ اس وقت میرے پاس کئی ہزار روپے نقد موجود ہیں، ذاتی مکان بھی رہنے کو ہے لیکن میرے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہ آیا۔ آہ جس کے نام سے دنیا کو دھوکا دیتا پھرتا ہوں اس کی راہ میں ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔ بے شک محبوب، بے شک۔ روپے کا جو مصرف تم نے تجویز کیا ہے وہ سب سے بہتر ہے۔ مولوی صاحب پر اتنا کہنے کے بعد ایک خاص حالت طاری ہوگئی۔ وہ دیر تک اپنی گندم نمائی اور جو فروشی کے تصور میں سر دھنتے اور اٹک ندامت بہاتے رہے۔ محبوب بھی اُن کے ساتھ رہتا رہا۔ تھوڑی دیر میں جب مولوی صاحب کی رقت کم ہوئی تو انہوں نے اپنی آنکھیں پونچھ کر فرمایا۔ میاں محبوب! میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ تم جیسا مرید ملا اور میں نے وہ راہ دیکھی جس سے آج تک بھٹکتا پھرتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ دو چار دورے اور لگا کر پندرہ ہزار کرلوں تو سو روپے ماہوار کی جائیداد خریدی جاسکتی ہے اور پھر میں بڑے عیش و آرام سے زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ چھری مریدی کا سلسلہ الگ رہے گا۔ حیف دنیا کی یہ ساری باتیں سوچیں لیکن دین کا ایک کام نہ کیا۔ کما تے کما تے عمر گزر گئی اور پیٹ نہ بھرا میں بارہ مہینے گشت کرتا ہوں اور نیت یہ ہوتی ہے کہ اپنی وضع قطع اور چرب زبانی سے خدا کی بھولی بھالی مخلوق کو مغالہ دوں اور جس داؤ سے ہاتھ لگے، اُن سے روپیہ وصول کر، اپنی پونجی بڑھاؤں۔ کہیں مسجد کے نام سے چندہ کرتا ہوں، کہیں اسلامی و دینی مدرسہ کا مہتمم یا یتیم خانے کا منتظم بن کر لوگوں کی جیبیں کاٹتا ہوں۔ فکر ہے کہ آج میری خدا کے ساتھ فریب کاری ختم ہوگئی۔ تم نے مجھے خواب غفلت سے چو لکا دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ انسان کو کس راہ پر چلنا چاہیے۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ تم میرے

سیلز منیجر

بیرہ کمپنی میں ایک ڈبلا پتلا، شرمیلا نوجوان داخل ہوا۔ وہ سیدھا سیلز منیجر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ منیجر کے قریب جا کر اس نے کہا ”جناب آپ بیرہ پالیسی لینا تو پسند نہیں کریں گے۔“ ”نہیں“ سیلز منیجر کا کراخت آواز گونجی ”قلبی نہیں پر خوردار۔“

”جی مجھے یہی یقین تھا“ نوجوان نے سہم کر جواب دیا اور مایوسانہ انداز میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

”ٹھہرو“ سیلز منیجر نے کہا ”میری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے تم جیسا گیا گزرا سیلز من میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ لاؤ فارم دو۔ میں پانچ لاکھ روپے کی پالیسی پر دستخط کرتا ہوں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ تمہاری حوصلہ افزائی ہو اور تم ایک اچھے سیلز من بن سکو۔“ فارم پر دستخط کرنے کے بعد سیلز منیجر نے اسے سمجھایا ”پالیسی فروخت کرنے کے لیے تمہیں چند اچھے طریقے سیکھ کر انہیں شخصیت کے اعتبار سے استعمال کرنا چاہیے۔“

”بہتر ہے جناب“ نوجوان نے کہا ”مجھے وہ طریقے آتے ہیں جو طریقہ میں نے آپ پر استعمال کیا ہے یہ صرف سیلز منیجر کے لیے مخصوص ہے۔“

صاحب کی آنکھوں میں جھج جھج کے آنسو بھر آئے۔ رانوں پر ہاتھ مار کر ایک لمبی سانس لی اور کہنے لگے ”محبوب، تمہاری روح بڑی سچید ہے اور واقعی تم خدا کے محبوب بندے ہو، تمہارے پاس صرف سو روپے ہیں اور تم نے ان کو حج کے سفر کی نذر کر دینے کی ہمت کی۔ شاہاں صدر حمت۔ افسوس ہے میری حالت پر اور لعنت ہے میرے جھوٹے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



باندھ کر اپنی کے لیے سوار ہو گئے۔ پھر صاحب کے جانے والے یہاں بھی تھے کئی روز تک دعوتیں رہیں، دعوتیں ختم ہو گئیں تو رواجی کا انتظام شروع ہوا۔ پھر صاحب پڑھے لکھے نہایت تیز طرار اور جہاں دیدہ آدمی تھے۔ سفر میں ایسے ہی انسان آرام اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے بڑی سہولت کے ساتھ سارا بندوبست کر لیا۔ ٹکٹ خریدنا، پاسپورٹ حاصل کرنا، ضروری سامان کی بھم رسائی۔ یہ سب پھر صاحب کے سپرد تھا۔ محبوب تو صرف اسباب کی نگرانی کیا کرتا۔

جہاز حاجیوں کو لے کر چلا تو پھر صاحب سرزمین وطن دفعہ چھوٹنے سے اور سمندر کی موجیں دیکھ کر بہت پریشان اور افسردہ خاطر تھے لیکن محبوب کی خوشی کا کیا پوچھنا۔ اس کے قلب پر خانہ کعبہ اور روضہ رسول پاک کی کشش اس قدر غالب تھی کہ جہاز جتنی دُور نکلتا جاتا اسی قدر اسے زیادہ خوشی محسوس ہوتی۔ سمندر کی موجوں میں وہ تسکین قلب کے عجیب و غریب ترانے سنتا۔ اسے ہر لمحے اپنے سینے کے اندر ایک خاص قسم کا جذبہ بڑھتا معلوم ہوتا۔ تیسرا دن تھا صبح کی نماز پڑھ کر مرید اور پھر دونوں بیٹھے تھے کہ محبوب نے پھر صاحب کو مخاطب کیا۔ ”پھر صاحب! بندی کے نہ آنے کا بڑا قلق ہے، کیا کروں اتنا روپیہ نہ تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ حج کرتے۔ میں نے تو کہا بھی کہ اب کے نہ سبکی پارہ مہینے اور دل لگا کر محنت کر لیں لیکن اس نے نہ مانا کہ روپے کے انتظار میں دوسرے سال پر اپنا ارادہ ٹال دوں۔ کہنے لگی، دعویٰ کا کیا اعتبار ہے، تم کسی بات کا خیال نہ کرو اگر میرے نصیب میں حج ہوگا تو اگلے سال ہم دونوں چلیں گے، تم مجھے حج کرا لانا۔“

پھر صاحب بولے ”تم کڑھو نہیں۔ ایک حج کا ثواب اب بھی اُسے مل جائے گا۔ اس نے تمہیں حج کرایا ہے۔ خدا تو فیق دے تو اگلے برس تم اسے حج

مرید نہیں، پھر ہو۔ میں تمہارا صرف ممنون ہی نہیں بلکہ تم کو اپنا مرشد ہادی اور نجات دہندہ سمجھوں گا۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ اگر میں حج کو جاؤں تو تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں۔“

محبوب (بے تابگی کے ساتھ) ”تو پھر حضور کا کب ارادہ ہے؟“

پھر صاحب ”اسی سال انشاء اللہ جن آنکھوں کو تم نے کھولا ہے وہ کیا اب گنبد خضرا دیکھے بغیر بند ہو سکتی ہیں۔“ محبوب ”یہ شب رات کا مہینہ ہے رمضان گزرتے ہی چلنا چاہیے۔“

پھر صاحب ”شبِ برات اور رمضان کیا۔ تم تو میرے ساتھ ابھی سے ہو لو اپنے سودے پے بیوی کے واسطے چھوڑ دو۔ میں اتنا روپیہ لے چلوں گا جو ہم دونوں کے لیے کافی ہوگا۔“

محبوب ”نہیں قبلہ میری نیت ڈالو اڈول نہ فرمائیے حضور کے صدقے میں حج ہو جائے گا یہی میرے لیے بڑی دولت ہے۔ یہ روپیہ تو میں اپنے ساتھ ہی لے چلوں گا۔ میں مزدوری بھی کر سکتا ہوں اور اگر ضرورت ہوئی تو محنت کر کے گزارا کر لوں گا۔“

بندی ”واہ مولوی صاحب واہ! آپ مجھے ثواب سے محروم کرتے ہیں۔ میں حج کو نہیں جاسکتی تو اسی طرح مجھ کو حج میں شریک ہونے دیجئے۔“

مولوی صاحب پر بندی کے اس کہنے کا بڑا اثر ہوا۔ حقیقت میں جب ایک گنہگار نیکی کے راستے پر آتا ہے تو اس کی ساری ادائیں نرالی ہوتی ہیں۔ اس کی صداقت، اس کے جذبات اُس کی نیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تاہم اُن دونوں میاں بیوی کی غربت کا خیال کر کے بہت اصرار کیا اور طرح طرح سمجھایا مگر محبوب نے مولوی صاحب کی نقد امداد منظور نہیں کی۔

عید کے چوتھے دن پھر اور مرید اسباب سفر

کرادینا۔

یوں تو کراچی سے روانہ ہوتے ہی پیر صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ مٹی قے نے پہلے ستایا۔ پھر بخار آ گیا اور اس کے بعد تو یکا یک اُن کی حالت ایسی بگڑی کہ زیادہ بات بھی نہ کر سکے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

دورانِ علالت محبوب نے پیر صاحب کی حد سے زیادہ خدمت کی۔ خدمت کے علاوہ اُن کی صحت کے لیے دعائیں بھی مانگیں مگر جب وقت آ جاتا ہے تو دوا دُعا سے کچھ نہیں ہوتا۔ پیر صاحب اچھی پکی عمر کے آدمی تھے۔ اختلاف آب و ہوا کے اثرات ایسی بُری طرح اُن پر پڑے کہ عدل پہنچنے پہنچنے حالت بالکل ردی ہو گئی۔ جہاں بری کی کوئی امید نہ تھی۔

جس رات پیر صاحب کا انتقال ہوا شام کے وقت محبوب اُن کے پاؤں سہلا رہا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔ دوا پلانے کی غرض سے محبوب نے انہیں آواز دی۔ پیر صاحب نے آنکھیں کھول کر اپنے مرید کو دیکھا۔ محبوب ”حضور دوا پی لیجئے۔“

پیر صاحب ”دوا نہیں اسے پھینک دو“ (چند منٹ خاموش رہنے کے بعد)۔ محبوب میں بڑا بد نصیب انسان ہوں تم ملے تو کب کہ عمر ختم ہو چکی۔ حج کا ارادہ بھی کیا تو اس وقت جب بقول فضے قبر میں پیر لٹک گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے یہ سعادت میری تقدیر میں نہیں لکھی..... آہ!

قسمت تو دیکھ لوٹی ہے جا کر کہاں کند

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا
قالہا چند گھنٹے کا مہمان ہوں تم گھبرانا نہیں خدا
تمہارے ساتھ ہے۔ منزل مقصود پر پہنچ کر میرے
لیے بھی دعا کرنا۔ میری ساری عمر ریا کاری میں بسر
ہوئی۔ وعظ کہے تو روٹیوں کے، پیر بنا تو جھوٹا، خدا

مُسکراہٹیں

فوجی کمانڈر ایک سارجنٹ کے ساتھ نئے بھرتی ہونے والوں کے سامنے پہنچا۔ اس نے تعارفی تقریر شروع کی۔ چند تعارفی کلمات کے بعد وہ بالوں کی حجامت کے موضوع پر آیا ”بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں“ لمبے لمبے بال والوں نے اطمینان کی سانس لی۔ کمانڈر نے کہا ”آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں مگر اُن کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ.....“۔ اُس نے اپنے سر سے ٹوپی اٹھا کر اپنی سولجر کٹ حجامت دکھائی اور سارجنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو سارجنٹ نے بھی اپنی ٹوپی اٹھائی۔ وہ گنجا تھا۔

☆

ریل میں ایک خاتون اپنے کتے کو ساتھ لے جا رہی تھیں۔ انہوں نے گارڈ سے کہا ”میں نے اس کا کٹ بھی خریدا ہے لہذا اسے بھی دوسرے مسافروں کی طرح سیٹ پر بیٹھنے کا حق ہے۔“ ”آپ نے بجا فرمایا“ گارڈ بولا ”مگر دوسرے مسافروں کی طرح اسے بھی سیٹ پر پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

☆

ایک فضائی کہنی مسافروں سے اُن کا وزن دریافت کرتی ہے۔ ایک بار کہنی کی خاتون کلرک نے کسی مسافر سے سوال کیا ”آپ کا وزن کیا ہے جناب۔“

”کیڑوں کے ساتھ یا کیڑوں کے بغیر؟“ مسافر نے پوچھا۔ ”آپ کس طرح سفر کرنا پسند کریں گے؟“۔ جواب ملا۔

(فیاض الرحمان قادری)

ذرا سی بات

ایک شخص شام کو اپنی کھڑی پر کام کرنے بیٹھا۔ اس کی بیوی ساتھ ہی باورچی خانے میں روٹیاں پکانے لگی۔ اس شخص نے روٹیوں کی کتنی شروع کر دی۔ جب روٹیاں پک چکیں تو اس نے اپنی بیوی سے کہا ”آج تم نے آٹھ روٹیاں پکائی ہیں۔“ جب بیوی نے روٹیوں کی کتنی کی تو واقعی آٹھ تھیں۔ صبح اٹھ کر اس نے سارے گاؤں میں مشہور کر دیا کہ اس کا خاندان بہت پہنچا ہوا بزرگ ہے۔ وہ دیوار کے دوسری طرف کا حال بتا سکتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے رات والا قصبہ بھی سنایا۔ شام تک پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ وہ شخص پریشان ہو گیا کہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ گاؤں والوں نے اسے مجبور کیا کہ گاؤں کی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دے اور اسے زبردستی مسجد لے گئے۔ اس شخص نے سوچا کہ بہت اچھا موقع ہے جوئی سارے نمازی مسجد میں گئے اس نے مسجد کی کھڑکی سے باہر چلا نکلا۔ اتفاق کی بات کہ اسی وقت زلزلہ آ گیا۔ مسجد کی چھت گر گئی لوگوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ کئی نمازی شہید بھی ہو گئے۔ اب تو گاؤں والوں کا یقین پکا ہو گیا کہ زلزلے کے آنے کا اس کو پہلے سے کیسے علم ہو گیا۔ وہ شخص بھاگا جا رہا تھا اور گاؤں والے اس کو پکڑنے کیلئے دوڑتے رہے۔ بالآخر وہ کسی جنگل میں رو پڑا ہو گیا۔ بعد میں اس شخص کا کچھ پتہ نہ چلا۔

ذرا سی بات پر اس کی بیوی نے اپنا خاندان کھو دیا۔ ایسے ہی تو نہیں کہتے کہ عورتوں کے پیٹ میں بات نہیں ٹھہرتی۔

(تحریر: مرتضیٰ حسن۔ پشاور)

خدا نے محبوب کو اپنے حبیب کے صدقے میں صحیح و سلامت مکہ و معظمہ پہنچا دیا۔ نہایت خوش

اور رسول دونوں کا چہرہ تمہاری صحبت سے یہ مرض دور ہوا تھا اور تمہاری رہنمائی سے تمنا تھی کہ کعبے کا پردہ پکڑ کر تو بہ کروں گا۔ آستان نبوی کی خاک سر پر ڈال کر اس شافع محشر کے طفیل مغفرت چاہوں گا لیکن مولا کی مرضی نہیں۔ اعمال کی سیانہ شاید اتنی گہری ہے کہ سمندر میں غوطے کھانے ہیں۔ اپنا سارا سامان چھین دیتا ہوں۔ جس طرح چاہو صرف کرو۔“ یہ کہتے کہتے پیر صاحب کی زبان بند ہو گئی۔ محبوب نے بہت کوشش کی کہ پیر صاحب بولیں جہاز کے ڈاکٹر کو بھی لایا کہ کوئی دوا دیں لیکن بے سود۔ پیر صاحب کا وقت آ گیا تھا۔ اسی رات انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

محبوب کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس برس ہوگی۔ پھر جامل، ذوق و شوق اور توفیق الہی کے سوا کوئی اسے ڈھارس دلانے والا نہ تھا۔ اتنا لمبا سفر جس میں کوئی کسی کا پرسان نہیں۔ سب نفسی نفسی میں چلا گیا۔ تا تجربہ کار اور تنہا پہلے تو کسی قدر گھبرایا، دل میں ہول اٹھے لیکن پھر اس نے طبیعت مضبوط کر کے کہا، دنیا میں تنہائی سے گھبرانا اور خدا کے سوا بندوں کا سہارا ڈھونڈنا سب سے بڑی حماقت ہے اور جہاز کے کپتان کو پیر صاحب کے متعلق اطلاع دی۔

پیر صاحب کو سمندر کی گہرائیوں میں دفن کرنے کے بعد محبوب نے اُن کے سامان کا جائزہ لیا۔ ایک ٹریک کے سوا جتنی چیزیں تھیں وہ تقریباً محشر کہ تھیں۔ محبوب نے انہیں دو برابر کے حصوں میں تقسیم کر کے ایک اپنے لیے رکھ لیا اور دوسرا اللہ کے نام پر خیرات کر دیا۔ ٹریک کھول کر دیکھا تو اُس میں کپڑوں کے چھ جوڑے اور نو سو روپے تھے چنانچہ اُن کا ذاتی سامان یعنی کپڑے اور روپے اس نیت سے اپنی حفاظت میں لیے اگر زعمہ پلا تو اُن کے وارثوں کو پہنچاؤں گا۔

کتنے دن میں آجائیں گے۔ بستی کے بھی کئی آدمی حج کو گئے ہوئے تھے۔ جب تک وہ نہیں آئے اُس وقت تک تو بے چینی سے انتظار کیا لیکن جب وہ آپکے اور اُن سے پوچھ لیا اور انہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے تو نہ جہاز میں محبوب کو دیکھا نہ ریل میں، اسے ایک قسم کی مایوسی ہو گئی۔ کبھی کہ ضرور کوئی واقعہ پیش آ گیا۔ دوسرا سال آیا حاجی جانے لگے۔ پڑوس کے شیخ جی بھی چلے تو بندی نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر ان سے تاکید کی کہ ذرا محبوب کو بھی معلوم کرنا۔

لیکن دنیا میں کون کسی کا خیال کرتا ہے خاص کر ایسے بڑے ہی ہنگاموں میں شیخ واپس آئے اور بندی نے اُن سے اپنے شوہر کی نسبت پوچھا تو انہوں نے حاجی ہو کر پہلا جھوٹ یہ بولا کہ میں نے بہت تلاش کیا، محبوب کہیں دکھائی نہیں دیئے، اس میں ایک ہفتے کی مجھے دیر ہو گئی۔ اب بندی کو مایوسی سی ہونے لگی۔ دل میں طرح طرح کے دوسے آنے لگے۔ ہر سال حاجیوں کی واپسی کے وقت شوہر کا انتظار کرتی اور جب یہ سن لیتی ہے کہ حاجیوں کے آنے کا وقت نکل گیا۔ کوئی جہاز باقی نہیں رہا تو سمجھ لیتی کہ اُن کی خاک مدینہ منورہ کی خاک میں مل گئی تاہم یہ وہم ہی وہم یا قیاس ہی قیاس ہوتا۔ دل گواہی نہ دیتا۔ بلکہ جب خواب میں دیکھتی یہی دیکھتی کہ محبوب کہہ رہا ہے ”تھیراتی کیوں ہو، میں زندہ ہوں، سامان بندھا رکھا ہے جہاز کا ٹکٹ ملا اور سوار ہوا۔ سوار ہوا اور تمہارے پاس پہنچا۔“

وہاں محبوب جہاز سے اتر کر بمبئی میں داخل ہوا تو اُس کے زادراہ میں صرف اتنی گنجائش رہ گئی تھی کہ تین چار روز تک کھاپی سکے گھر تک پہنچنے کے لیے ریل کا کرایہ نہ تھا مجبوراً مزدوری کرنی پڑی اور ایک ہفتے کی سخت محنت کے بعد جب کچھ جمع ہو گیا تو آگے چلا پھر بھی بلب گڑھ کا پورا ٹکٹ نہ لے سکا۔

اعتقادی اور سچے جوش کے ساتھ اُس نے مسالک حج ادا کیے۔ ہر جگہ پیر صاحب کے لیے دعائیں مانگیں۔ حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ روضہ اطہر کے دیدار سے اپنی آنکھیں منور کیں۔ یہاں آتے آتے اُس کا سرمایہ ختم ہو چکا تھا۔ پیر صاحب کی پوری رقم اُس کے پاس تھی جس کا علم کسی کو نہ تھا۔ اگر وہ چاہتا تو ضرورت کے مطابق بطور قرض حنہ لے لیتا۔ مگر آ کر رقم پوری کر لیتا مگر ایک امانت کو اس نے ہاتھ لگانا کسی نیت سے سبھی، حرام سمجھا اور ادھر ادھر چل پھر کر ایک دکان پر ملازمت کر لی اور اس طرح وقت گزاری کے ساتھ فیسی مدد کا انتظار کرنے لگا۔

حاجیوں کی واپسی کا وقت آ گیا۔ قافلے روانہ ہونے لگے۔ محبوب کے پاس کچھ نہ تھا کہ وہ بھی گھر کا رخ کرتا محبوب کو محبوب رب العالمین کی گلی میں کچھ ایسی راحت ملنے لگی کہ وطن کی یاد اُس کے دل سے جاتی رہی۔

پورے پانچ برس محبوب مدینہ منورہ میں مقیم رہا۔ اس عرصے میں اُس نے لوکریاں بھی کیں اور مزدوری بھی۔ پیار بھی رہا اور تن درست بھی، تکلیفیں بھی جھیلیں اور راحتیں بھی پائیں اسے سخت ضرورتیں بھی پیش آئیں لیکن اللہ نے اسے ایسی استقامت عطا فرمائی تھی کہ پیر صاحب کے روپے پر کبھی بھولے سے بھی لپٹائی ہوئی نظر تک نہ ڈالی۔ آخر بندی کی کشش اور دعاؤں کے اثر سے محنت مزدوری کے صدقے میں اتنی رقم بڑھ گئی کہ شتم و شتم وطن پہنچ جائے۔ اب کچھ دن قافلے کا انتظار کیا اور ایک دن واپسی کے قصد سے ارض بظاہر کو نہایت رنج و ملال کے ساتھ الوداع کیا۔

ادھر بندی نے پہلے سال تو بڑی خوشی سے انتظار کیا۔ روز محلے والوں سے پوچھتی رہتی کہ حاجی

سیارہ ڈائجسٹ کی حسب روایت ایک اور عظیم پیشکش

شائع
ہو گیا
ہے۔

والدین نمبر

● ایک تاریخی دستاویز جو انشاء اللہ یقیناً ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کا ذریعہ بنے گی۔

● جس میں قرآن اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں:

● والدین کے فضائل، آداب، حقوق، فرائض اور ان کے شایان شان مستند مواد اور محکم استنباط پر مبنی واقعات اور دیگر مواد کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

قیمت: 160 روپے

ہر گھر میں پیار و محبت
کی تحریک کا آغاز کیجئے

خود بھی پڑھیے اور دوسروں
کو بھی پڑھائیے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ ریوارز گارڈن لاہور
فون: 042-37245412

جواب آنسوؤں سے دیا اور صحن میں آکر کھڑا ہو گیا۔
بندی (آنسو پونچھتے ہوئے) ”بیٹھو گے نہیں؟ کیا
کہیں جانا ہے؟“

محبوب ”ہاں ابھی میرا سفر ختم نہیں ہوا۔ ایک
بوجھ میرے کندھوں پر ہے جب تک اسے نہ اُتار
لوں گا حج پکا نہیں ہوگا۔“

بندی ”دُور جاؤ گے یا پاس؟“

محبوب ”کل رات کو آ جاؤں گا۔“

بندی ”تو ابھی جاؤ گے؟“

محبوب ”زندگی کا کیا اعتبار جلدی سے دو
روٹیاں پکا دو اور دو چار روپے ہوں تو دے دو۔“

بندی نے جلدی جلدی آٹا گوندھ روٹیاں
ڈالیں۔ محبوب اتنی دیر کھڑا ہی رہا اور جب بیوی نے
روٹیاں رومال میں باندھ کر دیں تو وہ فوراً باہر نکل گیا۔

فیروز پور جھمرہ میں مرحوم پیر صاحب کا مکان
تھا۔ صبح ہوتے ہی وہاں پہنچ کر اُن کی امانت اُن کی
بیوی بچوں کے سپرد کی اور اپنے گھر لوٹ آیا۔

دوسرے دن صبح کی نماز کے بعد لوگوں نے
پوچھا ”حامی جی چار وقت نہ تم نے اذان کہی، نہ
جماعت میں آئے، کیا کہیں چلے گئے تھے؟“

محبوب نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے مسکرا کر
جواب دیا ”جُج کے حامی ہونے میں ایک کسر رہ
گئی تھی۔ فیروز پور جھمرہ جا کر اسے پورا کرنا تھا۔ خدا
کا شکر ہے کہ اس سے فرصت پائی۔“

جُج کے بعد تقریباً دس سال میاں محبوب اپنی
بیوی کے ساتھ نہایت پاکیزہ زندگی گزارتے رہے
یہاں تک کہ لوگ اسے درویشِ کامل سمجھتے تھے لیکن
یہ ایک بندی کا انتقال ہو گیا۔

بلب گڑھ میں طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ گھریوں ہی
چھوڑ دی آگئے اور دنوں والی مسجد میں رہنے لگے۔

جہاں ریل نے اُتار دیا وہاں سے اب اُس نے
پیدل چلنا شروع کیا اور بڑی مشکل سے چوتھے دن
بلب گڑھ پہنچا۔ جسے کا دن تھا نمازی جسے کی نماز
پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے۔ بندی نماز سے فارغ
ہو کر چرخا کا تنے بیٹھی تھی کہ یکا یک اُس کی باتیں
آکھ پھڑکنے لگی۔ رات کو اس نے خواب میں دیکھا
تھا کہ محبوب مجھے مدینہ منورہ کی کجوریں کھلا رہا ہے۔
اس وقت جو اس کی آکھ پھڑکی تو اس کا دل بڑے
زور سے اچھلنے لگا۔ عورتوں کا اعتقاد ہے کہ آکھ
پھڑکے باتیں، پیرلے یا سائیں، بندی کو ایسے
ٹھکانوں پر اعتقاد تھا۔ وہ چرخا پونی کرنا تو بھول گئی۔
دیر تک دروازے کی طرف ٹھٹکی باندھے دیکھا کی۔
گویا محبوب آ رہا ہے کب اُس کی آہٹ پائے اور
کب جھپاکے سے اُٹھ کر کھڑی کھولے۔

دروازے کی طرف ٹھٹکی لگائے عصر کا وقت
ہو گیا۔ مسجد سے اللہ اکبر کی آواز کل کر نضا میں
پھیلی۔ آواز سننے ہی بندی چونک پڑی، بے تاب
ہو گئی، بس نہیں چلتا تھا کہ باہر جا کر دیکھے کیونکہ یہ
آواز محبوب کی تھی۔ کیا آگئے؟ آواز تو بالکل انہی
جیسی ہے۔ سامان رکھ کر مسجد جاتے۔ کیا خبر میرے
کان بجے ہوں، اُس کا دل دھکڑ پکڑ تھا کہ اتنے
میں اذان ختم ہوئی اور اذان ختم ہوتے ہی محلے میں
فل جُج گیا کہ محبوب آگئے۔ پڑوس کی سیدانی بی
نے پکار کر کہا ”ہمسائی مبارک ہو، تمہارے میاں
حامی بن آئے۔“

بندی کی عجیب کیفیت تھی کبھی روتی کبھی ہستی،
کبھی جدے میں گر پڑتی۔ نماز سے پہلے اور نماز کے
بعد ایک گھنٹے تک محلے کے بوڑھے جوان حامی
محبوب کے ہاتھ چومتے رہے۔ لوگوں سے فرصت
ملی تو گھر آئے۔ بندی دروازہ کھولے کواڑوں سے لگی
کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ محبوب نے بھی آنسوؤں کا



جاوید رانی

نوری اور توکل

وہ اس خبر کے لیے بالکل تیار نہ تھا مگر یہ سنتے ہی کہ نوری کی شادی ہو گئی وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کیا۔ وہ ملک صاحب کے اگلے پیغام کے انتظار سے پہلے ہی ایک رات چپکے سے اپنے ساتھیوں کی آنکھ بچا کر سین گن سمیت بھاگ نکلا۔

ایک شخص کا فسانہ جس کے منت کرنا والے ہاتھ بندوق اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے

بغل میں دبار کی تھی۔ میاں صاحب کے آدمی جب تک اس کے پیچھے آتے وہ ان کی دسترس سے بہت دور نکل آیا تھا۔ نیکر کے ایک دھت کی لوٹ لے کر اس نے اپنے پیچھے کے دھتے کا جائزہ لیا۔ صرف اس کے گھوڑے کے پاؤں کی دھول چاندنی رات میں اڑ رہی تھی۔
”کب تک بچو گے میاں؟ آج کرم علی مرا ہے کل تم اس کی جگہ ہو گے“ اس نے منہ میں بڑبڑاتے ہوئے

ٹھانیں، ٹھانیں، ٹھانیں..... سیون ایم ایم کی کرخت آواز نے رات کے سکوت کا سینہ چیر ڈالا۔ حویلی میں یکدم بھگدڑ مچ گئی، کئی کمرے روشن ہو گئے۔ بڑے دلال کی بوگن بلایا کی تیل کی جڑ کے پاس کرم علی کی لاش تڑپ تڑپ کے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ جب تک؟ جاگتا وہ گھوڑے کو نہر کی بڑی مچی سڑک پر ڈال چکا۔ سیون ایم ایم کی رائفل اس نے گلے میں ڈال کر سبیل سے



چھوٹی بیٹی تھی۔ بڑی بیٹی اس نے ساتھ کے گاؤں میں
بیاب دی تھی اور لڑکا شہر میں میاں صاحب کی کوٹھی پر رہتا
تھا۔ توکل اور نوری ایک ساتھ پرہان چڑھے تھے۔ اس
لپے نظروں ہی نظروں سے ایک دوسرے کو دل دے
بیٹھے تھے۔ اکثر توکل نوری سے کہتا، "نوری میں تیرے
بابا سے تیرا ہاتھ مانگ لوں مگر بڑی بی بی جی سے ڈر لگتا
ہے۔ پتہ نہیں وہ تیرے لیے کیا سوچتی ہے۔"
"میں کیا جانوں۔" نوری چاروں طرف دیکھ کر
دھیرے سے جواب دیتی۔ "اچھا جاؤ کوئی دیکھ نہ لے۔"
نوری اسے جانے کا کہتی اور توکل ٹھنڈی سانس بھرتا
دوسری طرف نکل جاتا۔

ایک روز انھیں باتیں کرتے ہوئے ایک ملازم کرم علی
نے دیکھ لیا اور اس نے منشی کو بتادیا۔ منشی جو میاں صاحب
کے لیے کھلی آنکھیں اور کھلے کان کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے
جھٹ، یہ خبر میاں نیاز علی کے گوش گزار دی۔ بس پھر کیا
تھا اندرون کی اور باہر توکل کی شامت آگئی۔

بڑی بی بی جی نوری کے دونوں ہاتھ چار پائی کے
پائوں کے نیچے رکھوا کر اوپر خود بیٹھ گئیں۔ نوری کی
مارے درد کے چہرے بلند ہونے لگیں۔ کیا مجال ہے
علی محمد زبان سے آف بھی کرتا۔ اس کی بیٹی کے ساتھ
اس کی موجودگی میں وحیائے سلوک ہوا مگر وہ بے بس
تھا۔ وہ حویلی کے قانون کو بخوبی جانتا تھا۔ ادھر
ڈیرے پر توکل کو چار پائی سے جکڑ کر اس کی پیٹھ پر
لاٹھیاں برسائی جا رہی تھیں۔ میاں صاحب تخت
پوش پر جتنے کی منہ میں دبائے اس کی چیخوں
سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب وہ اپنے دل کی
حسرت نکال چکے تو اسے آزاد کرنے کا اشارہ کیا۔
پھر حکم ملا کہ آج سے تیرا حویلی آنا جانا بند ہو صرف
ڈھاری پر رہے گا اور مال ڈنگر کی رکھوالی کرے گا اور
دودھ دھوئے گا گوہر سنبھالے گا۔ نوری اس کی
آنکھوں سے دُور ہو گئی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اسے
اُس ملازم اور منشی پر بہت غصہ تھا مگر وہ بے بس تھا۔

گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا
اور ایک دو بھر پور کش لے کر دھواں ایک طرف پھینکتے
گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔ اب اس کا رخ ذخیرہ کی
طرف تھا۔ اسے ذخیرہ میں پہنچتے دوسرا سال شروع ہو چکا
تھا۔ اس کا یہ دوسرا لٹل تھا۔ پہلا لٹل اس نے اس وقت کیا
تھا جب وہ ایک محنت کش تھا اور نوری کے پیار میں سرشار
ہر وقت وہ میاں نیاز علی کے کھیتوں میں کام کرتا اور شام کو
حویلی کے بڑے ڈیرے پر گر پڑتا تھا۔

وہ دن خوشی اور سکون کے تھے۔ توکل ایک عادی
بھرم نہیں بلکہ ایک محنت کش تھا۔ جب نوری حویلی سے
نکل کر اسے روٹی دینے آتی تو اس کی تمام دن کی محنت
پل بھر میں ہوا ہو جاتی اور وہ آنکھوں میں ٹھانٹھا مارتا
محبت کا سمندر لیے نوری کے استقبال کے لیے اُٹھتا
اور روٹی والے برتن اس کے ہاتھ سے پکڑ لیتا۔ نوری
اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پل بھر کو دیکھتی اور یوں
سمٹ جاتی جیسے چھوٹی موٹی کی ڈالی اور جلدی سے
ڈیرے کا اندرونی دروازہ پھلانگ جاتی۔ توکل مسکراتا
ہوا روٹی کھانے میں مشغول ہو جاتا۔

توکل کے ماں باپ کب کے مر چکے تھے وہ کئی
ملازموں کے ہر لہ بھی حویلی کا بے دام غلام ہو گیا۔ حویلی
کا قانون باہر کے قانون سے ذرا مختلف تھا۔ یہاں
لوگوں کو دن میں کام کرنا ہوتا تھا اور صرف رات آرام
کرنے کی اجازت تھی۔ ان کے نزدیک کوئی خوشی اور رنج
اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ سال میں دو تین بار لباس ملتا اور
گاؤں کے موچی سے دوبار جوتے۔ حویلی کے امداد کام
کرنے والی نوکریاں بڑی بی بی جی کے ماتحت تھیں۔
کس کی مجال تھی جو بڑی بی بی جی کی مرضی کے خلاف
کام کر سکے میاں صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی
جو شہر میں پڑھ رہے تھے۔ وہ وہاں ان کی دوسری بیوی
کے پاس رہتے جس کو چھوٹی بی بی جی کا رتبہ حاصل تھا۔
میاں صاحب اپنے علاقہ کے بااثر آدمی مانے جاتے
تھے۔ نوری میاں صاحب کے پہلے ملازم علی محمد کی

ڈھاری کا مال اکٹھا کر کے وہ ان کے ہمراہ چل پڑا۔ اُس نے ایک انتہائی خوفناک فیصلہ کیا تھا، اس کے دل میں میاں نیاز علی کے لیے جو نفرت کا طوفان دبا ہوا تھا اسے صرف ملک تصدق کی پناہ میں ہی رہ کر پورا کیا جاسکتا تھا۔

دوسرے روز جب اسے ملک صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے ساری داستان کہہ سنائی۔ لوہا گرم دیکھ کر ملک تصدق نے چوٹ لگائی۔ ”تو کل فکر مت کرو تیرا اور میرا ایک ہی دشمن ہے جلد منت لیں گے۔ تم ابھی کچھ روز آرام کرو۔ جاؤ رفیق اسے ذخیرہ میں لے جاؤ باقی میں سنبھال لوں گا اور مال بارڈر پار بھجوا دو۔“

”بہتر ملک صاحب۔“ رفیق نامی اس آدمی نے احترام سے جواب دیا اور توکل کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ تقریباً ایک ماہ کے عرصہ میں توکل ہر کام میں ماہر ہو گیا۔ اس دوران وہ ملک کے آدمیوں کے ہمراہ دو تین بار چوری چکاری بھی کرنے لگا۔ وہ سارے گریسکھ چکا تھا۔ ملک تصدق نے ایک روز اسے بلا بھیجا۔ اب وہ دوسری بار ملک صاحب کے پاس کھڑا تھا۔ ”جی ملک صاحب۔“ توکل نے نظریں جھکائے پوچھا۔

”اپنا انتقام یاد ہے یا بھول چکے ہو؟“

”ملک صاحب یہ کوئی بھولنے والی بات ہے۔ جس نے ساری عمر کی خدمت کا یہ صلہ دیا ہوا ہے کیسا بھولتا۔“ توکل کے لہجے میں سارے جہان کی نفرت ابھر آئی۔ ”تو ٹھیک ہے آج رات تیار رہنا، تم دو آدمی اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو مگر جب واپس آؤ تمہارے ہاتھوں سے لہو کی بو آنی چاہیے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ بزدل اور ناکام آدمی مجھے پسند نہیں۔“

”ایسا ہی ہوگا ملک صاحب۔“

”اب تم جاسکتے ہو۔“

توکل نے اس سے خوشتر چوری چکاری میں تو ملک

میاں نیاز علی اور ملک تصدق کا آپس میں مقابلہ چلا آرہا تھا۔ کبھی میاں کے آدمی اس کا مال مار لاتے اور کبھی ملک تصدق کے آدمی میاں نیاز علی کا ڈھور ڈنگر چوری کر کے لے جاتے۔ پھر میدان لگتا دونوں طرف سے خوب رسہ کشی ہوتی، یہ سلسلہ دونوں طرف سے چلا آرہا تھا۔

توکل کو ڈھاری پر آئے کئی ماہ گزر چکے تھے اگر توکل کا نوری کے بغیر بُرا حال تھا تو نوری بھی اس کے لیے پریشان تھی مگر دونوں بے بس تھے۔ ایک رات وہ ڈھاری پر اکیلا ہی تھا۔ سچواری کسی کام کی غرض سے شہر گیا ہوا تھا، گرمی کی راتیں بڑی جان لیوا ہوتی ہیں۔ چمھروں نے اسے تنگ کر رکھا تھا۔ اس نے مال سے ذرا ہٹ کر اپنی چارپائی ڈالی ہوئی تھی اور قریب ہی دھواں لگا رکھا تھا۔ تاکہ چمھر دور رہیں۔ ابھی اسے لیٹے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ کتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ جیزی سے اٹھ بیٹھا مگر اپنے سے چند قدم دور آٹھ نو آدمیوں کو دیکھ کر وہیں ٹھٹھک گیا۔ وہ اسلحہ سے لیس تھے اور انھوں نے منہ پر کپڑے باندھے ہوئے تھے۔ دو آدمی قریب آگئے۔ ”اگر آواز نکالی تو بھون کر رکھ دیں گے۔“ وہ سہم گیا مگر جلدی سنبھل کر اس نے حالات کا جائزہ لیا اور فوری فیصلہ کرتے ہوئے اس نے ان کو مخاطب کیا ”اگر تم ملک صاحب کے آدمی ہو تو میں خود یہ مال کھول کر تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں ورنہ جان دے دوں گا مگر تم ڈنگر میری زندگی میں نہیں کھول سکتے۔“

”تم ملک صاحب کے پاس کیوں جانا چاہتے ہو۔“ ان میں سے ایک آدمی نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں پناہ چاہتا ہوں۔“ توکل نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

ان مسلح آدمیوں نے چند لمحے آپس میں مشورہ کیا اور اسے ساتھ لے جانے پر رضامند ہو گئے۔ ساری

پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا نشانہ بھی درست کرو۔ کیونکہ اب تم قاتل بن چکے ہو۔“ اب پولیس تمہارے پیچھے رہے گی اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنی حفاظت کے لیے پولیس سے مقابلہ بھی کرنا پڑے۔ اس لیے تمہارا نشانہ نچا ہونا ضروری ہے۔ جاؤ اور خوب مشق کرو۔ ہارود کی تمہیں کوئی کمی نہیں۔“ ملک صاحب نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

توکل نے جبکہ کر شکریہ ادا کیا اور واپس ذخیرہ میں آ گیا۔ توکل دن بہ دن ملک صاحب کے قریب ہوتا گیا۔ ملک صاحب اس پر ہر طرح کا بھروسہ کرنے لگے۔ علاقہ کی پولیس اُس کی بڑھتی ہوئی وارداتوں کے ہاتھوں بہت پریشان تھی مگر ہزار کوشش کے باوجود اسے گرفتار نہ کر سکی۔ میاں نیاز علی، اب توکل کے خوف سے ڈیرہ پر کم ہی بیٹھتا تھا۔ جب بھی باہر نکلتا تو اپنے ساتھ اسلحہ سے لیس آدمی رکھتا۔ منشی کے قتل کا پرچہ توکل کے خلاف درج ہو چکا تھا۔ میاں نیاز علی کوشش کے باوجود ملک تصدق کو اس قتل میں ملوث نہ کر سکا۔ لوری کی شامت آئی رہتی۔ بڑی بی بی جی نے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ہر وقت اس پر طعنہ زنی کرتی رہتی کہ یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہو رہا ہے نہ تو اس حرام خور سے رابطہ بڑھانی اور نہ یہ دن دیکھنے نصیب ہوتے۔ لوری دل میں کڑتی رہتی مگر زبان پر حرف شکایت نہ لاتی۔ ادھر توکل ہر رشتے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وقت نے اس کے ماتھے پر گہری ناکامیوں کی داستان رقم کر دی تھی۔ اس کے دل میں صرف میاں نیاز علی کے قتل کی خواہش ترپتی رہتی۔ جس کو پورا کرنے کے لیے وہ اس روز بھی حویلی آیا اور مداخلت کرنے پر اس نے کرم علی کو بھون ڈالا۔

کرم علی میاں نیاز علی کا ہاڈی گاڑ ڈھا۔ جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔ بڑے دلان میں اس کی چارپائی تھی جو عین میاں نیاز علی کے کمرے کے

صاحب کے آدمیوں کا ساتھ دیا تھا مگر جس کام کے لیے وہ جانے والا تھا یہ اس کے لیے نئی بات تھی۔ اس کے اندر ایک طرح کا خوف سر اٹھا رہا تھا۔ مگر اُس نے اپنے آپ کو سنبالا اور اپنے بھروسے کے دو آدمی ساتھ لیے۔ گھوڑے کو میاں نیاز علی کے گاؤں کی طرف کر دیا۔ اسے معلوم تھا رات دس گیارہ بجے تک میاں ڈیرے میں ہی لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے بعد وہ حویلی کے بڑے دلان والے دروازے سے گزر کر اندر چلا جاتا تھا۔ توکل نے ڈیرے کی پچھلی دیوار کا انتخاب کیا۔ وہ کھیتوں کے راستے ڈیرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دونوں آدمی اس نے پیچھے ہی چھوڑ دیئے اور خود رینگتا ہوا ڈیرہ کی عقبی دیوار تک پہنچ گیا۔ راتقل اس نے دیوار کے اوپر رکھی اور بغیر آواز پیدا کیے اندر کود گیا۔ دیوار کے اندر لگی گارڈنیا کی پاڑ کی اوٹ لیتا ہوا راتقل کو مضبوطی سے تھامے اس طرف بڑھنے لگا جہاں میاں نیاز علی بیٹھا اسے نظر آ رہا تھا۔ اس وقت میاں نیاز علی کے پاس تین چار لوگوں کے علاوہ گاؤں کے کچھ لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ منشی میاں نیاز علی کی بی چارپائی پر بیٹھا شاید اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔ قاصد کم محسوس کر کے توکل نے پوزیشن درست کی اور راتقل کا منہ میاں نیاز علی کے سر کی طرف کرتے لپٹی دبا دی۔ ٹھائیں کی خوفناک آواز کے ساتھ وہاں شور مچا ہوا گیا۔

اس نے اعدا و چند کئی قاتر کیے اور یہ دیکھے بنا کہ کون مرا ہے بھاگ کھڑا ہوا۔ دیوار پھلانگ کر وہ کھیتوں کی طرف بھاگنے لگا جب تک میاں نیاز علی کے آدمی اسلحہ وغیرہ لاتے وہ تینوں گھوڑے دوڑاتے گاؤں کو پیچھے چھوڑ آئے۔ میاں نیاز علی توفیق گیا مگر منشی پہلی گولی لگتے ہی ڈیرہ ہو گیا تھا۔ دوسرے روز ملک صاحب نے اسے بلا کر بتایا کہ ”تمہارا نشانہ خطا گیا، بہر حال تمہاری گولی نے منشی کا کام تمام کر دیا ہے۔ یہ بھی تمہاری کامیابی ہے۔ اپنے اندر حوصلہ

سیارہ ڈائجسٹ کی عظیم الشان پیشکش



حکفۃ النساء

شائع ہو گیا ہے!

• خواتین اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری باتیں!
• قرآن و حدیث کی روشنی میں عورتوں کے لئے اسلامی عقائد، ایمان، نماز،
روزہ، زکوٰۃ، حج، ذکر، تلاوت، وظائف اور دعا کے مفصل احکام!
• اس کے علاوہ ازدواجی زندگی، نکاح، طلاق، خلع، عدت، غیبت، وراثت،
توبہ، اخلاق، اولاد کی تعلیم و تربیت کے مسائل اور ان کا حل
• فرضیکہ خواتین کی دینی زندگی سنوارنے کے لئے جامع اور نایاب نسخہ جو ہر
مسلمان گھرانے کی ضرورت ہے۔ قیمت 175 روپے

سیارہ ڈائجسٹ 240۔ مین مارکیٹ ریلوے گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

توکل کے دل پر چھریاں چل گئیں۔ وہ چیخ اٹھا اس کے دل کے اندر کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اسے یوں لگا جیسے ساری دنیا اندھیر ہو گئی ہے۔

وہ بالکل پاگلوں کی طرح سارا دن اکیلا جنگل میں بھٹکتا رہا۔ وہ اس خبر کے لیے بالکل تیار نہ تھا مگر یہ سنتے ہی کہ نوری کی شادی ہو گئی وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کیا۔ وہ ملک صاحب کے اگلے پیغام کے انتظار سے پہلے ہی ایک رات چپکے سے اپنے ساتھیوں کی آنکھ بجا کر شین کن سمیت بھاگ نکلا۔ گھوڑا کھولتا تو ان کو شک ہو جاتا۔ اس لیے پیدل ہی نکل کھڑا ہوا۔ تمام رات سفر کرتا وہ بہت دُور آ گیا تھا۔ دن کو تھوڑی دیر ایک جگہ آرام کرنے کے بعد دریا کی کندھی کے ساتھ ساتھ چلتے لگا۔ اسے سفر جاری رکھتے ہوئے کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ یہ علاقہ ذی روح سے پاک تھا۔ اس لیے وہ بغیر کسی خوف و خطر کے آگے بڑھ رہا تھا۔ گن اس نے اپنی چادر کے نیچے چھپا رکھی تھی۔ اسے ایک گھوڑے کی ضرورت تھی مگر راستے میں کسی بھی گاؤں کا ابھی نشان تک نہیں آیا تھا۔ دن ڈھلنے تک وہ بمشکل ٹھیکروں کی جھکیوں تک پہنچ سکا۔ بھوک سے وہ بڑا حال ہو چکا تھا۔ یہاں اسے کھانا مل گیا اور رات بسر کرنے کے لیے جگہ بھی۔ دوسرے روز وہ منہ اندھیرے نکل کھڑا ہوا۔ توکل کو اگلے سفر کے لیے ان لوگوں سے خاصی معلومات مل چکی تھیں۔

دو پہر تک وہ بہادر پور گاؤں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ تھوڑی دیر تازہ دم ہونے کے بعد اس نے گن ایک جگہ چھپائی اور گاؤں میں داخل ہو گیا۔ وہ گھوم پھر کر جائزہ لینا چاہتا تھا کہ وہ گھوڑا کہاں سے چوری کر سکتا ہے۔ ایک ڈیرہ پر اسے گھوڑی بندی نظر آ گئی۔ بڑی سبک رفتار گھوڑی دکھائی دے رہی تھی؟ کوئی شوقین لگتا تھا جس نے یہ گھوڑی رکھی ہوئی تھی۔ توکل راستے کو ذہن نشین کرتا واپس چل پڑا۔

گاؤں سے واپسی پر اس نے کھانے کے لیے کچھ

آگے تھی۔ توکل آگے بڑھتا مگر وہ جاگ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بندوق پکڑتا توکل نے چپے کی سی پھرتی سے اوپر تلے قائر کر کے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا اور اس بار بھی وہ صاف فتح نکلا۔ ذخیرہ پہنچ کر وہ جنگلی میں چھپی پیال پر گر پڑا۔ ممکن ہے اس کا نما حال ہو رہا تھا۔ سہاول جو سب آدمیوں کے لیے کھانا وغیرہ بناتا تھا اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ توکل خالی نہیں لوٹا۔ ”کیوں توکل کیا ہوا ہے؟“ سہاول نے اس کی ٹانگ دبانے کے لیے اپنی طرف کرتے دریافت کیا۔ ”اس بار بھی فتح نکلا ہے کہیں مگر میں نے اس کا آدمی بھون ڈالا ہے۔“ توکل نے سرگرمی سے سگاتے جواب دیا۔ ”کب تک بچے گا ایک روز حیرے ہاتھوں اس کو ختم ہونا ہی پڑے گا۔“ صبح ملک صاحب کو خبر مل جائے گی اور ہاں شاید اب یہ جگہ بھی تہل مل کر رہے۔ ملک صاحب کو اطلاع ملی ہے کہ پولیس جلد ذخیرہ کا گھیراؤ کرنے والی ہے۔ ہو سکتا ہے بارڈر کی طرف لٹنا پڑے۔ ملک صاحب سے صبح بات ہوگی۔“

ملک صاحب نے توکل سمیت اپنے سارے آدمی خشک پیاس پار بھیج دیے۔ پولیس نے سارا ذخیرہ چھان ڈالا مگر کوئی بھی آدمی ہاتھ نہ لگا۔ میاں نیاز علی کو اس بات کا بھی صدمہ ہوا کیونکہ اس نے بڑی مشکل سے ایس پی صاحب کو یقین دہانی کروائی تھی کہ ملک تصدق کے آدمی ذخیرہ میں چھپے ہوتے ہیں۔ ملک صاحب کو اپنے خاص پولیس تجربے کا ردائی کی اطلاع پہلے سے مل چکی تھی ورنہ اس بار میاں نیاز علی خاصا ہاتھ مار جاتا۔ اس آپریشن کے بعد علاقہ میں امن عامہ کی صورت حال کچھ ملے کے لیے بہتر ہو گئی۔ میاں نیاز علی کو بھی یقین سا ہو گیا کہ اب ملک تصدق کی تحریری کارروائیاں ترک کر لیں ہیں۔ حالانکہ بات اس کے برعکس تھی۔

اسی دوران توکل کو اطلاع ملی کہ نوری کی شادی نیاز علی نے اپنے ایک ملازم شہاد ماٹھی سے کر دی ہے۔

شرابور ہو رہا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے سینے میں میاں نیاز علی کے لیے نفرت کا لاڈلاتا ہی شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ گاؤں سے باہر رکتے ہوئے اس نے گھوڑی ایک درخت کے ساتھ ہانڈھ دی اور اپنی شین گن کو اچھی طرح چیک کرتے ہوئے حویلی کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ وہ بغیر کسی خوف کے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ نجر کی لڑان کب سے ہو چکی تھی۔ گاؤں میں نمازی مسجد کی طرف آ جا رہے تھے۔ وہ حویلی کے دروازے پر پہنچ کر رکا اور پھر محکم کر ڈیرے کی طرف آ گیا۔ سامنے دکان کے بڑے ٹھرنے پر میاں نیاز علی بیٹھا مسواک کر رہا تھا اور ایک نوکرانی کا لونا پٹڑے قریب کھڑا تھا۔ توکل نے شین گن کا لیٹر کھینچا اور ایک دم میاں نیاز علی کے سامنے آ گیا۔ ”میاں دیکھو میں تمہاری موت بن کر آیا ہوں۔ تمہیں کہا تھا ناکسی بے قصور پر ظلم مت کرو۔ مگر تو اپنی فطرت سے مجبور فرعونیت کا دعویدار بننا تھا۔ تو نے مجھ پر بے شمار ظلم کیے۔ نوری کو مجھ سے حیدر کر دیا، تو شاید اپنے انجام سے بے خبر تھا۔ تو نے میرے کسی پکڑنے والے ہاتھوں میں بندوق پکڑا دی۔“ اس سے بدشتر کہ میاں نیاز علی بھاگتا توکل نے اندھا رند فائرنگ کر کے میاں کے پرچے اڑا دیئے۔ فائرنگ کی آواز پر میاں کے پالتو اسلحہ لے کر بھاگے آئے۔ توکل نے دوسری بار جو فائرنگ کی اس سے میاں کے تین آدمی اور ڈھیر ہو گئے۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں اپنی اشین گن ایک طرف رکھتے چاروں طرف دیکھا۔ حویلی کے سب لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے جن میں نوری بھی تھی۔ وہ آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں سے توکل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ توکل نے نظریں اٹھا کر نوری کی طرف دیکھا دوبارہ اشین گن اٹھائی اور وہاں جمع لوگوں کا مجمع چیرتا ہوا پولیس چوکی کی طرف چل پڑا۔

توکل کے خلاف قتل، ڈکیتی جیسے سنگین مقدمات درج ہو چکے تھے۔ اب توکل جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگی کے کم ہوتے شب و روز سمیٹا عدالت کے فیصلے کا منتظر ہے۔

چیزیں خرید لی تھیں۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے بعد وہ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں لیٹ کر بے خبر سو گیا۔ رات گئے تک وہ سوتا رہا۔ اٹھ کر اس نے جھاڑیوں میں سے اپنی شین گن نکالی اور گاؤں کی جانب قدم بڑھانے لگا جہاں گھوڑی بندھی تھی۔ اس ڈیرہ تک جانے میں اسے کوئی مسئلہ درپیش نہ آیا۔ کئی منٹ تک وہ دیوار کی اوٹ میں کھڑا مرد کا جائزہ لیتا رہا پھر وہ لکڑی کا جنگلا پھلانگ کر دبے قدموں چلتا کھری تک آ گیا۔ گھوڑی نے ناک کی پھٹکار سے توکل کو دیکھ کر بارہنگی کا اظہار کیا اور اپنے دونوں کان پیچھے کی جانب کھینچ کر کوٹھے پر ادھر ادھر بدکنے لگی۔ دور چارپائی پر لیٹا ہوا آدمی ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور چاروں طرف دیکھ کر دوبارہ کروٹ لیتا ہوا لیٹ گیا۔ توکل کچھ دیر ساکت و جامد وہیں پڑا رہا پھر رینگتا ہوا گھوڑی کے قریب پہنچ گیا۔

آہستہ آہستہ اس نے گھوڑی کی گردن سہلائی اور پھر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ گھوڑی نے اپنے اسل ہونے کا ثبوت دیتے کان ہلانے شروع کر دیئے۔ توکل نے رسہ کھولا اور اس کے دونوں پچھلے پاؤں آزاد کرتے ہوئے گھوڑی کو لے کر باہر نکل آیا۔ جو راستہ اس نے منتخب کیا تھا وہ آبادی سے باہر جاتا تھا۔ ایک جگہ رک کر توکل نے رسے کی باگ بنائی اور گھوڑی کی پیٹھ پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا دی۔ گھوڑی کمان سے لٹکے تیر کی طرح سرپٹ دوڑنے لگی۔ توکل گھوڑی ساری میں اتنا ماہر ہو چکا تھا کہ بغیر کسی تکلیف کے مسلسل سفر کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ راستے میں ایک دو بار رک کر اس نے راستے کا تعین کیا۔ پھر صحیح سمت کا اندازہ کر کے مطمئن انداز میں آگے بڑھتا رہا۔ وہ لڑان ہونے سے بدشتر میاں نیاز علی کے گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اب جس راستے پر وہ چل رہا تھا وہ اس کا دیکھا ہوا تھا۔ اس لیے آگے بڑھنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دیا کی کندھی چھوڑ کر ذخیرہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گھوڑی نے شاید پہلی بار اتنا سفر کیا تھا۔ اس کا ساما بدن پسینے سے





”تم میری ہو“

م۔ب۔ شیریں

”جوڑے آسمان پر بنتے ہیں“ اس کہادت کو جھٹلاتے ہوئے محبت کے نشہ میں آگے اور آگے بڑھتے ہوئے ایک نوجوان جوڑے کی کہانی جو ایک دوسرے کو اپنانا چاہتے تھے مگر تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر سر جھکانے پر مجبور ہو گئے۔ شاید یہی ان کے نصیب میں لکھا تھا۔ ساری عمر اسی درد اور کک میں گزارنے کا فیصلہ قدرت نے لکھ دیا تھا۔ حقیقت پر مبنی کہانی!

ہوگی۔ اس مانگ کی سیدھ میں چلتے چلتے کوئی راہی اپنی ہی سُدھ بدھ بھول جائے گا۔ تمہارے چہرے پر زرتا رو پٹے کا آئینل پڑا ہوگا اور تمہارے چہرے کا حسن اس میں سے چمن چمن کر کسی پر آفت ڈھا رہا ہوگا۔ مجھے پتہ نہیں یہ سب کیوں عجیب عجیب سا لگ

رات دھیمے دھیمے گزر رہی ہے۔ چاند کی روشنی چاروں طرف چھائی ہوئی ہے اور تمہارا شادی کا کارڈ میری میز پر پڑا منہ چڑا رہا ہے۔ آج تمہاری شادی ہے، اس وقت تم جملہ عروسی میں سرخ جوڑا پہنے بیٹھی ہوگی۔ تمہاری لانی مانگ میں کبکھاں پھیلی ہوگی

ہو گئیں۔ شام گہری ہو چکی تھی سیاح بھی اندر جا چکے تھے۔ صرف دو نو جوان جوڑے بیٹھے ایک دوسرے کی صورت تک رہے تھے۔ میں نے اس وقت ہمت سے کام لیا اور تمہارا ہاتھ پکڑ کر اپنی میز پر لے آیا۔ تمہارا نرم و نازک ہاتھ فرط جذبات سے کانپ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا تمہارے ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا لوں۔ تاکہ میرے سینے کی تپش سے تمہارے شفتے ہاتھ بھی تپ جائیں۔ مگر میں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا۔ تم گھبراتی ہوئی میری میز پر بیٹھ گئیں۔ ہیرا چائے لے آیا۔ تم نے چائے بنا کر دی اور میں اس چائے کو پاگلوں کی طرح ایک ہی سانس میں پی گیا۔ میری بے خودی دیکھ کر تم مسکرائیں۔ پھر تم نے بتایا تمہارے بھائی اور بھادج بھی سنگاپور میں ہیں۔ تم پاکستان سے کچھ ماہ کے لیے یہاں آئی ہوئی ہو۔ اکیلی بور ہوتی ہو۔ چھوٹے چھوٹے بے ربط جملوں میں تم بولتی گئیں اور میں سنتا رہا۔ فضا میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں اور میرے دل میں تمہارے جملے دھیرے دھیرے اترتے جا رہے تھے۔

پھر ہم دونوں واپس اکٹھے آئے۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں بچے دوست بن گئے۔ صبح تم فون پر مجھے جگاتیں۔ کانوں میں پہلے تمہاری آواز رس گھولتی۔ شام کو ہم اکٹھے گھومتے ہم کہاں کہاں نہیں گئے جہاں جاتے وہاں خوشیوں کا راج ہو جاتا۔ شفق پھوٹ پڑتی اور میں تو جیسے ان خوشیوں کے اس سمندر میں بہا چلا جا رہا تھا۔

تم کو یاد ہے وہ دن جب ہم سنگاپور کے بوٹیکل گارڈن میں سیر کرنے گئے تھے۔ تمام دن ہم نے گھوم پھر کر گزارا۔ ایک دوسرے کی ہانہوں کا سہارا لیتے جھومتے ہوئے اونچے اونچے درختوں کے سائے میں گھومتے رہے۔ تم جہاں سے گزرتیں تمہارے بالوں میں پھول اٹک جاتے اور جب تم چونک کر

رہا ہے۔ تم تو اب کسی اور کی ہو چکی ہو۔ میرا اور تمہارا اب کیا رشتہ باقی رہ گیا ہے۔ اب تو تم زندگی کے کسی موڑ پر ملو گی بھی تو اجنبی بن کر۔

اپنی آنکھوں کے مدھ بھرے جادو سے بے خبر۔ ان لحوں کے فسوں سے بے خبر جو کبھی میں نے اور تم نے اکٹھے گزارے تھے۔ آج مجھے ایک ایک بات یاد آرہی ہے۔ ایک ایک گزرا لمحہ حیرت و شہ و نشتر ہے۔ میرے دل میں گھاؤ کر رہا ہے۔ تمہارے ساتھ گزری شامیں اپنے سحر سے آزار ہو کر آوازیں دے رہی ہیں۔ رات کی تہائیاں تڑپ تڑپ کر تم کو پکار رہی ہیں۔ دن کے اُجالے بھالے بن کر میرے جسم میں بیوست ہو رہے ہیں اور ایسے میں تم کہاں ہو؟ بولنا۔

مجھے آج بھی سنگاپور کی وہ حسین شام یاد ہے جس دن میں تم سے پہلی دفعہ ملا تھا۔ مجھے نوکری کی وجہ سے سنگاپور گئے ابھی ایک ہی ماہ ہوا تھا۔ اکیلا بہت ہی پریشان ہوتا تھا۔ اس دن میں ماؤنٹ فیمبر سیر کرنے گیا ہوا تھا۔ یہ پہاڑی سطح سمندر سے ساڑھے تین سو فٹ بلند ہے۔ اس کی چوٹی پر ایک ہوٹل ہے۔ وہاں میں کھڑا دوڑ بین سے سنگاپور کے جزیرے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر تم پر پڑی۔ ہلکے گلابی رنگ کے کپڑوں میں کھڑی تم کتنی پیاری لگ رہی تھیں۔ میں نے دور بین چھوڑ دی اور تم کو دیکھنے لگا۔ تم میری نگاہوں کی تپش سے گھبرا اٹھیں اور میرے پاس آ کر کہنے لگیں۔ ”آپ کے پاس سکہ ہوگا۔ میں بھی دور بین میں ڈالوں گی۔“

میں نے تمہارے سامنے میز پر اپنا بوٹہ الٹ دیا۔ تم نے جلدی سے ایک سکہ اٹھایا اور دور بین میں ڈال کر جزیرے دیکھنے لگیں۔ اتنی دیر میں کھڑا تم کو دیکھتا رہا۔ تمہارے لمبے لمبے بالوں کو تکتا رہا۔ تم دور بین کے پاس سے نہیں تو مجھے دیکھ کر کچھ پریشان

کھڑی رہیں۔ پھر گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں چلو اب چلیں۔

میں تمہارے اس نئے روپ کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا۔ چپ چاپ تمہارے ساتھ واپس آ گیا۔ بعد میں تم نے بتایا تمہاری ایک سہیلی نے آ کر منت مانی تھی اور اس کی منت پوری ہو گئی۔

”رانی جی! پھر آپ نے کیا منت مانگی“ میں نے تمہیں چھیڑتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے سب کچھ مانگ لیا جس کی مجھے ضرورت تھی“ تم نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

”آخر آپ کو کیا ضرورت تھی“ میں نے پھر پوچھا۔

تم نے اٹھ کر اپنی جھیل سی گہری آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں اور میں اس جھیل میں غوطے کھانے لگا۔ تمہاری سرگوشی میرے کان میں گونجی۔

”میں نے تم کو مانگا تھا بدھ سے تم ہمیشہ میرے اپنے رہو گے نا دیکھو مجھے زندگی میں کبھی نہ بھولنا۔“

میں نے تڑپ کر تمہارے دونوں کول ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور کہنے لگا۔

”میں نے تو اپنا آپ کب کا تمہارے حوالے کر دیا ہے مجھ میں اور تم میں اب کوئی فرق نہیں۔ تم تو نہ بھولنے والی چیز ہو۔ میں اپنے آپ کو بھول سکتا ہوں مگر تمہیں نہیں تم تو میری روح کی گہرائیوں میں اپنا مقام پا چکی ہو۔ میرے انگ انگ میں تمہاری خوشبو سا چکی ہے۔ میرے دل میں تم ہو۔ تمہارا نقش میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتا“ اور تم گہری گہری سانسیں لیتی میری سنتی رہیں۔ نہ جانے تمہیں یہ باتیں یاد بھی ہیں یا نہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ابھی ابھی تم میرے پاس سے اٹھ کر گئی ہو۔ تمہاری خوشبو سائے میں پھیلی ہوئی ہے بعض دفعہ تو میں گھبرا کر سگریٹ پھینک دیتا ہوں اور دھوئیں کے مرغولے ہٹا کر تمہاری شبیہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

اٹھاتیں تو درخت پر بیٹھا بندر منہ چڑا رہا ہوتا۔ اس دن بندروں نے کتنا تنگ کیا تھا۔ میں نے نیچے بیک رکھ کر اوپر کی طرف دیکھا ہی تھا کہ چشم زدن میں بندر بیک اچک کر لے گیا پہلے تو ہم حیران کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر جو بنے ہیں تو ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے بچپن میں سنی ہوئی بندر کی کہانی یاد آ گئی جس میں بندر ٹوپی والے کی ساری ٹوپیاں اٹھا کر لے گیا تھا۔ میرے پاس تو باقی کوئی چیز تھی نہیں۔ اب کیا کرتا بندر نے بیک کھولنے کی بے انتہا کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تنگ آ کر اس نے بیک پھینک دیا ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بندر کو ہم پر ترس آ گیا۔

ایک دن تم کہنے لگی۔ بدھ کے دانت کا مندر دیکھنا ہے۔ میں تمہیں وہاں لے گیا۔ اتنی خوبصورت جگہ تھی کہ جی چاہتا تھا کہیں رہ جاؤ۔ سرسبز پہاڑی پر پھیلی ہوئی یونیورسٹی دیکھ کر سب ہی خوش ہو رہے تھے میں تمہیں بدھ کے دانت والے مندر میں لے گیا۔ ایک کوٹھڑی سی تھی جس کے دروازہ پر بڑا سا قفل لگ رہا تھا۔ لوگ کچھ چیزیں لا کر دروازے میں رکھتے اور منہ میں کچھ بدھ اکر چلے جاتے۔ مجھے دل ہی دل میں ہنسی آرہی تھی اور اپنے ہاں کے پیر فقیر یاد آرہے تھے۔ جہاں اس طرح چیزیں چڑھائی جاتی ہیں۔

اس دن تم نے سفید ساڑھی بائیں مٹی۔ تمہاری مانگ میں سیندر لگا تھا اور ماتھے پر ہنسی سی سرخ بندیا جھللا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ واپس جا کر تم کو ہشادوں گا۔ دیوی کی طرح اور تمہاری نظر اتاروں گا۔ تمہیں پوچوں گا۔ تم تو میرے دل کی دیوی ہو۔ دل کے سنگھارن سے میں تمہیں ہٹنے نہیں دوں گا۔ ابھی میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ تم نے بیک کھولا۔ ایک رومال میں سے خشک میوہ اور پھل نکالے اور بڑی عقیدت کے ساتھ لے جا کر کوٹھڑی کے دروازے پر رکھ دیئے۔ چند لمحے خاموش خاموش

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



چیونگم کا استعمال

ایک ایئر لائن اپنی فلائٹ کے مسافروں کو چیونگم تقسیم کرتی تھی جس کے پیکٹ پر لکھا تھا کہ طیارہ چلتے اور اترتے وقت کانوں کو انجن کے شور سے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کریں ایک مرتبہ ایک خاتون نے دوران پرواز ایئر ہوٹس کو پاس بلا کر کہا۔ ”اس چیونگم کو میرے کانوں سے نکالو مجھے تکلیف ہو رہی ہے.....“
(مرسلہ: محمد یونس۔ گوجرانوالہ)

ننھے بچوں کیلئے

ریسٹورنٹ

اب ننھے بچوں کو کھانا کھلانے کا مسئلہ ختم ہو گیا۔ برطانیہ میں کم عمر بچوں کیلئے پہلے ریسٹورنٹ کا افتتاح کر دیا گیا۔ لندن کے علاقے کاونٹ گارڈنز میں کھولے گئے اس ریسٹورنٹ میں ننھے بچوں کی عمر کے لحاظ سے لذیذ فلیورز والے مختلف کسٹمز، جیلی اور دیگر آٹمز میجو میں موجود ہوتے ہیں۔ بے بی فیڈنگ چیئرز لیے اس منفرد ریسٹورنٹ میں 6 ماہ سے 1 سال کی عمر تک کے بچے اپنے ماؤں کے ہمراہ کھانے کا مزا لوٹنے کے لئے تشریف لاسکتے ہیں۔

(مرسلہ: مریم یامین۔ سرگودھا)

ہوئے کہا۔ ان پر مجھے خط لکھا۔ میرے منہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ میں فرط جذبات سے گنگ ہو گیا تھا۔ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے تمہاری دھندلی سی صورت بھگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر تم نے میرے ساتھ جا کر فوٹو اتروائی۔ میرے ڈھیر سارے فوٹو نکال کر اپنے پرس میں رکھے۔ میں چپ چاپ تمہیں تنکٹا رہا۔

تم نے اپنے ہاتھ سے کھانا بنایا۔ اپنے کول

سنگاپور میں جب تم میرے ساتھ ٹائیگر بام گارڈن دیکھنے گئیں تو تم نے نارنجی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نارنجی رنگ میں تمہارا حسن دوا آئو کی طرح دکھ رہا تھا۔ لوگ چلتے چلتے ہمیں مڑ کر دیکھتے اور تم دھیرے سے مسکرا دیتیں۔ ہم پہاڑی پر پھیلے ہوئے باغ کو دیکھتے رہے۔ اس باغ میں کوئی پودا نہیں تھا۔ کوئی درخت نہیں تھا، مختلف چینی کہانیوں کو مورتیوں کی زبانی پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ زیادہ تر مورتیاں قلم و تشدد کی بولتی داستان تھیں۔ تم ان کو دیکھ کر چپ ہو جاتیں اور میں تمہیں چھیڑتا۔ ڈرگئی ہوتا! ”نہیں مجھے پتہ نہیں کیوں قتل و خون سے وحشت ہوتی ہے۔“

”قاتل تو تم ایمان سے بچی ہو۔“

تمہاری آنکھیں فرط حیرت سے پھٹ گئیں۔

”میں اور قاتل۔“

”ہاں..... ہاں تم ہو میری قاتل، تمہاری ان

آنکھوں نے مجھے جیتے جی مار رکھا ہے۔“

تم کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ کیسے تھے وہ دن۔ اور

کیسی تھیں وہ شامیں۔ کتنی جلدی وقت گزر جاتا

ہے۔ چار ماہ دیکھتے ہی دیکھتے بیت گئے۔ تم اب

واپس پاکستان جانے والی تھیں اور میں تمہارے

جانے کے خوف سے ہی ادھ موا ہوا جاتا تھا۔ تم

مجھے دلا سے دیتی دیتی رو پڑتی اور میں سب کچھ بھول

کر تم کو چپ کرانے لگتا۔ میرا دل اپنے آپ ہی

بھرا آتا تھا۔ کیا اسی کا نام محبت ہے میں سوچتا۔ آخر وہ

منہوس شام آئی تھی جس دن تمہیں جانا تھا۔ اس دن تم

صبح سے ہی میرے پاس تھیں۔ ہلکے موتیا رنگ کے

جوڑے میں ملبوس موتیا کی کلی لگ رہی تھیں۔ تم نے

میرا گھر سجا یا تم کتنی ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں میرے

لپے خرید کر لاتیں۔ میری پسند کے براڈ کے سگریٹ

بھی۔ خوبصورت سے پیڑ تم نے میری میز پر رکھتے

اسے اپنا راز دار بنایا۔ اسے اپنی محبتوں کی شدت کا یقین دلایا اور کہا میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میری بہن تمہارے گھر گئی۔ تم اس سے بڑی محبت سے ملیں۔ اس کی خاطر تو اسٹج میں کوئی کمی نہیں کی۔ میری بہن نے تمہاری امی سے شادی کے متعلق بات کی تو وہ کہنے لگیں۔ ہمارے ہاں خاندان میں شادی ہوتی ہے اور اس کی مگنی تو بچپن سے ہوئی ہے۔ ہم توڑ نہیں سکتے۔ میری بہن اپنا سامنہ لے کر واپس آگئی۔ جب مجھے سارے حالات معلوم ہوئے تو میں پاگل بن گیا۔ تمہیں نجانے کیا کیا لکھا مگر تم نے چپ سادہ لی۔ پھر تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ میں نے تمہیں کتنا کتنا کوسا۔ گالیاں دیں۔ شکوے شکایت کے دفتر کھولے مگر تمہاری خاموشی نہ ٹوٹی۔ وقت گزرتا گیا۔ اور آج صبح مجھے تمہاری شادی کا کارڈ ملا ہے۔ صبح سے میں اسی طرح بیٹھا نجانے کیا کیا سوچ رہا ہوں۔ تصویر میں تم کو دلہن بنایا، سچ پر لا کر بٹھایا۔ ابھی بات بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس کارڈ پر نظر پڑی میں پھر ہوش میں آ گیا۔ تم سامنے ہوئیں تو تم سے ضرور کچھ پوچھتا۔ تمہیں کس طرح میں اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دوں۔ تم تو میری روح ہو۔ روح کبھی جسم سے علیحدہ ہو سکتی ہے۔ میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا۔ شدت جذبات سے میرا جسم لرز رہا ہے۔ کاش تم میری بن جاتیں۔ تم صرف میری اپنی ہوتیں۔ میرا دل پکار پکار کر کہہ رہا ہے مگر تم تک میری آواز نہیں پہنچ سکتی۔ میرے دل کی دھک دھک میں بھی گونج رہا ہے۔ رات گزرتی جا رہی ہے۔ دیر دیر سے رات کا قسوں پھیلتا جا رہا ہے اور میں بیٹھا اپنے دل کی آوازیں سن رہا ہوں۔

تم میری ہو..... تم میری ہو.....!

.....❀.....❀.....

ہاتھوں سے مجھے بچوں کی طرح کھلایا۔ میرا دل بھرا آ رہا تھا مجھے بھوک بھی نہیں تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا تمہارے سینے پر سر رکھ کر خوب روؤں، چھین مار کر گریباں چاک کر دوں۔ سر کلزا دوں، کیا کروں، مگر میں چپ تھا۔ شام آگئی، تم نے آہستہ سے میرے ماتھے کو چوما اور اپنی آنسوؤں سے میری آنکھیں لیے اپنے گھر کی طرف چلی گئیں۔ تم نے اپنے گھر سے سامان لینا تھا۔ پھر شام کو ایئر پورٹ پر تم سے ملنا ہوا۔ سفید ساڑھی میں تم اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔ بڑا سارا جوڑا بغیر کسی پھول کے ویران ہو رہا تھا۔ تمہارے بھائی بھابی بھی ساتھ تھے۔ میں نے تمہارے لیے ساڑھی اور کچھ چیزیں لی تھیں۔ پیکٹ میں نے تمہارے ہاتھ میں پکڑا دیا اور وقت کتنی تیزی سے گزرا پتہ ہی نہیں چلا۔ سامنے جہاز کھڑا تھا۔ تم سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے مڑتیں اور مجھے دیکھتیں۔ آخر کی سیڑھی پر کھڑے ہو کر تم نے ننھا سا رومال ہلایا اور اندر چلی گئیں۔

تمہارے بھائی مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ معذرت چاہ کر میں ایئر پورٹ سے لکھا اور اپنے گھر آ کر مجھے اپنی سندھ بندھ بھی نہ رہی۔ ایک ہفتہ اس بے تابی سے کاٹا کہ تو بہ بھلی۔ تمہاری لائی ہوئی چیزیں دیکھتا تمہاری تصویر سامنے رکھے ڈیسر ساری باتیں پاگلوں کی طرح کرتا رہتا۔ پھر تمہارے خط آنے شروع ہوئے۔ ان میں بھی اتنی ہی چاہت کا اظہار ہوتا۔ میرے پاس ایک سوٹ کیس صرف تمہارے ہی خطوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں کس کس بات کو بھلاؤں کس چیز کو فراموش کر دوں۔ میں تو تمہارے سراپے میں ایسا الجھ کر رہ گیا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو سلجھانہ سکتا تھا۔ دن گزرتے گئے۔

پھر میں نے اپنی چھوٹی بہن کو پاکستان لکھا۔

کالا جادو

حافظ سعید



ایک صحافی کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ، وہ کالا جادو کرنے والوں کو بے نقاب کرنے چلا تھا!

بار سنسنی خیز رپورٹس دینا بھی ہماری ذمہ داری تھی۔ اخبار کی ساکھ اور بجٹ اتنا ہی تھا جتنا عموماً درمیانے درجے کے مقامی اخبارات کا ہوتا ہے۔ اس لئے اندرونی حالات بھی ویسے ہی تھے۔ ہم ہفتے میں دو تین بار عام کاغذ دیا کرتے تھے، مگر جمعہ اور اتوار کو سنسنی خیز کاغذ

ان دنوں میں ایک مقامی اخبار کے انویسٹی گیشن ٹیم میں تھا۔ بنیادی طور پر میرے ذمہ کرائم رپورٹنگ ہی تھی لیکن اخبار کے مالک نے مجھ سمیت دو اور رپورٹرز پر مستقل انویسٹی گیشن ٹیم بنا دی تھی۔ اب روئین کی خبروں کے ساتھ ساتھ ہفتے میں دو سے تین

کرتے۔ اس کے بعد ایک ایسی سنوری لکھی جاتی جس کے مطابق شہر بھر میں ہونے والے جرائم کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہو۔ اگلے دن یہ خبر دھوم دھام سے شائع ہوتی۔ ہم جب بھی کسی عامل کی تصاویر لاتے ہمارا مالک سب سے پہلے بخور ان تصاویر کا جائزہ لیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کا خیال ہو کہ کسی دن اس کے قابل رپورٹر اسی عامل کا پتہ چلا لیں گے جو اسے لوٹ کر فرار ہوا تھا۔ عاملوں کے خلاف ان خبروں والے اخبارات ڈی سی او سے لے کر متعلقہ تھانے تک کو بھیجے جاتے تھے جس کی وجہ سے ہر روز کسی نہ کسی عامل یہ ڈبہ بھر کے خلاف معمول کی کارروائی ہو جاتی تھی۔ ابتداء میں تو میں اس نئی مصیبت سے تنگ آ گیا۔ روٹین کی خبریں چھوڑ کر روز کسی نہ کسی عامل یا جادوگر کو تلاش کرتا اور اس کے خلاف لگ بھگ پچھلے دن جیسی کہانی لکھتا میرے نزدیک وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

پریس کلب جاتا تو وہاں بھی صحافی دوست مذاق اڑاتے کہ تمہارے مالک کو لوٹنے والا بھر پکڑا گیا یا نہیں؟ بہر حال یہ مذاق ہی ہوتا تھا کیونکہ لگ بھگ سبھی صحافیوں کو معلوم تھا کہ ہمارے ہاں مقامی اخبارات کا معیار کیا ہے اور چھوٹے اخبارات کے اکثر مالکان کس طرح اس مقدس پیسے کو ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

میرے ساتھ دیگر دو رپورٹرز میں اشرف شاہ اور مجیب ریاض شامل تھے۔ مجیب ریاض تو اس صورت حال پر باقاعدہ رپورٹنگ روم میں بیٹھ کر اخبار مالک کو برا بھلا کہتا تھا جس کی وجہ سے ہم کرائم بیٹ سے کٹ آؤٹ ہو گئے تھے اور اپنی گرفت کھوتے چلے جا رہے تھے۔ البتہ مجھے اور اشرف شاہ کو اب اس اسائنمنٹ میں بھی حزا آنے لگا تھا۔ ہم نے اپنی دلچسپی کے راستے تلاش کر لئے تھے۔ صبح گیارہ بجے

کی شکل دے دیا کرتے تھے جسے خصوصی اہتمام کے ساتھ اخبار میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ یہی ہمارا الٹی میٹیشن سیل تھا جس کی بنیاد پر اخبار کا مالک اپنے کاروباری حریفوں پر رعب جمایا کرتا تھا۔

ایک دن ہمیں حکم ملا کہ روٹین کی ساری خبریں چھوڑ کر ساری توجہ شہر میں موجود عاملوں اور ڈبہ بھروں پر مرکوز کر دو۔ اخبار کے موٹے مالک نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہہ لہرایا اور کہا مجھے ہر روز ان کے خلاف دھانسو قسم کی سنوری چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تصویریں بھی ہوں۔ اسی دن اخبار کے پہلے صفحے کا ایک چوتھائی حصہ ان سنوریز کیلئے مختص ہو گیا جو ہم تین رپورٹرز پر مشتمل ”الٹی میٹیشن سیل“ نے دی تھی۔ اس ساری صورت حال کا پس منظر ہمیں اگلے دن معلوم ہوا۔ ہمارے مالک کی بیوی کسی بڑے سے متاثر تھی۔ بڑے صاحب کے مطابق وہ کالے اور نوری دونوں علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ مالک کی بیوی کو ان بابا جی سے اس کی ہمسائی نے تحارف کروایا تھا۔ بابا جی اس کے گھر آئے تو ہمارے اخبار کا مالک بھی ان کا مرید بن گیا۔ اس بڑے نے ایک ہفتہ اخبار کے مالک کے گھر ڈیرہ لگائے رکھا اور ہمارے اخبار کو پاکستان کا سب سے بڑا اخبار بنانے کے لئے وظائف کرتا رہا۔ ایک ہفتے بعد معلوم ہوا کہ وہ جعلی بڑے تھا کیونکہ وہ اچانک اس گھر سے غائب ہو چکا تھا۔ اگر بات صرف ”بڑے صاحب“ کے غائب ہونے تک محدود رہتی تو شاید معاملہ اتنا سنگین نہ ہوتا لیکن بابا جی جاتے جاتے گھر میں موجود رقم اور زیور بھی لے آئے تھے۔ جس کی وجہ سے شہر بھر کے ”بھروں“ کی ہنجی آ گئی تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ ہم روز کسی نہ کسی عامل، بڑے، سادھو یا طوطا فال والے کو جا پکڑتے۔ اس کی تصاویر بناتے اور اس سے کچھ سوال و جواب

کھٹے پورے نہ ہوئے ہوں۔ اس عمل کے دوران یہ شرط بھی ہوتی ہے کہ اگر عمل کرنے والی خاتون کو اس طرح قبر پر بیٹھ کر نہاتے کوئی دیکھ لے تو بھی عمل ادھورا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح متعدد شرائط کے ساتھ یہ عمل اولاد دہرینہ کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ کھلم کھلا قبر کی توہین ہے۔ دراصل کالا جادو سارا ہی شیطان کی عبادت اور اسلامی تعلیمات کی توہین پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے کرنے والے کو کافر کہا جاتا ہے۔ ایسے عملیات کرنے والوں میں گورکن اور قبرستان انتقامیہ کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں اور اپنا حصہ لے کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

ایک دن دفتر آتے ہوئے میں نے ایک جنازہ دیکھا اس جنازے کے آگے آگے ایک آدمی گھن میں لٹا کسی بچے کی میت کو ہاتھوں میں اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ میں عادت کے مطابق جنازے کے احترام میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ جنازہ گزرنے کے بعد میں دفتر آ گیا لیکن کچھ ہی دیر بعد ذہن میں خیال آیا کہ ضرور اس بچے کی قبر پر بھی کسی کی نظر ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی قبر پر کالے جادو کے ماہرین کی خاص نظر ہوتی ہے اور وہ اس کے انتظار میں رہتے ہیں۔ بچے کی روح محسوم ہوتی ہے اس لیے ان کے ہاں یہ بات عام ہے کہ بچے کا ہزار قابو آ جائے تو وہ طاقتور ترین موکل ثابت ہوتا ہے۔ ان باتوں میں کس قدر سچ ہے اس سے قطع نظر میری دلچسپی صرف ایک دھماکہ خیز سنووری تک تھی۔ میں نے اشرف شاہ سے بات کی تو وہ بھی اس بات پر رضامند ہو گیا کہ ہم آج رات قبرستان میں گزاریں گے اور اگر کوئی حامل اس قبر تک آیا تو اس کو رتے ہاتھ پکڑ کر ایک بھر پور خبر تیار کر لیں گے۔ اس شام میں اور اشرف شاہ مغرب کے فوراً بعد ہی قبرستان پہنچ گئے اور بچے کی قبر سے کچھ ہی دور ایک پختہ قبر کی لوٹ میں بیٹھ گئے۔

رپورٹرز کی میٹنگ کے بعد ہم سیدھے کسی ایسے جعلی حامل کے اڈے پر پہنچ جاتے جس کے بارے میں ایک روز قبل ہی فیصلہ کر لیا ہوتا تھا۔ وہاں جا کر چند تصاویر بنانے کے ساتھ ساتھ ارد گرد کے لوگوں سے اس کے بارے میں سوالات کرتے اور اپنی سنووری کھل کرنے کے بعد ایسی جگہوں کی خاک چھاننے لگتے جہاں سچ میں عملیات ہوتے ہوں۔ اس اسائنمنٹ کے دوران ہم نے شہر بھر کے قبرستان چھان مارے۔ اس کے علاوہ دریائے کنارے اور ہندوؤں کے شمشان گھاٹ پر بھی گئے۔ آہستہ آہستہ میری دلچسپی بڑھنے لگی اور میں نے کالے جادو اور دیگر عملیات کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنی شروع کر دیں۔ چند ہفتوں میں ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ شہر میں کہاں کہاں کون کون سے حامل یا جادوگر موجود ہیں اور کس کا کیا پس منظر ہے۔ اسی طرح عملیات کے طریقہ کار، چوکی لگانا اور ہانڈی اڑانا جیسے کاموں کے بارے میں بھی میرے پاس سیر حاصل معلومات اکٹھی ہو گئیں۔ میرے ساتھ ساتھ اشرف شاہ بھی اس سارے سلسلے میں برابر کا شریک تھا جبکہ عجیب ریاض اپنی سنووری بنانے کے بعد یا تو دفتر بیٹھا رہتا یا پھر پریس کلب چلا جاتا۔ وہ یہ اسائنمنٹ مجبوری کے عالم میں ہی پوری کر رہا تھا لہذا روز اس پیر کو کوستا جو ہمارے مالک کے گھر کا صفایا کر گیا تھا۔

میری کئی عاتلوں اور جادوگروں سے دوستی ہو چکی تھی جن سے کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی تھی۔ انہی میں سے کالے جادو کے ایک ماہر نے بتایا کہ اکثر حامل اولاد کے لیے خواتین کو ایک ایسا عمل بتاتے ہیں جس میں تازہ مردے کی قبر پر بیٹھ کر رات کے وقت نہانا شرط ہے۔ اس میں بھی بعض اوقات بہتر نتائج کے لیے شرط لگا دی جاتی ہے کہ قبر ایک سال سے کم عمر کسی ایسے بچے کی ہو جسے مرے 24

تھی۔ ارد گرد سے بے خبر وہ سیدھی بچے کی قبر کے پاس آئی اور اس پر بیٹھ گئی۔ ہم نے منہ پھیر لیا کیونکہ وہ برہنہ ہو کر غسل کر رہی تھی۔ پانی گرنے کی آواز اور چوڑیوں کی کھٹکناہٹ قبرستان کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ اس کی حالت کے پیش نظر ہم اسے قبر کی بے حرمتی سے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد پانی کے گرنے کی آواز تھی تو ہم اس قبر کی اوٹ سے نکل کر اس خاتون کے سامنے آ گئے۔ ہمیں دیکھ کر وہ نہ صرف گھبرا گئی بلکہ قدرے پریشان بھی ہو گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ ہماری موجودگی کی وجہ سے اس کا یہ عمل تو ناکام ہوا ہی ہے لیکن اب ہم اس کی بدنامی کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔ اشرف شاہ نے اپنے کمرے سے اس کی تصاویر بنانا شروع کیں تو وہ مزید خوفزدہ ہو گئی۔ ہم نے اسے روایتی صحافیانہ انداز میں کہا کہ اگر وہ ہمیں اصل کہانی سے آگاہ کر دے تو اس کا نام کہیں نہیں آئے گا بصورت دیگر اس کی تصاویر اور اس حرکت کے بارے میں اخبار میں سنسوری چھاپ دی جائے گی۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ ہمیں اصل کہانی سنانے پر آمادہ ہو گئی۔ وہ اولاد نرینہ کے لیے عیا یہ عمل کر رہی تھی۔ اس کی مجبوری اور اس عمل کی وجہ ایک الگ کہانی ہے اس لیے وہ پھر کسی وقت سناؤں گا۔ بہر حال اس سے ہمیں اس عامل کا بھی معلوم ہو گیا جس نے اسے یہ عمل کرنے کا کہا تھا۔

اگلے دن دوپہر کے وقت اشرف شاہ کہنے لگا کہ ہم اس عامل سے ملتے ہیں اور پھر کل رات والی کہانی اور اس عامل کی کہانی کو ملا کر زبردست رپورٹ بن جائے گی۔ میں نے اسے منع کرتے ہوئے بتایا کہ میری اطلاعات کے مطابق وہ عامل واقعی کالا جادو کرتا ہے اور اسے اس حوالے سے ماہر جادوگر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس کے منہ سے لگ کر کسی

وفا

○..... وفا وہ منزل ہے جس کا پتہ محبت آج بھی ڈھونڈ رہی ہے۔

☆..... وفا وہ دل ہے جو ہمیشہ دھڑکتا ہے۔

○..... وفا ایک ایسا آنسو ہے جو خاموشی سے ڈھلک جاتا ہے۔

☆..... وفا وہ دامن ہے جو ہمیشہ محبت کے آگے پھیلا یا جاتا ہے۔

○..... وفا ایک آئیڈیل ہے جو کبھی محبت کو حاصل نہیں کر سکتا۔

(مرسلہ: رابعہ بشیر/ لاہور)

چاندنی رات کی وجہ سے قبرستان ہر روز کی طرح مکمل اندھیرے میں نہیں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ دور تک کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم کافی دیر تک بچے کی قبر پر نظریں جمائے بیٹھے رہے لیکن وہاں کوئی نہ آیا۔ آدھی رات کے بعد اشرف شاہ نے سرگوشی میں کہا۔ شاہ! میرے خیال میں اب چلتے ہیں۔ یہاں کوئی نہیں آنے والا۔

اس کی بات سن کر میں نے چند لمحوں کے لیے سوچا اور پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ آدھا گھنٹہ اور دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد چلے جائیں گے۔

ابھی میری بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ہمیں پائل کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی لہر دوڑ اٹھی۔ بچپن میں چڑیلوں کے بارے میں سنی سبھی کہانیاں ذہن میں تازہ ہونے لگیں۔ آدھی رات کو قبرستان میں پائل کی جھنکار مضبوط سے مضبوط اعصاب کے مالک شخص کو بھی لہو بھر کے لیے ڈمگانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم حوصلہ ہار بیٹھتے ہمیں ایک خاتون اسی جانب آتی نظر آئی۔ پائل کی جھنکار اسی کے قدم اٹھانے پر سنائی دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ میں ایک بالٹی اٹھا رکھی

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیش کش

عباداتِ رمضان المبارک

شائع ہو گیا ہے

قیمت 175 روپے



رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے رمضان المبارک کے آنے کی خوشی منائی اللہ تعالیٰ اسے ایک سال تک خوشیاں عطا فرماتا ہے اور جس نے رمضان المبارک کے جانے کا غم منایا اس سے ایک سال غم دور ہٹا دیتا ہے۔

- رمضان کیا ہے۔
- رمضان اور روزہ
- رمضان اور قرآن
- رمضان اور شب قدر
- رمضان اور اعتکاف
- رمضان اور تراویح
- رمضان کی عبادات
- وظائف اور دعائیں
- رمضان اور نوافل
- رمضان کی عبادات کا اثر تمام سال کیسے رہتا ہے۔
- رمضان میں عورتوں کے مسائل اور ذمہ داریاں
- ایک مکمل اور جامع گائیڈ۔ گھر کے ہر فرد کیلئے۔ آپ کے دوست احباب کیلئے رمضان کا بہترین تحفہ!
- اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔
- خود پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ، ریلوایاں گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

قدر بیماریوں کا شکار کیسے ہو گیا۔ اشرف شاہ کو امیر جنسی میں رکھا گیا تھا۔ وہ مسلسل خون کی اٹلیاں کر رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے جسم میں خون کی کمی بھی ہو گئی تھی۔ اسے خون لگایا جا رہا تھا۔

اشرف شاہ ایک ہفتہ اسی طرح ہسپتال میں انتہائی نگہداشت میں رہا اور خون کی اٹلیاں کرتا رہا۔ ایک ہفتہ بعد اس کے بھائی کا فون آیا وہ روتے ہوئے بتا رہا تھا کہ ”اشرف شاہ مر گیا ہے“۔ ایک ہفتہ سکرانا صحت مند صحافی چند ہی دنوں میں جان لیوا بیماری کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ اسی دن مجھے اجنبی نمبر سے فون آیا۔ فون کرنے والے نے اپنا تعارف ایک عامل کے طور پر کروایا اور کہا: اس دن تم نے میری بالکی کی عزت بچائی تھی اور اس کی تصویر شائع ہونے سے روکی تھی۔ اس لیے تم بچ گئے ہو۔ جس نے میرے علم کا مذاق اڑایا اس کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا اس نے کال منقطع کر دی اور وہ نمبر بھی بند ہو گیا۔

جہاں تک میڈیکل سائنس کہتی ہے۔ اشرف شاہ پھیپھائیں جیسی مہلک بیماری کی آخری سطح پر تھا۔ یہ بیماری اندر ہی اندر اس کے جگر کو تباہ کرتی رہی لیکن بظاہر اس کے اثرات واضح نہ ہوئے۔ اشرف شاہ کو بھی اس کا علم تب ہوا جب اس کا معدہ خون سے بھرنے لگا اور وہ خون کی اٹلیاں کرنے لگا۔ اس بیماری نے جہاں ہزاروں پاکستانیوں کی جان لی وہیں اشرف شاہ بھی اس کا شکار ہو گیا۔ دوسری جانب ہمارے دفتر کے عملے سمیت متعدد دوستوں کا کہنا ہے کہ پھیپھائیں محض ایک بہانہ تھا ورنہ اشرف شاہ کو کالے جادو کے ذریعے قتل کیا گیا ہے۔ اس عامل نے بھی یہی کہا تھا کہ تم خون تھوکتے مروجے اور پھر واقعی چند دن کے اندر اندر اشرف شاہ خون تھوکتے مر گیا۔



مصیبت کو دعوت دینے سے گریز کرنا چاہیے۔ اشرف شاہ نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا اور اکیلا ہی اس عامل سے ملنے چلا گیا۔ اگلے دن اس نے اس عامل کی تصاویر اور یہ پوری کہانی شائع کروا دی البتہ اس خاتون کی تصاویر میرے کہنے پر شائع نہیں کیں۔ وہ ایک عزت دار گھرانے کی خاتون تھی جو انتہائی مجبوری کے عالم میں اس عامل کے چکر میں پھنسی تھی۔ اخلاقی طور پر اس کی عزت اچھالنا درست نہیں تھا۔

اشرف شاہ کی یہ سنووری بہت مشہور ہوئی اور بچے کے لواحقین نے قبر کی اس طرح بے حرمتی کر دانے پر عامل کے خلاف احتجاج بھی کیا۔ کچھ دن یہ معاملہ اچھلتا رہا اور پھر حسب معمول سرد خانے کی نذر ہو گیا۔ اشرف شاہ کے بقول جب وہ عامل کی تصاویر بنا رہا تھا تو اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم مجھے نہیں جانتے۔ مجھ سے پنکا لو گے تو خون تھوکتے مروجے۔ اشرف شاہ نے اس کی یہ بات نظر انداز کر دی۔ ہم چونکہ ایسی جگہوں پر علاقائی پولیس کو ساتھ لے کر جاتے تھے اس لیے ان عاملوں کی جانب سے نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس عامل سے ملنے کے بعد جب اشرف شاہ واپس دفتر آیا تو ہتے اور اس عامل کی نقل اُتارتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ پولیس کے سامنے بیٹکی بلی بنا ہوا تھا۔ دو پولیس والوں کو تو جلا کر رکھ کر نہیں سکا البتہ مجھے موت کی خبریں سنارہا تھا۔

کچھ دن یونہی گزر گئے پھر ایک دن اشرف شاہ دفتر نہ آیا۔ اس کے گھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ رات اس کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی جس پر اسے ہسپتال لیجا یا گیا تھا۔ ہم بھانجی بھانجی تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اشرف شاہ کو پھیپھائیں سی سمیت متعدد بیماریاں لاحق ہیں۔ اس کے بھی ٹیسٹ مختلف بیماریوں کو ظاہر کر رہے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ جس شخص کو کبھی سر درد تک نہیں ہوا وہ اچانک اس



نواز خان

محبوب، محبوبہ اور شوہر

نواز خان

محبوب، محبوبہ اور شوہر

”وہ ایک ضدی لڑکی تھی، اس نے ایک شخص سے تھپڑ کا بدلہ لینے کے لیے اپنی زندگی جہنم بنائی“

ایک بڑی خاص خبر لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے۔ اگر یہ خبر خاص نہ ہوئی تو میں کبھی آپ کو تکلیف نہ دیتا۔ ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے گلا صاف کیا اور میز پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا ”جناب کل ہفتہ تمہارے ہفتے کی شام ”صد“ کے ایک چائے خانے میں ناچ گانے کی محفل جمی ہے۔ چائے خانے کے مالک کا نام گلزار خاں ہے میرا خیال ہے آپ اُسے جانتے ہی ہوں گے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”ہاں..... ہاں تم آگے بولو۔“

وہ کہنے لگا ”کل رات وہاں شاہی بھی موجود تھا ناچ گانے کے بعد تاش کی بازی ہونے لگی۔ شاہی بھی کھیل رہا تھا۔ اس نے رم کے کئی گلاس چڑھائے ہوئے تھے اور نفعے میں دھت تھا۔ کھیل کے دوران اس کا ہمیش نامی ایک پٹھان کوٹی سے جھگڑا ہو گیا۔ دراصل ہمیش نے کھیل میں بے ایمانی کی کوشش کی تھی۔ شاہی آگ بگولا ہو گیا اس نے

بچھلی دفعہ میں نے گوبند سنگھ نامی نوجوان کا ذکر کیا تھا۔ ارائیں گھرانے کا یہ لڑکا ایک دوڑ کے دوران کم ہو گیا تھا اور کوشش کے باوجود مل نہیں سکا تھا۔ گوبند کے ساتھ ”شاہی“ نام کے غنڈے کا ذکر بھی آیا تھا۔ شاہی ایک بھگوڑا فوجی تھا اور خود کو ڈوگر بتاتا تھا۔ اس کے پاس ہر وقت ایک تلوار رہتی تھی اور مشہور تھا کہ وہ تلوار کے مقابلے میں اپنے سامنے کسی کو ٹکٹے نہیں دیتا تھا۔

گوبند کو گم ہوئے قریباً آٹھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک روز علاقے کا ایک مشہور جیب کترا جیل میسرے پاس آیا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وہ عیسائی تھا۔ ڈلہوڑی کے بد قماش افراد میں اُس کا اُلٹنا بیٹھنا تھا اور ارد گرد کا ہر بدنام اڈہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ جیسی جیسے لوگ اپنی مرضی سے تھانوں کا رخ کم ہی کرتے ہیں اور جب کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے ضرور کوئی ہم بات ہے۔ جیسی بھی ایک اہم معاملہ لے کر تھانے آیا تھا۔ رکی بات چیت کے فوراً بعد وہ اصل موضوع پر آ گیا۔ کہنے لگا ”جناب عالی! میں

ایک حوالدار اور دو کانشیل لے کر میں اس کی طرف روانہ ہوا۔ جیل کی زبانی مجھے پتہ چلا تھا کہ شای اس وقت اپنے ڈیرے پر ہوگا۔ اس کا ڈیرہ ”ست دھارا“ کے راستے میں حیرتوکل کے مزار کے قریب تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈیرے پر ہر وقت لوہروں کا مجمع لگا رہتا ہے اور ان لوہروں میں بعض اوقات خطرناک غنڈے بھی اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ڈیرے میں کس کر شای پر ہاتھ ڈالنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے شای کو کسی بہانے ڈیرے سے باہر بلایا جائے اور پھر موقع دیکھ کر جھکڑی ڈال دی جائے۔ اس مقصد کے لیے ہیڈ کانشیل قادری کو استعمال کیا جاسکتا تھا۔ قادری صرف دو روز پہلے میرے تھانے میں تبدیل ہو کر آیا تھا۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ پولیس کا آدمی ہے۔ میں اسے سادہ کپڑوں میں لایا تھا۔ وہ اندر جا کر شای کو بہانے سے باہر لاسکتا تھا۔ قادری کو پوری بات سمجھا کر میں نے شای کے ڈیرے پر بھیج دیا اور خود قریبی درختوں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ حوالدار پر بت سنگھ اور ہیڈ کانشیل میرے ساتھ تھے۔ ہیڈ کانشیل کے پاس قمری ٹاٹ قمری رائفل اور میرے پاس 38 بور کا ریوالور تھا۔ گاڑی ہم نے قریب ایک فرلانگ پیچھے ہی کھڑی کر دی تھی اور امید نہیں تھی کہ وہ شای یا کسی دوسرے شخص کی نظر میں آسکے گی۔

ہیڈ کانشیل قادری اندر چلا گیا اور ہم پوری طرح چوکس ہو کر شای کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ قریباً پانچ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ شای نکلانہ قادری کی صورت نظر آئی اور نہ ہی کوئی تیسرا شخص دکھائی دیا۔ میں نے ہیڈ کانشیل کو سمجھایا تھا کہ وہ اندر پہنچے ہی شای سے بات کرے اور اُسے بتائے کہ پشاور سے دو آدمی اسے ملنے آئے ہیں۔ وہ ڈیرے پر آنا نہیں چاہے اس لیے باہر کھڑے

اُٹھ کر میز اُٹادی اور ہمیش کو گالیاں دینے لگا۔ گرما گرمی میں اس کے منہ سے ایک عجیب بات نکل گئی کہنے لگا ”یہ جوا ہے اور جوئے میں دھوکا کرنے والے کا منہ توڑ دیتا ہوں۔ اس حرامی کو بند کا نام سنا ہوگا تم نے اس نے بھی دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کتے کے لمبے کا نشان مٹا دیا میں نے“ نشتے کی وجہ سے اسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا کہہ گیا ہے۔ موقع پر موجود جن لوگوں کو اس کی بات سمجھ میں آئی وہ حیرانی سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ حیران ہونے والوں میں میں بھی شامل تھا جناب عالی..... کل سے سوچ رہا تھا کہ اس بات کی اطلاع آپ کو ملنی چاہئے گو بند ہمارے محلے کا لڑکا تھا۔ زیادہ میل جول نہ سکا، علیک سلیک تو تھی۔ ہمیں اس کے نہ ملنے کا ڈکھ ہے۔ اس کی بوڑھی ماں کو دیکھتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

جیل اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا اور میں ذہن میں زبردست انچل محسوس کرنے لگا۔ یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی اور جیل کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے درست کہہ رہا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجرم کوئی جرم کرتا ہے اور جب جرم کرنے کے کافی عرصے بعد تک بھی اسے کوئی سزا نہیں ملتی تو وہ اپنے جرم کے بارے میں لاپرواہ ہو جاتا ہے اور کسی وقت شہنشاہی میں آکر جرم کا اعلان بھی کر دیتا ہے۔ میں نے جیل سے کچھ تفصیلات پوچھیں اور اس کے فوراً بعد شای پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسا کہ میں نے پہلی کہانی میں بتایا تھا شای نے تیمور والے کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری کرائی تھی لیکن یہ ایک بالکل دوسرا معاملہ تھا۔ اور اس میں میں بلا روک ٹوک شای کو جھکڑی لگا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا شای ایک خطرناک غنڈہ ہے اور آسانی سے گرفتاری نہیں دے گا۔ لہذا میں نے خود اس کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

لہجے میں کہا۔

ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ شاہی رُخ پھیر کر بھاگ نکلے گا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ارادہ بدل دیا۔ وہ کوئی معمولی بدمعاش نہیں تھا۔ ڈلہوزی کا ”بہرام شاہ“ تھا۔ وہ یوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتا تو کیا ”عزت“ رہ جاتی اس کی..... اُس نے بھاگنے کی بجائے مجھے بھاگنے کا فیصلہ کیا اور ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنے پہلو سے بندھی ہوئی تلواریں بے نیام کر لی۔ وہ کوئی تین فٹ لمبی غم دار تلواریں تھیں۔ میں نے شاہی کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی دیوانگی دیکھی اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولی چلا دی۔ دھماکے کے ساتھ آدھا ٹکڑا لہجہ شاہی کی کلائی میں گھس گیا۔ اس نے تڑپ کر تلواریں دوسرے ہاتھ میں تھامنی چاہی لیکن میں اُس لمحے میں جب تلواریں پر کسی ہاتھ کی گرفت بھی مضبوط نہیں تھی ہیڈ کانسٹیبل نے ٹانگ چلائی اور اُس کی ٹھوک سے تلواریں اڑ گئیں۔ میں نے جست لگا کر شاہی کو دیوچ لیا اور پھر فوراً ہی ایک فٹ زمین سے اوپر اٹھا کر بیچ دیا۔ شاہی کے ایک ساتھی نے ہیڈ کانسٹیبل پر چاقو سے وار کرنا چاہا لیکن راتقل کی دھمکی کام آئی اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ میرا گھٹنا شاہی کی گردن پر تھا اور ریوالور اُس کی کٹھنی سے لگا ہوا تھا۔ اپنے سرخندہ کو اس حالت میں دیکھ کر کسی جھپٹے چاٹھے کو مت نہیں ہوئی کہ وہ پولیس پارٹی پر حملہ کر سکتا۔ میرے گرائڈیل حوالدار نے شاہی کا ایک بازو مروڑ کر اپنے گھٹنے کے نیچے دبایا اور اُسے جھکڑی لگا دی۔ شاہی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ کشمیری کے علاوہ اردو اور ہندی میں بھی گالیاں بک رہا تھا۔

شاہی جیسے غنڈوں کو سیدھا کرنے کے لیے پولیس کے پاس بہت جھکنڈے ہوتے ہیں۔ میں نے کوشش کی کہ مجھے شاہی پر کوئی ایسا جھکنڈا

ہیں۔ پشاور میں کچھ جرائم پیشہ لوگوں سے شاہی کے تعلقات تھے اور مجھے امید تھی کہ پشاور کے مہمانوں کا ذکر سن کر وہ افراتفری میں باہر آجائے گا، میرا خیال تھا کہ شاہی کے باہر آنے میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے..... لیکن اب آٹھ منٹ ہونے کو آئے تھے۔ گزرنے والے ہر سیکنڈ کے ساتھ ہماری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ یقیناً اندر کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ چند ہی لمحے بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اچانک ڈیرے کا بیرونی بھانک ایک جھکے سے کھلا اور کوئی شخص لڑھکتا ہوا باہر آگرا۔ میں نے سفید لباس سے پہچانا۔ وہ قادری کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یوں لگا جیسے قادری نے بھاگ کر پھانک سے گزرنے کی کوشش کی اور کسی نے زور دار طریقے سے اُسے دھکا دے دیا۔ جونہی قادری دوبارہ اٹھا تین افراد بھوکے کٹوں کی طرح اس سے لپٹ گئے۔ وہ اسے مار رہے تھے اور کھینچ کر پھر اندر لے جانا چاہتے تھے۔ ان میں شاہی بھی تھا۔ اپنے لیے قد اور چمکتی ٹنڈ کی وجہ سے وہ صاف پہچانا جا رہا تھا۔

قادری کی مار پٹائی کا منظر دیکھ کر ہمارے لیے خاموش کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ نہ ہی سوچنے کا وقت تھا کہ اس مار پٹائی تک نوبت کیونکر اور کیسے پہنچی۔ میں نے ریوالور ہولسٹر سے باہر کیا اور چیزی سے لپک کر شاہی وغیرہ کے سر پر پھینچ گیا۔ راتقل بدست ہیڈ کانسٹیبل اور حوالدار میرے پیچھے تھے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی شاہی طیش سے سرخ ہو گیا۔ وہ ایک سر پھرا خطرناک غنڈہ تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان سنگین لمحات میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ریوالور کی لمبی پری میری انگلی پوری طرح تیار تھی۔

”خبردار شاہی! پیچھے ہٹ جاؤ“ میں نے سرد

اللہ کے رسول دین کے پیغمبر جو حقیقت و کائنات کی بنیاد ہیں

سیارہ ڈائجسٹ

کا

عظیم الشان اور روح پرور



قیمت: 175 روپے ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

اپنی سابقہ روایات کے شایان شان یہ نمبر پیغمبرانِ خدا کی
حیاتِ جاوداں اُن کے معجزات اور ایمان افروز واقعات پر مشتمل
ایک متاعِ بے بہا اور جارب و دستاویز ہوگا۔

ایجنٹ حضرات فوری طور پر اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاؤں لاہور۔ فون: 37245412

کی۔ اسے بدستور چھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ اسی لباس میں تھا جس میں گرفتار ہوا تھا۔ یہ ایک خاص قسم کی دھوئی ہوتی ہے جس کے ایک پلو کو ٹانگوں کے درمیان سے گزار کر پیچھے کمر میں اڑس لیا جاتا ہے۔ اس دھوئی کے اوپر شاہی نے کھلی آستین والا ایک کڑھائی دار گرد پہنا تھا۔ سخت سردی میں بھی وہ اکثر اسی لباس میں دکھائی دیا کرتا تھا۔ میں نے شاہی سے کہا ”حوالدار پر بت سگھ بتا رہا تھا کہ تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو۔“

اُس نے کینہ پرور نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا ”اسپیکٹر نواز! تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اُس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا ”بے شک بُرے کام کا نتیجہ بُرا ہی نکلتا ہے۔ اگر میں نے کوئی بُرا کام کیا ہے تو اس کی سزا مجھے ضرور ملے گی..... جیسے تمہیں ملی ہے۔“

وہ غصے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بولا ”میں بھگوان کی سوغند کھاتا ہوں کہ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔“ میں نے کہا ”ترس تو مجھے بھی تم پر آ رہا ہے لیکن اگر تم اسی طرح میرا وقت ضائع کرتے رہے تو مجھے پھر تمہیں حوالدار پر بت سگھ کے حوالے کرنا پڑے گا۔“

اُس نے ایک بہت گہری سانس لی اور ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولا ”اس وقت کو یاد رکھنا اسپیکٹر اس وقت کو بھولنا مت۔“

وہ مجھے ایک خوفناک دھمکی دے رہا تھا۔ میں ایسی بہت سی دھمکیاں سن چکا تھا اور ان سے بیٹ چکا تھا لہذا میں نے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ پولیس کے پیشے میں بندہ ایسی دھمکیوں سے ڈرنے لگے تو پھر اسے ٹریفک پولیس میں چلے جانا چاہئے یا چھٹی کر کے گھر بیٹھ جانا چاہئے۔ خاص طور پر ایماءدار ملازموں کے لیے یہ پولیس لائن ضرورت

استعمال نہ کرنا پڑے لیکن جب وہ کسی طور قابو میں نہیں آیا تو میں نے حوالات میں اُسے حوالدار پر بت سگھ اور اس کے تین ماتحتوں کے حوالے کر دیا۔ پر بت سگھ حوالاتیوں کے لیے عزرائیل سمجھا جاتا تھا۔ میری ماتحتی میں آکر وہ ایک عرصے سے بیکار ہی تھا۔ مدت بعد جب اُسے کام ملا تو اُس نے خوب دل لگا کر کیا۔ شاہی کو ایسی فنکارانہ پیشانی لگائی گئی کہ 48 گھنٹے کے اندر اندر اُس کی ساری اکڑفوں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی اور وہ اپنی جان حوالدار کے پنجے سے چھڑانے کے لیے سب کچھ اُگلنے پر راضی ہو گیا۔ حوالدار کا کمال یہ تھا کہ اُس کی لگائی ہوئی پیشانی کا نشان تک حوالاتی کے جسم پر نہیں ملتا تھا یعنی بقول شاعر ”تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو“ میں شاہی کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ نہ اُس کے چہرے پر کوئی نشان تھا نہ ہاتھ پاؤں پر نہ جسم کے کسی اور حصے پر لیکن وہ چوٹوں سے چور نظر آتا تھا۔ شاہی کو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ 48 گھنٹے حوالات میں مار کھاتا رہا ہے اس کے باوجود اس کے مالکوں میں سے کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ جیسا کہ قارئین کھیلی کہانی میں پڑھ چکے ہیں کہ شاہی کے مالک سردار اشوک وغیرہ تھے۔ لیکن یہ لوگ شاہی کے غیر قانونی کاموں میں اُس کا بچاؤ کرنے پر تیار نہیں تھے۔ سردار اشوک ایک بھلا مانس آدمی تھا اور وہ صاف طور پر مجھ سے کہہ چکا تھا کہ اگر ”شاہی“ مجرم ہے تو اُسے کیے کی سزا ملنی چاہیے اور اب حسن اتفاق سے شاہی کے جرم کا انکشاف اُس کی اپنی زبان سے ہو گیا تھا۔ بھری محفل میں اس نے کہا تھا کہ گو بند سگھ کے ساتھ اُس نے ”کچھ کیا“ ہے۔ سردار اب اس کی مدد کو کیسے آسکتے تھے؟

اپنے دفتر میں میں نے شاہی سے پوچھ کچھ

وہ پکڑ لیتے ہیں۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ وہ چکر دار رستے پر بھاگا تھا میں ناک کی سیدھ میں گیا اور تھوڑا نیچے جا کر اسے چھاپ لیا۔ وہ دست بدست لڑائی پر اتر آیا۔ اس نے بنیان کے نیچے ٹیکر میں چاقو چھپا رکھا تھا۔ جب چاقو اس نے ہاتھ میں لیا تو میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اس کا وار بجا کر ناک پر ٹکڑ جو ماری تو وہ کوئی تیس فٹ نیچے ایک گڑھے میں جا گرا۔ اُس کے سر پر چوٹ آئی اور ناک سے خون جاری ہو گیا۔ میں نیچے پہنچا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہائے ہائے کر رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے نوٹ نکالے اور ڈھلوان چڑھ کر واپس ڈیرے پر آ گیا۔ اس وقت میرا خون بُری طرح کھولا ہوا تھا..... لیکن آدھ پون گھنٹے بعد جب دماغ ذرا ٹھنڈا ہوا تو مجھے اس کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ اتنی سردی میں اسے وہاں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ میں نے ڈیرے سے ایک کارندے دو لورام کو بھیجا کہ وہ نیچے جا کر گوبند کو اٹھا لائے۔ دو لورام دو اور لڑکوں کو ساتھ لے گیا۔ پون گھنٹے بعد انہوں نے آکر مجھے بتایا کہ گوبند وہاں نہیں ہے۔ میں سمجھا کہ وہ ہوش میں آکر چلا گیا ہوگا لیکن دوپہر کو پتہ چلا کہ گوبند مل نہیں رہا۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی میرے دماغ میں آیا کہ ہونہ ہو وہ کسی ہسپتال میں ہے۔ شاید کسی نے اسے زخمی حالت میں دیکھا ہو اور ہسپتال پہنچا دیا ہو۔ میں نے اگلے روز ڈیپوزی کے سارے ہسپتالوں اور دو خانوں میں پتہ کروایا لیکن گوبند کا کہیں سراغ نہیں ملا..... بعد میں بھی دو تین ہفتے تک میں نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔“

شاہی جو کہانی سنار ہاتھ دلچسپ تھی لیکن میرے لیے اس پر فوراً یقین کر لینا ممکن نہیں تھا۔ شاہی نے اتنا اعتراف تو کر لیا تھا کہ رقم کے معاملے پر گوبند

نے اپنے منصوبے کے مطابق کام کیا۔ سندر گاؤں تک وہ تیمور کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا لیکن سندر گاؤں اور ٹیکراگلی کے درمیان شمال موڑ پر وہ ریس سے نکل گیا اور ڈھائی تین فرلانگ نیچے سیدھا میرے ڈیرے پر آ گیا۔ میں اس وقت ڈیرے پر اکیلا تھا۔ گوبند کے پہنچنے ہی میں نے وعدے کے مطابق بتایا ڈھائی ہزار روپیہ اس کی آٹھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے یہ ڈھائی ہزار روپیہ ڈور پھینک دیا۔ کہنے لگا تم نے سیٹھ کرم چند سے پندرہ ہزار روپیہ وصول کیا ہے اور اس رقم میں سے کم از کم دس ہزار اسے ملنا چاہیے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ پندرہ ہزار نہیں صرف دس ہزار روپے میں بات طے ہوئی تھی۔ جس میں سے ہم دونوں آدھے کے حقدار ہیں۔ وہ میری بات سننے پر تیار نہیں تھا اسے کسی نے خوب بھڑکا رکھا تھا۔ کہنے لگا میں دس ہزار سے ایک کوڑی کم نہیں لوں گا۔ وہ مجھے جانتا نہیں تھا اگر ٹھیک طرح جانتا ہوتا تو ایسی بات نہ کرتا۔ دنیا جانتی ہے کہ شاہی بد معاش ضرور ہے بے اصول نہیں ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ خواخوہ اوکھلی میں سر نہ دے۔ اُسے پتہ نہیں کہ وہ کس سے ٹکڑ لے رہا ہے..... وہ تو کسی طور پر قابو ہی نہیں آ رہا تھا۔ معلوم نہیں کیسی ہوا اُس کے دماغ کو چڑھی ہوئی تھی..... انسپکٹر! میں تمہیں ہر بات صاف سیدھی بتا رہا ہوں اب یقین کرنا یا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ میں بہت ڈر رہا تھا کہ کہیں میرا میٹر گھوم گیا تو یہ حرامی میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جائے گا لیکن لگتا تھا کہ وہ آتما تھیا کا پروگرام بنا کر آیا ہوا ہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ لال پیلا ہونے لگا پھر ایک دم اُس نے میرے ہاتھوں سے ساڑھے چھ ہزار کے نوٹ چھین لیے اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کا خیال ہوگا کہ وہ دوڑ کا چیمپئن ہے اُسے کون پکڑ سکتا ہے لیکن جنہوں نے پکڑنا ہوتا ہے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں پڑیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہر ای بک کی ہائی کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



ایسا ہو بھی جاتا تو قرب و جوار سے انسانی جسم کے بچے کچے حصے ملنے چاہئے تھے۔

وہ ڈلہوڑی کی ایک دھواں دھواں شام تھی سردی اپنے جو بن پر تھی۔ چیز اخروٹ اور دیودار کے بلند و بالا درختوں میں نمناک بدلیاں چکرار ہی تھیں۔ دُور کہیں نشیب میں گا ہے گا ہے بندر چیتھے تھے اور ان کی آواز پورے جنگل میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں اور بلال شاہ اس مقام پر کھڑے تھے جہاں آٹھ مہینے پہلے گوبند زخمی ہو کر گر تھا اور بقول شاہی آدھ پون گھٹنے کے اندر اندر غائب ہو گیا تھا۔ یہ ڈھلوان پر واقع ایک تنگ سی گھاٹی تھی۔ گہرائی پچیس میٹر فٹ کے قریب ہوگی۔ یہ ساری جگہ گھنے سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ گھاٹی کی تہہ میں چھوٹی بڑی جھاڑیاں تھیں اور ایک چھوٹی سی آب جو گزرتی تھی۔ گھاٹی کے کنارے سے تہہ میں گرنے والا یقینی طور پر زخمی ہو سکتا تھا۔ دس پندرہ منٹ موقع کا جائزہ لینے کے بعد ہم واپس روانہ ہو گئے۔ اب اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور کسی بھی وقت نشیب و فراز گہری تاریکی میں گم ہو سکتے تھے۔ میں اور بلال شاہ ابھی گھاٹی سے چالیس پچاس گزر دُور ہی آئے تھے کہ ایک آواز سن کر چونک گئے۔ کوئی آرہا تھا ہم غیر ارادی طور پر اپنی جگہ رُک گئے۔ دیودار کے ایک تناور درخت نے ہمیں اپنی اوٹ میں لے رکھا تھا لہذا اوور کوٹ والا وہ چوڑا چکلا شخص ہمیں دیکھ نہیں سکا جو ایک دم بلندی سے نمودار ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی اور پہچان گیا۔ وہ شاہی کا ملازم خاص اور قریبی ساتھی دولودام تھا۔ دولودام اس وقت کہاں جا رہا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے خواہ مخواہ شک سا ہونے لگا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے بلال شاہ کی

سے اس کا جھگڑا ہوا تھا اور وہ اسے مار کر کھائی میں پھینک آیا تھا۔ اس اعتراف کے بعد شاہی کے خلاف ایک مضبوط کیس بن سکتا تھا۔ گوبند کو گم ہوئے اب آٹھ مہینے ہونے کو آئے تھے۔ اگر وہ زندہ تھا تو اب تک ملا کیوں نہیں تھا۔ یہ یقین ممکن تھا کہ کھائی میں گرنے سے اس کی موت واقع ہو گئی ہو اور شاہی کے آدمیوں نے اسے ادھر ہی کہیں جنگل میں گاڑ دیا ہو۔

درحقیقت شاہی کو معلوم ہو چکا تھا کہ نشے کی حالت میں اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل چکی ہے جو اس کی گردن کا پھندا بن سکتی ہے اور اس بات کے نصف درجن گواہ بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے گوبند سے ہونے والے جھگڑے کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ شاہی کی گرفتاری کے وقت جو دھینگا مشتی ہوئی تھی وہ ہمارے ایک غلط اندازے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں نے قادری کو سادے لباس میں شاہی کے ڈیرے پر بھیجا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاہی وغیرہ اس کو پہچان نہیں سکیں گے لیکن اُن کی سی آئی ڈی خاصی تیز تھی۔ وہ قادری کو ہیڈ کانسٹیبل کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور مار پیٹ کرنے لگے۔ خیر..... یہ تو وہ باتیں تھیں جو ہو چکی تھیں اب ہمیں ان باتوں کے بارے میں سوچنا تھا جو ہونی چھیں۔ شاہی نے اس معاملے کو ایک پراسرار رنگ دے دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گھنے درختوں کے اندر گوبند کا جسم آنا فانا غائب ہو گیا۔ نہ وہ کسی ہسپتال میں پہنچا نہ کسی کے گھر گیا اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ جنگلی جانور اسے چیر پھاڑ گئے ہوں۔ اوّل تو کوئی ایسا بڑا جانور اس علاقے میں تھا ہی نہیں جو ایک جوان مرد کی لاش کو کھینچ کر موقع سے دُور لے جاتا اور فرض محال

گیا۔ اس بنگلے کا نمبر چودہ تھا اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بنگلہ تھیٹر کے ایک مشہور بنگالی اداکار چاکرانی کا تھا۔ چاکرانی بڑی گرج دار آواز والا ایکٹر تھا۔ مشہور تھا کہ تھیٹر کی آخری قطار میں بیٹھا ہوا بہر اتماشائی بھی چاکرانی کی بھڑک سن کر لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ چاکرانی کی مادری زبان بنگالی تھی لیکن وہ اردو ہندی کجراتی ہر طرح کے ڈراموں میں کام کرتا تھا۔ اس زمانے میں بولتی فلمیں تو شروع ہو چکی تھیں لیکن سینما ہال ہر جگہ نہیں ہوتے تھے لہذا تھیٹر میں کمائی بھی تھی اور نام بھی۔ چاکرانی نے بھی تھیٹر سے کافی پیسہ کما رکھا تھا۔ جس کا ایک ثبوت یہ خوبصورت بنگلہ بھی تھا۔

دولورام جب چاکرانی کے بنگلے میں داخل ہو گیا تو میں ”گورا پہاڑ“ سے واپس لوٹ آیا۔ اگلے روز میں نے بلال شاہ کو ہدایت کی کہ وہ گورا پہاڑ کے بنگلہ نمبر چودہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کر کے مجھے آگاہ کرے۔ بلال شاہ نے حسب معمول یہ کام بڑی سمدھی سے کیا اور ایک مقامی مخبر کو ساتھ ملا کر دو روز میں اپنی رپورٹ مکمل کر لی۔ اس رپورٹ کے مطابق بنگلے کے مالک کا پورا نام راہندر ناتھ چاکرانی تھا۔ اس کی مستقل رہائش دہلی میں تھی۔ ان دنوں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ یہاں تفریح کے لیے آیا ہوا تھا۔ اہل خانہ سے مراد اس کی بیوی تھی۔ بیوی کا نام روپوتی تھا اور وہ بھی تھیٹر میں کام کرتی تھی۔ بلال شاہ نے مجھے روپوتی کی ایک تصویر بھی دکھائی اور بتایا کہ یہ چاکرانی کی دوسری شادی ہے۔

میں نے روپوتی کی تصویر دیکھی۔ یہ ایک اخباری تراشہ تھا اور زیادہ پرانا بھی نہیں تھا۔ روپوتی کی عمر میں بائیس برس کے لگ بھگ نظر آتی تھی۔ دہلی پتلی جیسے نقوش والی یہ لڑکی تھیٹر اور فلم کی

طرف دیکھا۔ وہ بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا ”بلال اتم تھانے جاؤ۔۔۔۔۔ میں ذرا اس کی ٹوہ لگاتا ہوں“ میرا اشارہ دولورام کی طرف تھا۔

بلال شاہ نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا۔ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا دولورام کے پیچھے چل دیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے ہوئے ناہموار راستے پر کسی کا تعاقب آسان کام نہیں ہوتا۔ شاخوں کے پٹنے اور پتوں کے ٹکرانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ آگے جانے والے کو ہوشیار کر دیتی ہے۔ یہاں بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ اگر دولورام سے میرا فاصلہ کم ہوتا تو وہ ہوشیار ہو سکتا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی صورت میں اُس کے کھوجانے کا اندیشہ تھا۔ بہر طور کسی نہ کسی طرح میں نے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ آگے جا کر قدرت نے میری مدد کی۔ اندھیرا گہرا ہو جانے کی وجہ سے دولورام نے ٹارچ روشن کر لی۔ روشنی کا پچھا خاصے فاصلے سے بھی کیا جا سکتا ہے لہذا میرے لیے آسانی پیدا ہو گئی۔ دولورام کا تعاقب میری توقع سے کہیں طویل ثابت ہوا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس نے قریباً دو میل کا فاصلہ طے کیا اور ”گورا پہاڑ“ کی ڈھلوان پر پہنچ گیا۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ دولورام اُن خوبصورت بنگلوں میں جا رہا ہے جو گورا پہاڑ کی ڈھلوان پر وادی کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ جہاں چمبا اور پٹھا کوٹ کی خوش حال فیملیاں تفریح کے لیے آتی ہیں۔ ان بنگلوں اور کوشیوں کی تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی سب کوشیاں مالکوں نے ذاتی استعمال کے لیے رکھی تھیں۔ پرسکون تفریح کے خواہش مندوں کے لیے یہ بڑی مناسب جگہ تھی۔ کوشیوں اور بنگلوں کی اس خوبصورت کالونی میں پہنچ کر دولورام ایک بڑے سیاہ گیٹ کے سامنے رُک

کے ڈھیر لگا کر آلے دوالے کاٹنے دار تار لگا دی گئی ہے۔ یہاں دو چوکیدار بھی رہتے ہیں۔ دونوں آپس میں داماد سر ہیں۔ انہوں نے لی بتایا ہے کہ چودہ نمبر بنگلے میں ضرور کوئی گڑ بڑ ہے۔ صرف دو دن پہلے بھی رات کے وقت انہوں نے چھین سنی ہیں چھین بہت مدھم ہوتی ہیں اور اکثر وقفے وقفے سے آدھ گھنٹے تک سنائی دیتی رہتی ہیں۔“

میں نے بلال شاہ سے اس بارے میں کچھ اور تفصیل پوچھی اور پھر چاکرانی سے ملنے کا پتہ فیصلہ کر لیا۔

”گورا پہاڑ“ تک جانے کے لیے جیب کو طویل چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ میں ایک گھنٹے میں چاکرانی کے بنگلے تک پہنچ سکا۔ میں وردی میں تھا مجھے دیکھ کر چاکرانی کا ملازم پریشان نظر آنے لگا۔ وہ اطلاع دینے اندر گیا اور چار پانچ منٹ بعد میں چاکرانی کے سامنے اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ شکل و صورت سے قد کاٹھ کے لحاظ سے چاکرانی کسی طرح بھی بنگالی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اچھا بھلا بھرو شخص تھا کسی حد تک خاموش طبع بھی نظر آتا تھا۔ اس نے بڑے اخلاق اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا اور آنے کی وجہ پوچھی۔

میں نے کہا ”وجہ تو کوئی خاص نہیں ہے چاکرانی صاحب ابس آپ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔“ وہ مسکرا کر اردو میں بولا ”ہم آپ کے خادم ہیں جی ہمیں حکم کر دیا ہوتا، فرمائیں کیا خدمت کروں آپ کی؟“

میں نے کہا ”بس تھوڑا سا وقت لینا ہے آپ کا“ دراصل ہم نے ایک مقامی فنڈے شاعری کو گرفتار کیا ہے۔ اُس پر ایک ارائیں لڑکے کے قتل کا الزام ہے ہم شاعری کے ملنے جلنے والوں سے بھی پوچھ کچھ کر رہے ہیں۔ شاعری کے دوست احباب میں ایک

اکثر ایکٹریوں کی طرح خوبصورت تھی۔ میں نے چاکرانی کو بھی دیکھا ہوا تھا وہ بھی خوبصورت تھالین روپ وئی کے جوڑ کا ہرگز نہیں تھا۔ روپ وئی کے مقابلے میں اس کی عمر تھوڑی سی زیادہ تھی اور جسم بھی بھاری تھا۔ وہ کھلے ہاتھ پاؤں کا ایک دیگ شخص نظر آتا تھا۔ جبکہ روپ وئی ایک پڑھی لکھی نازک مزاج اداکارہ دکھائی دیتی تھی۔ معلوم نہیں انہوں نے ایک دوسرے کو کیسے پسند کر لیا تھا۔ بہر حال مجھے ان کی پسند ناپسند سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے تو یہ دیکھنا تھا کہ شاہی کا ملازم خاص دولورام چاکرانی کے بنگلے میں کیا کرنے گیا تھا اور ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ بلال شاہ اس بارے میں کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں کر سکا۔ اس نے بتایا کہ اس سے پہلے دولورام کو کسی نے چاکرانی کے بنگلے میں گورا پہاڑ کی طرف جاتے نہیں دیکھا۔ نہ ہی کبھی اسے چاکرانی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ ویسے بھی وہ پچھلے تین چار ماہ سے ڈھوبڑی میں نہیں تھا۔ بلال شاہ نے اپنی رپورٹ میں ایک بڑی خاص بات بھی بتائی۔ اس نے کہا کہ پچھلے ایک مہینے میں تین چار موقع ایسے آئے ہیں کہ چاکرانی کے بنگلے سے کسی عورت کی چیخنے کی آوازیں آتی ہیں۔

یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔ میں چاکرانی کا بنگلہ خود دیکھ کر آیا تھا۔ یہ بنگلہ دوسری عمارتوں سے کچھ ہٹ کر تھا اور گھنے درختوں کی وجہ سے کچھ الگ تھلک بھی نظر آتا۔ ایسی چار دیواریاں کسی بھی طرح کے غیر قانونی کاموں کے لیے بہت مناسب ہوتی ہیں۔ میں نے بلال شاہ سے پوچھا کہ یہ چیخوں والی بات اسے کس نے بتائی ہے۔ وہ حسب عادت مونچھوں کو مروڑا دے کر بولا ”خان صاحب! شاید آپ نے دیکھا نہیں چودہ نمبر بنگلے کے پیچھے لکڑی کا ایک گودام ہے۔ گودام بھی کیا ہے بس کھلے احاطے میں مہتروں

دولورام نامی شخص بھی ہے۔۔۔۔۔“

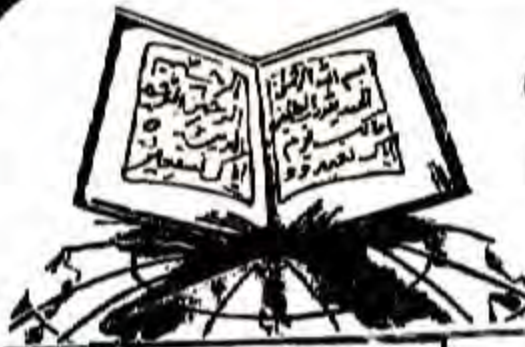
”میں سمجھ گیا ہوں“ چاکرائی میری بات کاٹ کر بولا ”آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ دولورام نامی یہ شخص میرے بچکے میں آمدورفت رکھتا ہے۔۔۔۔۔ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو بالکل صحیح ہے۔ یہ دولورام تین چار دفعہ بچکے میں آچکا ہے لیکن اس کے آنے کی وجہ شاید آپ کو معلوم نہ ہو۔“ چاکرائی نے دروازے کی طرف رخ پھیر کر اپنے کسی ملازم ”دیو“ کو آواز دی۔ چند لمحے بعد چالیس پچاس برس کا ایک بارش شخص ہاتھ سینے پر باندھے اندر داخل ہوا اور ادب سے سر جھکا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ چاکرائی نے اپنی بے حد پاٹ دار آواز میں کہا ”دینو! اسپیکر صاحب کو متاؤ دولورام یہاں کیوں آتا رہا ہے۔“

اس سے پہلے کہ دینو بولتا میں نے کہا ”چاکرائی صاحب! آپ کے ملازم کی زبان سے آپ کی زبان میرے لیے زیادہ قابل اعتبار ہے۔ جو کچھ کہتا ہے آپ خود فرمائیے، میں ہمہ تن گوش ہوں۔“

چاکرائی نے مسکرا کر ملازم کو باہر بھیج دیا۔ پھر چاندی کے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر بڑے سٹائلش انداز میں ہونٹوں سے لگایا اور بولا ”بالکل معمولی سی بات ہے۔۔۔۔۔ کم از کم آپ کے لیے تو بالکل غیر اہم ہے۔ دولورام کی دھرم دہنی مالیتی میرے بچکے میں ملازم تھی۔ میرے آنے سے پہلے میرے منیجر نے اسے ملازم رکھا تھا۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ مالیتی کا شوہر کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ دھنگا فساد کرتا ہے اور اکثر اسے پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے میں نے مالیتی کی چھٹی کرا دی۔ دولورام نے منیجر سے درخواست کی کہ اس کی بیوی کو کام سے نہ نکالا جائے۔ منیجر نے بے وقوفی کی اور اسے میری طرف بھیج دیا۔ دو دفعہ تو میں نے اسے ملنے

سے ہی انکار کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سمجھ جائے گا لیکن وہ بھی ایک ڈھیٹ آدمی نکلا۔ دو تین روز پہلے پھر آدھما میں نے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی اور کورا جواب دے کر واپس بھیج دیا۔ دراصل۔۔۔۔۔“

اچانک چاکرائی کے منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ مجھے بھی چونک کر قالین پوش زینوں کی طرف دیکھنا پڑا۔ بالائی منزل پر کوئی چیز دہم سے گری تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک دبی ہوئی نسوانی چیخ ابھری تھی۔ میں نے دیکھا چاکرائی کا سرخ و سپید چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے چاکرائی کی طرف دیکھا۔ وہ سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر کہنے لگا ”میری نوکرانی فرش دھوتے ہوئے گر گئی ہے شاید۔ وہ میٹھیوں تک گیا اور کچھ دیر بالائی منزل کے دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد واپس گیا۔ وہ صاف طور پر پریشان تھا اور میری توجہ اس واقعے کی طرف سے ہٹا دیتا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھے خبریں سنانے کے بہانے ریڈیو آن کر دیا اور سیاست کی باتیں کرنے لگا۔ کچھ بھی تھا وہ ایک بااخلاق شخص نظر آتا تھا اور اس کی باتوں میں رکھ رکھاؤ تھا۔ بڑے فیر محسوس طریقے سے وہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ میں جلد از جلد وہاں سے رخصت ہو جاؤں لیکن تقدیر چاکرائی پر مہربان نظر نہیں آئی تھی۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک بار پھر بالائی منزل سے دھماچو کڑی کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک مرد دبے دبے لہجے میں غرایا اس کے ساتھ ہی کسی عورت کے رونے اور بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس دفعہ یہ سب کچھ نہایت واضح تھا۔ چاکرائی پریشان ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پریشانی کے علاوہ اس کے چہرے پر غصہ اور شرمندگی بھی تھی وہ کچھ دیر سیدھا کھڑا بالائی منزل کے دروازے کو دیکھتا رہا۔“ میں ابھی آتا ہوں اسپیکر“ اس نے کہا اور تیزی سے



”دُعائے قیامِ بدلتی ہے“ (حدیثِ رسول)

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک ایمان افروز پیشکش



دُعائے

شائع ہو گیا ہے

- متدانی دُعائیں۔
- عظیم پیغمبرانِ خدا کی وہ دُعائیں جو نسلِ انسانی کے لیے نجات اور ہدایت کا باعث بنیں۔
- خالق کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہ کی تمام مسنونہ دُعائیں جو رحمت اللعالمین کی ذاتِ برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دُعائیں۔
- ائمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دُعائیں۔

جدید دنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے
پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشفی آمیز
رُوحانی اور ایمانی علاج

قیمت 175 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاؤں لاہور۔ فون: 37245412

وجہ نہیں آتی، اس کی دوستوں میں سے ایک دو بہت ایڈوانس قسم کی تھیں۔ شراب کے علاوہ خشیش وغیرہ کے نشے بھی کرتی تھیں۔ بس انہی سے یہ جھوٹ مرض اسے لگا ہوگا۔

ہماری گفتگو کے دوران ہی ایک بار پھر اوروں والی منزل سے دھادمم کی آوازیں آئیں پھر ایک طویل کھڑکی کا شیشہ چمٹا کے سے ٹوٹا اور مجھے کھڑکی کے خالی فریم میں ایک وجیہ صورت نظر آئی۔ میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ وہ روپ وتی کے علاوہ کوئی نہیں تھی۔ میں چند روز پہلے اس کی تصویر اخباری تراشے میں دیکھ چکا تھا۔ تصویر میں روپ وتی جتنا ہی سنوری نظر آتی تھی کھڑکی میں اتنا ہی اجڑی ہجڑی کھڑی تھی۔ لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر خراشیں اتنی دُور سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں اسے عقب سے ایک عورت اور ایک تو انا مرد نے دیوچ رکھا تھا۔ دونوں روپ وتی کو اندر کی طرف کھینچ رہے تھے اور روپ وتی چیخ رہی تھی۔ اس نے چیختے ہوئے دو یا تین جملے کہے مگر ان جملوں میں سے مجھے صرف ”تھانیدار صاحب“ کے الفاظ سمجھ میں آئے۔ بعض اوقات الفاظ نے بغیر بھی بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ میرے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ عورت مجھے مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ چاکرانی کی بات درست ہی تھی۔ وہ نشے میں نظر آتی تھی اور کچھ جنونی سی ہو رہی تھی۔ مرد اور عورت جو غالباً اس بنگلے میں ٹوکر تھے۔ روپ وتی کو بمشکل کھڑکی سے ہٹا کر اندر لے گئے۔

چاکرانی اب سخت بیزار نظر آتا تھا۔ اٹھتے ہوئے بولا ”آئیے تھانیدار صاحب باہر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

میں نے کہا ”نہیں۔۔۔۔۔ بس اب میں چلتا ہوں، بہت وقت ضائع کر لیا آپ کا۔“

میڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

آٹھ دس منٹ بعد چاکرانی واپس آیا تو سردی میں بھی پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے بال بھی کچھ بکھرے بکھرے نظر آتے تھے۔ میرے سامنے بیٹھ کر اس نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور چند گہرے کش لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنے لگا:

”یہ میری بیوی ہے انسپکٹر۔۔۔۔۔ جو پہلی آواز آئی وہ بھی اسی کی تھی۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔“

”کیا وہ پیار ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”پیار ہوتی تو اس کا علاج کرا لیتا۔ بھگوان کی کرپا سے دھن دولت کی کمی نہیں ہے مجھے۔ بڑے بڑے ہسپتال میں لے جاسکتا ہوں اُسے مگر وہ تو اپنی دشمن خود بنی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ اب کیا بتاؤں آپ کو۔ گرتا اٹھانے سے اپنا ہی پیٹ ٹنکا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وہ نشہ کرنے لگی ہے۔ دن رات دھت رہتی ہے۔ شراب بند کر دوں تو مارنے کو دوڑتی ہے۔ گھر کی چیزیں توڑتی ہے اور سردیواروں سے ٹکراتی ہے۔ پھر مجبوری یہ ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ نہ اسے مار پیٹ سکتا ہوں اور۔۔۔۔۔ اور نہ طلاق دے سکتا ہوں۔۔۔۔۔ میں اسے دہلی سے یہاں اسی لیے لایا تھا کہ شاید کھلی آب و ہوا میں شور ہنگامے سے دُور رہ کر وہ کچھ بہتر محسوس کرے لیکن الٹا اثر ہو رہا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ واپس ہی چلا جاؤں۔“

میں نے دیکھا چاکرانی کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی اور آواز اندرونی کرب کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ میں نے کہا ”چاکرانی صاحب عام طور پر عورتیں شراب نہیں پیتیں۔ اگر آپ کی چٹی اس لت میں گرفتار ہو گئی ہے تو ضرور اس کی کوئی وجہ ہوگی۔“

وہ پیشانی مسل کر بولا ”میری سمجھ میں تو کوئی

وٹی کی دیوانی تھی اور نوجوان اُس کے لیے ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ چاکرانی کے ساتھ شادی سے پہلے روپ وٹی کا ایک اجیت نامی نوجوان سے عاشقہ بھی چلا تھا۔ نوجوان بھی تعمیر کا اداکار تھا اور بہت خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں روپ وٹی نے اس نوجوان سے تعلق توڑ لیا اور چاکرانی کو اپنی مرضی سے جیون ساتھی بن لیا تھا۔ تجربوں نے گورا پہاڑ کے بنگلہ نمبر 14 کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی تھیں۔ چاکرانی نے یہ بتایا بنگلہ کوئی تین سال پہلے خریدا تھا۔ سارا سال یہ بنگلہ بند رہتا تھا صرف جون جولائی کے مہینوں میں چاکرانی دس پندرہ روز کے لیے یہاں آتا تھا۔ چاکرانی کے ساتھ منبر ہوتا تھا یا ایک عدد باورچی۔ باورچی عموماً چاکرانی کے ساتھ ہی ڈیوڑی پہنتا تھا۔ اس دفعہ بھی منبر اور باورچی اُس کے ساتھ ہی یہاں آئے تھے لیکن اس دفعہ دو باتیں معمول سے ہٹ کر ہوئی تھیں۔ ایک تو چاکرانی گرمیوں کی بجائے سردیوں میں آیا تھا۔ دوسرے اس کے ساتھ روپ وٹی بھی تھی جسے وہ اپنی بیوی بتا رہا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے تھے۔ وہ بہت کم بنگلے سے نکلتا تھا اور اس کی چٹی کی تو کسی نے جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ ارد گرد کے لوگ اب اس بنگلے کو ہراسرا خیال کرنے لگے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ بنگلے کی چار دیواری کے اندر ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ یہاں کوئی غیر قانونی کام ہوتا ہے یا پھر کسی روح وغیرہ نے ڈیرہ ڈال لیا ہے۔

دیہی علاقوں میں ایسی باتوں کے پھیلنے کے لیے بس اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں بھی یہ اشارہ موجود تھا یعنی بنگلے کے پچھواڑے ”ککڑی گودام“ کے چوکیدار نے جیٹوں کی آوازیں سنیں تھیں جو اکثر رات کے وقت آتی تھیں۔ میں اب ان

کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اُس نے کھانے کی دعوت دی لیکن میں شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔

چاکرانی کے بنگلے سے میں کئی اُلجھنیں لے کر واپس لوٹا۔ سب سے بڑی اُلجھن روپ وٹی ہی تھی۔ چاکرانی پوں تو بھلا مانس شخص نظر آتا تھا لیکن یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اچھے ڈاکٹر سے بیوی کا علاج کرانے کی بجائے وہ اسے یہاں کیوں لے آیا تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا روپ وٹی نے بنگلے کی کسی کمرے سے میری جیب دیکھ لی تھی اور یہ جیب دیکھنے کے بعد ہی اس نے بالائی منزل پر اودھم مچانا شروع کیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح مجھ پر اپنا آپ ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی پہلی دو کوششیں ناکام رہیں لیکن تیسری کوشش میں وہ کمرے کا شیشہ توڑنے اور میرے سامنے آنے میں کامیاب رہی۔

گوبند کے سوالیہ نشان کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہ ایک اور سوالیہ نشان سامنے آ گیا تھا۔ روپ وٹی کون تھی؟ اگر واقعی اسے شراب نے پاگل کر رکھا تھا تو وہ کیوں شراب پیتی تھی اور اپنی پھول جیسی جوانی کو کیوں زہر سے سنبھال رہی تھی؟ میں نے بلال شاہ کے علاوہ اپنے دو تین مزید مخبروں کو اکٹھا کیا اور ان کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ چاکرانی اور روپ وٹی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کریں اور بڑی احتیاط کے ساتھ چاکرانی کی نقل و حرکت پر بھی نگاہ رکھیں۔ مخبروں نے تین چار روز بھاگ دوڑ میں مختلف ذریعوں سے جو کچھ معلوم کیا اس کا خلاصہ یوں ہے۔ چاکرانی کی یہ دوسری اور روپ وٹی کی پہلی شادی تھی۔ چاکرانی کی طرح روپ وٹی کا تعلق بھی دہلی کے ایک آزاد خیال گھرانے سے تھا۔ وہ تعمیر میں اداکاری کے علاوہ رقص بھی پیش کرتی تھی اور بعض اوقات گانا بھی گاتی تھی۔ تعمیر دیکھنے والے شائقین کی بڑی تعداد روپ

پوری ہونے میں نہیں آتی تھی..... ہم پٹھانکوٹ سے لدھیانہ پہنچے اور لدھیانہ سے براستہ پٹنالاہ دہلی پہنچ گئے۔ یہ ساڑھے چار سو میل سے زائد سفر تھا۔

دہلی میں ہمارا قیام عید گاہ کے علاقے میں انسپکٹر نذیر احمد کے مکان میں تھا۔ میں ایک دو دفعہ پہلے بھی نذیر احمد کے پاس ٹھہر چکا تھا۔ وہ بڑا اہم درد اور تعاون کرنے والا شخص تھا۔ نذیر احمد کے ذریعے اجیت کمار کا ٹھکانہ معلوم کرنے میں قطعاً دشواری نہیں ہوئی۔ وہ کوئی گمنام شخص نہیں تھا تھیمز کا معروف اداکار تھا۔ نئی آبادی میں اس کی دو کنال کی شاندار کوشی تھی لیکن وہ خود دہلی میں موجود نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی شو میں حصہ لینے کے لیے میرٹھ گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی دو روز بعد متوقع تھی ہم نے یہ وقت دہلی دیکھنے میں گزارا۔ شہر دیکھنے کا شوق بلال شاہ کو تھا مجھے نہیں مگر اس کے ساتھ تو جانا تھا (آخر اُس نے میرے کہنے پر خون دے رکھا تھا۔ گا ہے گا ہے چکر وغیرہ آتے تھے، نصیب دشمنان کچھ ہو جاتا تو مصیبت پڑ جاتی)۔

یہ تیسرے روز دوپہر کا واقعہ ہے ہم جنرل پوسٹ آفس سے عید گاہ کی طرف آرہے تھے۔ یونہی میرے جی میں آئی کہ نئی آبادی کی طرف نکل چلتے ہیں۔ گزرتے گزرتے ایک نگاہ اجیت کی رہائش گاہ پر بھی ڈال جائیں گے۔ اگر وہ واپس آچکا ہے تو اس کی گاڑی پورچ وغیرہ میں کھڑی نظر آجائے گی۔ ہم چھوٹی جیب میں سوار تھے یہ پرائیویٹ جیب تھی اور نذیر احمد کے چھوٹے بھائی شجاع نے ہمیں ذاتی استعمال کے لیے دے رکھی تھی۔ نئی آبادی کی طرف جاتے ہوئے جونہی ہم مجھے والے چوک سے گزرے۔ بلال شاہ کی نگاہ ایک بس شاپ پر کھڑے نوجوان پر پڑی اور وہ نمدی طرح چونک گیا "رکے خان صاحب" وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ اس

چیخوں کا سبب سمجھ گیا تھا لیکن ان کی اصل بنیاد کا مجھے بھی پتہ نہیں تھا نجانے کیوں وہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ ان چیخوں کے اصل بنیاد اس کہانی کے طے میں چھپی ہوئی ہے۔ جس میں چاکرانی کے علاوہ کسی اجیت نامی اداکار کا ذکر بھی آتا ہے اور جس کا آغاز دہلی کے کسی رومان پرورد گوشے سے ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کتنی سلجھانے کے لئے مجھے یا میرے سب انسپکٹر کو دہلی جانا پڑے گا..... دو تین روز سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے خود دہلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں چند کیسوں کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی دہلی جا چکا تھا۔ آپ اُن میں سے ایک دو کیسوں کی روداد بھی پڑھ چکے ہیں۔ دہلی میرے لیے کوئی نیا مقام تھا نہ ہی وہاں کے رہنے والے میرے لیے اجنبی تھے۔ ڈھبوزی سے دہلی تک جانے کا مطلب ہے بذریعہ ٹرین یا بس ایک طویل سفر۔ گوبند کی آٹھ نو ماہ پرانی گمشدگی کا معہ حل کرنے کے لیے میرے لیے ضروری تھا کہ یہ طویل سفر کروں۔ میں نے بس پر ٹرین کو ترجیح دی۔ میں اور بلال شاہ پہلے سرکاری گاڑی پر پٹھانکوٹ پہنچے۔ پٹھانکوٹ سٹیشن سے ہم ٹرین میں بیٹھے اور پھر چل سو چل۔ سفر طویل ضرور تھا لیکن جب بلال شاہ جیسا لچپ ہمسرہ ہو تو سفر کتنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ پچھلے دنوں بلال شاہ ایک بوتل خون عطیے میں دے بیٹھا تھا۔ اب وہ ہر وقت خون کی کمی کا رونا روتا رہتا تھا۔ کہتا تھا اُٹھتے بیٹھتے چکر آتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سن ہو جاتی ہیں۔ ہر وقت ناخنوں کو دیکھتا رہتا تھا کہ ان میں گلابی پن نہیں رہا۔ ایک بوتل خون کی کمی پوری کرنے کے لیے اُس نے میری جیب سے جتنا پھل فروٹ کھایا تھا اس سے پانچ چھ بوتل خون اس کے جسم میں مزید پیدا ہو چکا تھا مگر "کی" تھی کہ

ذیل ڈول کا ایک سبزی فروش تھا۔ میں دردی میں تھا لہذا میرے آگے لگ کر بھاگتے والے کو مٹھوک جان کر وہ اس کے راستے میں آگیا۔ اس نے اپنی ریڑھی اس طرح گوبند کی ٹانگوں میں ماری کہ وہ ریڑھی کے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل فرش پر گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھنے کے بعد دوبارہ رفتار پکڑتا میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور وہ اٹھتا اٹھتا ایک بار پھر زمین پوس ہو گیا۔ میں نے اس کے جڑے پر دو زور دار کتے رسید کر کے اس کی ساری تن فٹن ختم کر دی۔ ایک دم وہاں مجمع لگ گیا۔ ان میں عورتیں بچے مرد سب شامل تھے۔ بلال شاہ بھی ہاپٹا کا نپٹا موقع پر پہنچ چکا تھا اور حیرت سے گوبند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بات بھی بھی حیرت کی۔ یہ لڑکا پچھلے آٹھ نو ماہ سے غائب تھا ہم سب کا خیال تھا کہ وہ قتل ہو چکا ہے یا کسی کی جس بیچا میں ہے۔ ہم اس کا کھوج لگانے لگے ہوئے تھے لیکن وہ ہمیں دیکھ کر یوں بھاگا جیسے موت کے فرشتوں کو دیکھ لیا ہو۔ موقع پر موجود لوگ ہم سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کون ہے اور اس نے کیا کیا ہے ہم کیا کہہ سکتے تھے ہمیں خود معلوم نہیں تھا۔ اس نے کیا کیا ہے؟ جان چھڑانے کے لیے ہم نے لوگوں سے گول مول بات کی اور گوبند کو لے کر جیب میں آ بیٹھے۔

منظر انسپکٹر نذیر احمد کے گھر کا تھا۔ نذیر احمد بھی گھر ہی موجود تھا۔ گوبند مجرموں کی سی صورت بنائے ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ میرے کتے سے اس کا زہریں ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون اُس کی ٹھوڑی کورٹین کر رہا تھا وہ لرزاں آواز میں بولا:-

”میں بے گناہ ہوں انسپکٹر صاحب! مجھے اپنے دفاع میں گولی چلانا پڑی تھی۔ ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے جان سے مار دیتا۔“

کی انگلی بس شاپ کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ غیر ارادی طور پر میں نے بڑیک پیڈل دبا دیا اور مختصر سی جیب لہراتی ہوئی سڑک کے کنارے ڈک مگنی، یہ گوبند ہے.....“ بلال شاہ نے دھماکہ خیز انکشاف کیا۔ میں نے غور سے دیکھا انیس بیس سالہ وہ لڑکا ابھی ایک بس سے اتر ائی تھا اور شاپ کے سامنے کھڑا ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ جیب ایک دم ڈکی تھی اس لیے کچھ دوسروں لوگوں کی طرح وہ بھی ہماری طرف دیکھنے لگا تھا۔ یکا یک میں نے اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار محسوس کیے۔ یہ آثار مجھے اور بلال شاہ کو پہچاننے کے بعد نمودار ہوئے تھے۔ اس کا منہ کھلا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک دم وہ بھاگ اٹھا ”پکڑیں اسے“ بلال شاہ نے چلا کر کہا۔ میں نے تیزی سے جیب کو یوٹرن دیا اور وہ کمان سے لکے تیر کی طرح لڑکے کی طرف لپکی۔ لڑکے نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے سڑک کر اس کی اور ایک بنگلی راستے سے داخل ہو گیا۔ یہ ون وے کی خلاف ورزی تھی مگر اس خلاف ورزی کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے لڑکے کا تعاقب جاری رکھا۔ مگنی گاڑیوں کے پیچھے چر چرائے اور اُن کے ڈرائیور خشکیں نظروں سے ہمیں گھورنے لگے۔ جونہی میں نے لڑکے کو ایک تنگ گلی میں داخل ہوتے دیکھا جیب روک کر نیچے چھلانگ لگادی۔ یہ اینٹوں کے فرش والی پتہ گلی تھی۔ دونوں طرف رہائشی مکانات تھے۔ لڑکا جس کا نام بلال شاہ نے گوبند بتایا تھا تیزی سے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ وہ گوبند ہی تھا کیونکہ اسی طرح بھاگ رہا تھا جس طرح ایک دوڑنے والے کھلاڑی کو بھاگنا چاہئے۔ اپنی تمام تر تیز رفتاری کے باوجود شاید میں اُسے پکڑ نہ سکتا لیکن ایک ریڑھی بان فرشتہ رحمت ثابت ہوا۔ وہ اچھے

میں پہلے دو نمبر چھوڑ دینے پر شاہی نے گوبند کو کچھ رقم دینا تھی۔ اب اس رقم کے بارے میں اختلاف تھا۔ شاہی نے بیان دیا تھا کہ اس سودے میں گوبند سے پانچ ہزار ملے ہوا تھا جب کہ گوبند کا کہنا تھا کہ شاہی نے سیٹھ سے کم از کم پندرہ ہزار روپیہ لیا تھا اور اس میں سے دس ہزار اسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ اُن دنوں ایک بہت بڑی رقم تھی اور اس کے سلسلے میں بڑے سے بڑا تنازعہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ گوبند نے اعتراف کیا کہ وہ شاہی سے نوٹ چھین کر بھاگا تھا اور بعد ازاں اُن دنوں میں ہاتھ پائی ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ شاہی نے اس کے سر پر پتھر مارا تھا اور جب وہ بے ہوش ہو کر کھائی میں گر گیا تو اُس کی مٹھی سے رقم نکال کر چلا بنا۔ گوبند نے بتایا کہ وہ تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہوش میں آیا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون لوتھڑوں کی صورت میں اس کے چہرے اور سینے پر بھا ہوا تھا۔ وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھ سکا تھا۔ چاروں طرف سنان درخت تھے جن سے ٹھنری ہوئی ہوا سیٹیاں بجاتی گزر رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں جیسے بے جان ہو چکی تھیں۔ وہ بڑی دشواری سے کھٹکتا ہوا برقاب کھائی سے باہر نکلا اور اپنی بنیان پھاڑ کر سر پر پٹی باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دفعتاً اُسے نئی طرح چوکنا پڑا۔ ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی تھی اس کے ساتھ ہی کسی کے بھاگتے قدموں کی آہٹ ابھری تھی۔ وہ ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے قریباً سو گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔ وہ سرخ ریشمی لباس میں تھی اور کسی سے بچنے کے لیے تیزی سے بھاگی جا رہی تھی پھر گوبند کو وہ لوگ بھی نظر آ گئے جن سے بچنے کے لیے وہ بھاگ رہی تھی۔ وہ چار افراد تھے ان میں سے دو کے ہاتھ میں رائفلیں بھی تھیں۔ بھاگتے دانوں میں سب سے

گوبند کے لب و لہجے سے اُس کا اناڑی پن ظاہر ہو رہا تھا۔ کوئی پختہ کار مجرم ہوتا تو بغیر ہمارے پوچھے ایسی بات زبان پر نہ لاتا بلکہ گدھے کی طرح مار کھا کر بھی چپ رہتا۔ جو بات گوبند نے کہی تھی اس سے صاف نتیجہ نکلا تھا کہ وہ کسی شخص کو زخمی یا ہلاک کر چکا ہے اور ہم سے ڈر کر بھاگنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں حیر چلاتے ہوئے کہا ”رہو الور اب کہاں ہے؟“

وہ بولا ”وہ میں نے وہیں بنگلے کے پچھواڑے پھینک دیا تھا۔“

ایک اور بات کا پتہ چل گیا۔ گوبند کے ہاتھوں کسی کے ہلاک یا زخمی ہونے کا واقعہ گورا پھاڑ پر ہوا تھا اور میں ممکن تھا کہ اسی بنگلے میں ہوا ہو جہاں چاکرانی رہائش پذیر تھا۔ یعنی 14 نمبر کا وہ الگ تھلک بنگلہ جہاں مخبوط الحواس روپ وٹی سے میرا سامنا ہوا تھا۔ میرا یہ قیافہ درست ثابت ہو رہا تھا کہ شاہی ’رابندر ناتھ چاکرانی‘ بنگلہ نمبر 14 اور گوبند میں کوئی گہرا تعلق ہے۔ میں نے اپنی گفتگو سے گوبند کو یہ باور کرایا کہ اس کے جرم کی بیشتر تفصیلات مجھے معلوم ہیں اور میں اُس کی گرفتاری کے لیے ہی یہاں دہلی میں آیا ہوا ہوں۔ گوبند پوری طرح اس گفتگو کے جال میں پھنس گیا اور اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر وہ سب کچھ مجھے بتا دیا جو شاید ہم کئی دنوں میں نہ پوچھ سکتے۔ گوبند نے میرے اور انسپکٹر نذیر کے سامنے ایک طویل بیان دیا۔ اس بیان میں اس نے اپنی گمشدگی اور گزشتہ نو ماہ کے حالات کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یوں ہے۔

گوبند کے بیان کے پہلے حصے میں کافی حد تک شاہی کے بیان کی تصدیق تھی یعنی ان دنوں کے درمیان ایک سودا ہوا تھا جس کے مطابق دوڑ

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور بے مثال پیشکش

آثارِ قیامت

شائع ہو گیا ہے

قیمت: 175 روپے

✽ ”علاماتِ قیامت“ قرآن کریم اور صحیح احادیث رسول کی روشنی میں
 ✽ واقعہ شق القمر..... سونے کا پہاڑ..... دمدار ستارے..... لشکرِ سفیانی کو
 شکست..... ظہورِ امام مہدی اور امام مہدی کی جنگیں..... قومِ لوط.....
 قومِ عاد..... ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر نو..... فراموش کردہ شہریت کا سمندر
 ✽ فتنہ و جال..... پیغمبروں کی سرزمین عراق پر صلیبی امریکی حملہ جیسی
 قیامت کی نشانیوں پر مکمل تفصیلات!
 ✽ گوانتانامو بے میں عیسائیوں کے ہاتھوں قرآن مجید کی بے حرمتی اور
 عالمِ اسلام کی خاموشی سے قیامت کا تعلق

یہ ایک علمی، تاریخی، تحقیقی اور دلچسپ دستاویز ہے جس کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواڑ گاؤں لاہور فون: 042-37245412

لے گئے جہاں اُن کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔
یوں گوبند ایک چشم دید گواہ ہونے کے سبب
اغوا ہوا اور چاکرانی کی جیس بے جا میں چلا گیا۔
چاکرانی کے بنگلے میں اُسے ملازمین کی ایک کونٹری
میں ڈال کر باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ ایک مسلح
چوکیدار ہر وقت اس کے ارد گرد رہتا تھا اور خاص
ضرورت کے تحت ہی گوبند کو کونٹری سے باہر
نکالا جاتا تھا۔ غالباً چاکرانی کو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی
کہ اس کا کیا کرے۔ گوبند کو قتل کرنے کی ہمت اس
میں نہیں تھی اور وہ اسے آزاد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ
اس کی قید کو طول دیتا چلا گیا۔ اس قید میں رہتے
ہوئے گوبند کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ روپ وٹی بنگالی
اداکار چاکرانی کی پتی ہے۔ میاں بیوی میں کوئی
تنازعہ چل رہا ہے اور وہ لڑتے جھگڑتے رہتے
ہیں۔ گوبند مارج میں قید ہوا تھا۔ مئی کے آخر میں
چاکرانی اپنی بیوی کے ساتھ دہلی واپس چلا گیا اور
اس ویران بنگلے میں گوبند دو چوکیداروں کی نگرانی
میں قید کے دن کاٹنے لگا۔ وہ ہر وقت روتا تھا اور
اپنی بوڑھی ماں کو یاد کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا
کہ اسے اپنے کرتوتوں کی سزا ملی ہے۔ اس نے
فریب کاری سے پیسہ کمانا چاہا تھا نتیجے میں وہ شاہی
کے ہاتھوں جان لیوا طور پر زخمی ہوا اور پھر اس قید
خانے میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے طور پر فرار ہونے
کی ایک دو کوششیں بھی کیں لیکن بُری طرح ناکام
ہوا۔ نہ صرف یہ کہ اسے مارا چٹا گیا بلکہ نگرانی بھی
 سخت کردی گئی۔ اسی طرح روتے پینتے تین
ساڑھے تین مہینے اور گزر گئے۔ اب سردیاں آچکی
تھیں..... ایک روز چاکرانی اپنی بیوی کے ساتھ
پھر بنگلے میں آدھکا۔ ان تین چار مہینوں کے دوران
میاں بیوی کی ناچاقی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔
روپ وٹی کثرت سے شراب نوشی کرنے لگی تھی اور

آگے ایک خوش پوش توانا شخص تھا۔ وہ بھانسنے کے
ساتھ ساتھ دھمکی آمیز لہجے میں لڑکی کوڑکنے کا حکم
بھی دے رہا تھا گوبند اسے دیکھ کر اور اس کی آواز
سن کر حیران رہ گیا۔ وہ سٹیج کا بنگالی اداکار چاکرانی
تھا۔ چاکرانی ایک معروف شخص تھا اور اسے بہت
سے لوگ جانتے تھے۔ گوبند کو معلوم تھا کہ نیچے گورا
پھاڑ کی طرف چاکرانی کا ذاتی بنگلہ ہے اور وہ بھی
کبھار وہاں رہنے کے لیے آتا ہے۔ فوری طور پر
اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ چاکرانی اس لڑکی کے
پیچھے کیوں ہے اور کیوں غصے میں اس قدر بھڑکا ہوا
ہے۔ کھائی سے قریباً چالیس گز کی دُوری پر چاکرانی
نے خوبصورت لڑکی کو جالیا اور بالوں سے پکڑ کر اس
زور کا جھٹکا دیا کہ وہ چلا کر ڈھیر ہو گئی۔ چاکرانی
بھوکے جانور کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے
روتی چلائی لڑکی کو بُری طرح پیٹا اور سخت سردی میں
اس کے کپڑے تار تار کر دیئے۔ بعد ازاں وہ اُسے
بالوں سے گھسیٹا ہوا ڈھلون سے نیچے لے جانے
لگا۔ گوبند اب لڑکی کو بھی پہچان چکا تھا۔ وہ سٹیج کی
ساحرہ اور بے شمار دلوں کی دھڑکن لو جوان اداکارہ
روپ وٹی تھی۔ دفعتاً چاکرانی کے کارندوں نے
گوبند کو دیکھ لیا۔ اس ویرانے میں گوبند کی موجودگی
اُن کے لیے جہاں تعجب خیز تھی وہاں تشویش ناک
بھی تھی۔ گوبند یہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ
چکا تھا اور جتنی طور پر تھمیر کے ایک مشہور اداکار کو
پہچان بھی چکا تھا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے
بعد چاکرانی کے کارندے تیزی سے آگے بڑھے اور
انہوں نے گوبند کو دیوچ لیا۔ گوبند نے اُن کی منت
ساجت کی اور قسمیں کھائیں کہ اس نے کچھ نہیں
دیکھا اور نہ وہ کسی کو بتائے گا لیکن اُسے پکڑنے
والے کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ انہوں نے اسے
بے بس کیا اور کھینچتے ہوئے نیچے نیم ہنڈ راستے پر

ہفتے میں کئی بار چاکرانی سے ملتی تھی۔ بچکے کے اندرونی کمرے سے بلند ہونے والی یہ آوازیں گوبند کی کوٹھڑی تک بھی پہنچتی تھی۔ نشے میں دھت ہونے کے بعد روپ وٹی چاکرانی پر چیخنے چلانے لگتی تھی یہاں تک کہ چاکرانی تشدد پر اتر آتا تھا۔ میاں بیوی میں خوب جھگڑتی تھی اور کبھی کبھی اس ہنگامے کی آوازیں بچکے سے باہر تک جاتی تھیں۔ سردیوں کی وجہ سے یہ مختصر کالونی سنان ہو چکی تھی ورنہ ہر رات کا یہ ہنگامہ اڑوس پڑوس والوں کا جینا حرام کر دیتا۔ قریباً ہفتے پہلے کی بات تھی ایک رات گوبند اپنی تاریک کوٹھڑی میں بیٹھا تقدیر کے لکھے پر آنسو بہا رہا تھا کہ دروازے کی ہالائی درز سے ایک لفافہ دھپ سے فرش پر آن گرا۔ گوبند نے جلدی سے لائٹیں روشن کر کے لفافہ کھولا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں سوسو کے دس نوٹ ہیں۔ نوٹوں کے علاوہ ایک مختصر خط بھی تھا۔ یہ خط چاکرانی کی بیوی روپ وٹی کی طرف سے تھا، اس نے لکھا تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ میری طرح تم بھی چاکرانی کے ایک بد نصیب قیدی ہو، اگر کوٹھڑی سی بہت کرو تو آزادی تمہارا نصیب ہو سکتی ہے کل رات تمہیں اپنی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ملے گا۔ تمہارا چوکیدار بھی نشے میں دھت پڑا ہوگا۔ تم دیوار پھاند کر باہر نکل جانا مجھے پوری آشا ہے کہ بھگوان تمہیں کامیاب کرے گا۔ اگر کامیاب ہو جاؤ تو میرا ایک کام کرو دینا۔ اس خط کے آخر میں میں اجیت نام کے ایک شخص کا پتہ لکھ رہی ہوں۔ یہ شخص دہلی کا رہنے والا ہے، تم یہ دوسرا خط اس تک پہنچا دینا۔ اس لفافے میں جو رقم ہے وہ تمہارے اخراجات کے لیے ہے۔ میں اس کام کے لیے ساری زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی۔۔۔ فقط ایک مجبور۔“

خط کے عین مطابق اگلی شب گوبند کو اپنی منحوس

کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ برآمدے میں دس بارہ قدم کے فاصلے پر سلج چوکیدار بھی نشے میں چت پڑا تھا۔ گوبند جب اس کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ روپ وٹی کا دوسرا دعویٰ غلط ثابت ہوا تھا۔ چوکیدار نہ صرف ہوش میں تھا بلکہ جاگ رہا تھا۔ گوبند کے پاس اب بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا وہ بیرونی گیٹ کی طرف لپکا تاکہ کسی مناسب مقام سے دیوار پھاند سکے۔ چوکیدار نے چلا کر دوسرے چوکیدار کو خبردار کیا لیکن وہ اپنی کرسی پر نیم دراز رہا اور اس سے مس نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھڑی کے چوکیدار کی بجائے یہ گیٹ والا چوکیدار اٹھا فٹیل ہو گیا ہے یا پھر یہ ایک اتفاق تھا کہ چوکیداروں نے اپنی ڈیوٹی تبدیل کر لی تھی۔ بے ہوش چوکیدار کے قریب ہی پتہ کیمن کی دیوار سے دیوار لنگ رہا تھا۔ گوبند نے لپک کر یہ دیوار ہاتھ میں لے لیا۔ عقب میں آنے والا چوکیدار اب اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو تالی راقط تھی جس کا رخ گوبند کی طرف تھا۔ گوبند نے جب دیکھا کہ اور کوئی چارہ نہیں رہا تو لہلی دیادی۔ گولی سیدھی چوکیدار کی چھاتی پر لگی اور وہ راقط سمیت پہلو کے مل کر گیا۔ کرسی پر نیم دراز چوکیدار پھر بھی بیدار نہیں ہوا۔ گوبند نے چھوٹے دروازے کی کنڈی گرائی اور بچکے سے باہر نکل آیا۔ بچکے سے فرار ہونے کے بعد وہ کئی روز مختلف جگہوں پر چھپتا رہا۔ اسے اُمید نہیں تھی کہ چوکیدار زندہ بچا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں اب وہ ایک خونی تھا۔ وہ آزاد ہو کر بھی اپنے اہل خانہ اور عزیز واقارب میں واپس نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس خیال سے خوفزدہ تھا کہ پولیس اور چاکرانی کے ہر کارے ہر جگہ اسے ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے۔ اخراجات کے لیے رقم اس کے پاس موجود تھی اس نے سیدھا

اگلے روز اجیت کمار میرٹھ سے واپس آ گیا اور ہم نے اس سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات اجیت کے گھر میں ہوئی۔ میرے ساتھ مقامی تھانے کا انسپکٹر اصغر علی اور انسپکٹر نذیر محمد بھی تھے۔ شروع کی گفتگو میں وہ میرے ساتھ تھے تاہم بعد میں اٹھ کر چلے گئے۔ اجیت کمار مردانہ جاہت کا شاہکار تھا۔ روپ وٹی جیسی حسین و جمیل لڑکی کا ایسے مرد پر مرنا سمجھ میں آتا تھا۔ محاورے کے مطابق چاند سورج کی جوڑی بن سکتی تھی۔ روپ وٹی میں اگر نسوانی خوبیاں یکجا نظر آتی تھیں تو اجیت مردانہ صفات میں کسی سے کم نہیں تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے اجیت کمار کو اپنے ڈھب پر لانا شروع کیا۔ میں روپ وٹی کے ساتھ اس کے معاشقے اور پھر زوری کی کہانی اسی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے میں مجھے دیر تو لگی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ میں نے جب اجیت کو روپ وٹی کے خط کے کڑے دکھائے تو وہ ایک دم ہکا بکا نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے کوئی دیر پردہ ہٹ رہا تھا۔ وہ پوچھنے لگا کہ یہ خط مجھے کہاں سے اور کیسے ملا؟ میں نے اسے گوہند کے بارے میں بتایا اور اس سلسلے میں دیگر ضروری باتوں سے آگاہ کیا۔ اس نے کہا ”روپ کی شراب نوشی کا تو مجھے پتہ تھا تو از صاحب..... مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ بتی بتی میں ناچاتی اتنی بڑھ چکی ہے بلکہ گتیا بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ یہ سب کیسے ہوا ہے۔ عام لوگوں کے سامنے تو اُن دونوں کے تعلقات ایسے خراب نہیں تھے؟“

میں نے کہا ”اجیت صاحب ایسے بھی ہوا ہے بہر حال یہ سب کچھ ہو چکا ہے میں خود اس بات کا گواہ ہوں۔ روپ وٹی خود کو چاکرانی کے گھر میں ”قیدی“ محسوس کر رہی ہے اور کسی بھی قیمت پر اس کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی ہے..... اور ہم انشاء

دہلی کا رخ کیا..... پچھلے سے فرار ہونے کے بعد گوہند سے ایک گڑبڑ ہو چکی تھی۔ ایک رات کئی گھنٹے تک اسے بارش میں بھیگنا پڑا تھا۔ اس کا لباس شرابور ہو گیا تھا اور جیب میں پڑے ہوئے وہ دونوں خط بھی بھیگ کر اور گل کر بیکار ہو گئے تھے۔

اس موقع پر گوہند اپنی زوداد سناتے سناتے رُکا اور اس نے مجھے ان دونوں خطوں کے چند کڑے دکھائے۔ ان کڑوں سے صرف دو باتیں معلوم ہوتی تھیں ایک تو اجیت کمار کا نام مکمل پتہ اور دوسرے یہ حقیقت کے روپ وٹی نے اپنے پرانے شناسا اجیت کمار کو مدد کے لیے بلایا تھا کہ وہ اس تک پہنچے اور اسے اس کے عالم شوہر سے رہائی دلانے..... اب گوہند اجیت کمار تک پہنچنے کے لیے اس کی کوشی کے چکر لگا رہا تھا۔ پہلے دو تین روز تو اسے اجیت کا چوکیدار ہی فرخانا رہا تھا۔ پھر اسے معلوم ہوا تھا کہ اجیت کسی شو میں حصہ لینے میرٹھ گیا ہوا ہے..... آج بھی گوہند اجیت کا پتہ کرنے ہی نئی آبادی آیا تھا۔ وہ چاندنی چوک سے سوار ہو کر پہنچا تھا۔ ابھی بس سے اتر ہی رہا تھا کہ ہم نے دیکھ لیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بدک اٹھا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

گوہند کے بارے میں اب سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ وہ کیسے گم ہوا، اب تک کہاں رہا اور ڈلہوڑی سے یہاں دہلی میں کیونکر پہنچا؟ سب کچھ سامنے آچکا تھا۔ میری اصل جستجو گوہند کے لیے تھی اور گوہند کا کھوج لگ چکا تھا۔ لیکن گوہند کی وجہ سے جو ایک نیا کیس کھل گیا تھا اس کو انجام تک پہنچانا بھی میری ذمہ داری تھی۔ اس کے علاوہ چاکرانی کو سزا بھی اسی صورت میں ہو سکتی تھی جب یہ ثابت ہو جاتا کہ وہ اپنی بیوی سے ناروا سلوک کرتا تھا اور اس سلوک کو چھپانے کے لیے اس نے گوہند کو نو ماہ تک جیل میں رکھا اور ذہنی و جسمانی اذیتیں دیں۔

رہتے تھے۔ معمولی باتوں پر روٹھ جاتے تھے اور مہینوں ایک دو بجے سے آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ کبھی میں کسی بات کو اپنی جگہ سمجھ لیتا تھا کبھی وہ رائی کے دانے کو پہاڑ بنا لیتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو سمجھ آتا ہے کہ ہم دونوں میں بچپنا تھا۔ یہ بچپنا ہم سے چھوٹی چھوٹی غلطیاں کرانا رہا یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے سے خدا ہو گئے۔ یہ جدائی اس لیے زیادہ افسوس ناک تھی کہ ہم منزل کے قریب پہنچ کر راستہ بھٹکے تھے۔ ہماری شادی کی بات چل نکلی تھی۔ میری والدہ راضی تھیں والد بھی رضامندی ظاہر کر چکے تھے۔ دوسری طرف روپ وٹی کی والدہ اور بہنیں بھی خوش تھیں مگر اچانک سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے ایک معمولی بات پر ہمارا جھگڑا ہوا۔ میرے ایک گھرے دوست نے سچ شو کا انتظام کیا تھا۔ اس شو میں روپ وٹی بھی حصہ لے رہی تھی۔ شو کی ساری تکنیکیں بک چکی تھیں۔ رات آٹھ بجے شو ہونا تھا اور ایک گھنٹہ پہلے روپ وٹی نے شو میں شرکت سے انکار کر دیا۔ شو کے منتظمین کے چٹکے چھوٹ گئے۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور چاہا کہ میں روپ وٹی سے سفارش کروں۔ میں روپ وٹی کو منانے کے لیے پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کی بڑی بہن کو انگلینڈ جانا ہے اور وہ اسے "سی آف" کرنے کے لیے ہوائی اڈے جانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ شو میں شرکت اس کے لیے زیادہ ضروری ہے، مالک کو بہت نقصان اٹھانا پڑے گا اور بدنامی الگ ہوگی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہ کسی طور نہیں مانی۔ اپنی بات پر اڑ جانے کی اس کی یہی عادت ہمیشہ جھگڑے کا سبب بنتی تھی۔ اس دن معاملہ میری برداشت سے باہر ہو گیا اور میں نے بھننا کر اسے تھپڑ دے مارا۔ وہ پاؤں پھینکتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس

اللہ اسے آزاد کرائیں گے بھی لیکن اس کے لیے آپ کو بھی ہم سے تعاون کرنا ہوگا اور وہ حالات بتانے ہوں گے جن کے نتیجے میں روپ وٹی چاکرانی جیسے شخص کے جال میں پھنسی ہے۔" اجیت کمار نے ایک گہرا سانس لیا اور سگریٹ سلا کر بولا "اسپیکٹر صاحب! اس سلسلے میں بہت کچھ اخباروں رسالوں میں چھپتا رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے مجھے بے وقاف ٹھہرایا ہے اور کچھ نے روپ کو دغا بازی کا تمغہ دیا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ میری نظر روپ کی دولت پر تھی اور کچھ کہتے ہیں کہ میں اس کی جوانی سے کھیل کر اسے چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں پریس میں آئی ہیں لیکن حقیقت سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں۔"

میں نے کہا "لیکن یہ تو حقیقت ہے ناں کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ کر دوڑ گئے ہیں..... بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک موقع پر روپ وٹی سے آپ کا جھگڑا ہوا تھا اور آپ نے اسے تھپڑ مارا تھا۔"

اجیت نے کش کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا "ہاں..... یہ جھگڑے والی بات کسی حد تک درست ہے۔ درحقیقت یہی جھگڑا اس کش کش کا انجام ثابت ہوا جو پچھلے دو برسوں سے میرے اور روپ میں جاری تھی۔"

"کیسی کش کش؟" میں نے پوچھا۔

"بس یہی بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔"

اجیت نے دردناک انداز میں مسکرا کر کہا "ہماری کش کش کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی، یوں سمجھ لیجئے کہ ایک بیکار کی اکثر تھی جو ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھے ہوئے تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جنہیں ہم نے خواہواہ اپنے لیے مسئلہ بنالیا تھا سر ہم ایک دوسرے کو بے انتہا چاہنے کے باوجود کچھ کچھ

ہمیشہ سے کم عقل سمجھا جاتا ہے کیا آپ کی ذمہ داری نہیں تھی کہ اُسے اس گڑھے میں گرنے سے بچاتے۔ آخر آپ مرد تھے۔ مرد کی ہمت اور برداشت عورت سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ اگر وہ ضد میں آگئی تھی تو آپ ہی ضد چھوڑ کر معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرتے۔“

وہ بولا ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں نواز صاحب لیکن وہ کوئی بے آسرا لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی ناہانج تھی۔ اپنا اچھا بُرا خوب ٹھیک طرح سمجھتی تھی اور سمجھانے بجھانے کے لیے اس کے بزرگ بھی موجود تھے اور پھر مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ آنا فانا خبر ملی کہ روپ کی شادی چاکرانی سے ہو رہی ہے۔ دو روز بعد اس شادی کی تصویر بھی اخبار میں چھپ گئی۔“

میں نے پوچھا ”اب اس کے بزرگان کہاں ہیں انہیں دکھائی نہیں دیتا کہ اُن کی بیٹی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔“

اجیت نے کہا ”اس کی بڑی بہن شادی کر کے انگلینڈ چلی گئی تھی، اس کی ماں کو بلایا پھر بھائی بھی چلے گئے۔ اب ایک خالہ کے سوا اُس کا کوئی قریبی عزیز دہلی میں نہیں ہے۔ وہ خالہ بھی اکثر شہر سے باہر رہتی ہے۔ اس کا خاوند سرکاری ملازم ہے اور یہ ملازمت گھومنے پھرنے کی ہے۔“

اجیت کے بیان سے بات پوری طرح واضح ہو گئی تھی۔ روپ وٹی اگر رابندر ناتھ چاکرانی کے چنگل میں پھنسی تھی تو اس میں زیادہ قصور روپ وٹی کا اپنا تھا۔ درحقیقت اس نے اجیت سے انتقام لینے کے لیے چاکرانی سے شادی کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ چاکرانی تھمیز کی دنیا میں اجیت کا حریف ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اس نے اپنا آپ چاکرانی کی جھولی میں ڈال کر اجیت کے دل پر آرے چلائے تھے۔

واقعے کو دو ڈھائی برس گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد کبھی ہماری بات نہیں ہوئی۔ دونوں گھرانوں نے بھی قطع تعلق کر لیا۔ جھگڑے کے چار ماہ بعد کی بات ہے۔ ایک روز میں نے بے پناہ صدمے سے یہ خبر سنی کہ روپ وٹی نے ایک رنڈو سے شادی کر لی ہے۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میری مراد رابندر ناتھ چاکرانی سے ہے۔ میں اسے بُرا آدمی تو نہیں کہہ سکتا لیکن وہ بالکل ادھاش ٹائپ کا آدمی ہے۔ تعلیم غالباً اُس کی میٹرک تک ہے۔ باپ پہلوانی کرتا تھا اور اپنے حریفوں کی بڑی پٹلی توڑنے میں مشہور تھا۔ چاکرانی خود بھی جنگجو قسم کا آدمی ہے۔ میری اُس سے بہت کم ملاقات ہوئی ہے اور اس کے گھریلو حالات کے بارے میں تو میری معلومات صفر ہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ اُس کے قریبی دوست بھی اس کے گھریلو حالات کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو اپنی ذاتی زندگی کو کاروباری زندگی سے بالکل الگ رکھتے ہیں۔ شادی کے فوراً بعد اس نے روپ وٹی کو ڈراموں میں حصہ لینے سے منع کر دیا تھا۔ وہ عام تقریبات میں بھی کم ہی نظر آتی تھی..... میں تو غلط کے یہ ٹکڑے دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں ان فقروں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ..... کسی قیدی کی زندگی گزار رہی ہے۔ روپ وٹی جیسی بڑھی لکھی نازک مزاج لڑکی کی چاکرانی جیسے شوہر سے نبھ ہی نہیں سکتی تھی۔“

میں نے کہا ”چاکرانی آپ کی اور ہماری توقع سے بہت آگے کی چیز ہے اجیت کمار صاحب، اگر روپ وٹی کچھ روز مزید اس کے پاس رہ گئی تو وہ ضرور اُسے پاگل کر دے گا۔ میں آپ کی بات سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ روپ وٹی نے چاکرانی جیسے شخص سے شادی کر کے غلطی کی تھی لیکن عورت کو تو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں پڑیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ پریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



ملاپ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی انہوں نے خود اپنے درمیان قاصلے پیدا کر لیے تھے اور اب جب کہ اُن کے درمیان رشتے کی ایک بہت بڑی دیوار حائل تھی وہ ایک دوسرے کی طرف کھینچے چلے آ رہے تھے۔۔۔۔۔ لیکن وقت گزر چکا تھا اور گزرا ہوا وقت شاذ و نادر ہی کسی کے لیے واپس لوٹا کرتا ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وقت روپ وتی اور اجیت کے لیے واپس لوٹے گا یا نہیں۔

تین چار روز بعد یہ کیس فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گیا۔ میرے اور بلال شاہ کے علاوہ گوہند اور اجیت کمار بھی ڈیہڑی پہنچ چکے تھے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے میں دو ہیڈ کاشیبلوں کے ساتھ گورا پہاڑ کی طرف روانہ ہوا۔ جیب کے ذریعے ایک طویل چکر کاٹ کر جانا پڑا تھا لہذا ایک گھنٹے بعد جب ہم گورا پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو چاروں طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ بلندی پر واقع جنگلوں میں صرف چودہ نمبر بجٹکے میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ جیب سے اتر کر ہم بجٹکے کے مین گیٹ پر پہنچے اور چوکیدار کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع اندر بھجوائی۔ تھوڑی ہی دیر بعد چوکیدار واپس آ گیا وہ ہماری آمد سے کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ اُس نے ہمیں سجے سہائے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ڈرائی فروٹ کی طشتری سامنے رکھ کر چلا گیا۔ رابندر ناتھ چاکرائی قریباً پندرہ منٹ بعد آیا۔ اُس نے معذرت کی اور کہا کہ وہ پوجا کے کمرے میں تھا۔ بڑی زبردست اداکاری کر رہا تھا کم بخت۔۔۔۔۔ آنکھوں میں دیرانی تھی اور چہرے پر مظلومیت کے سائے۔ ایک بد نصیب شوہر کی جیتی جاگتی تصویر بنا ہوا تھا وہ۔ میں اس کی اداکاری سے لطف اندوز ہونے لگا۔

میں نے پوچھا ”اب آپ کی مسز کی طبیعت

شب وروز اسے تڑپایا تھا اور رقابت کی آگ میں جلا یا تھا لیکن پھر اس آگ میں وہ خود بھی جلنے لگی تھی جسے اس نے شوہر بنایا تھا وہ بھی کاٹھ کا الو نہیں تھا۔ یقیناً اسے بھی اندازہ ہو گا کہ روپ وتی نے اپنا نوخیز جوہن اس کی ہانہوں میں پھینکا ہے تو کیوں پھینکا ہے۔ وہ روپ وتی اور اجیت کے قصے سے پوری طرح آگاہ تھا لہذا شادی کے پہلے روز سے اُن دونوں میں وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکا جسے محبت کا رشتہ کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ روپ وتی نے چاکرائی کو بیوی کی محبت دینے کی کوشش کی ہو لیکن چاکرائی اسے شوہر کا اعتماد نہیں دے سکا تھا۔ اب وہ خوبصورت چڑیا ایک بے مقصد رشتے کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اور پھڑ پھڑا رہی تھی۔۔۔۔۔ اب اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوا تھا اور وہ مدد کے لیے اپنے ناراض محبوب کو پکار رہی تھی۔۔۔۔۔ بڑی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ میں تو اسے بھی اجیت کی مہربانی ہی کہوں گا کہ وہ روپ وتی کی مصیبت کا سن کر یوں بے قرار نظر آنے لگا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو سوچتا ایک بے وقاف عورت کے لیے اسے کیا ضرورت پڑی ہے چاکرائی جیسے ہائپر شخص سے ٹکرانے کی۔۔۔۔۔ خط کے ٹکڑے دیکھنے اور مجھ سے دیگر حالات جاننے کے بعد اُس کی خوبصورت آنکھوں میں کسی بے نام جذبے کی آگ سی جلنے لگی تھی اور یوں لگتا تھا وہ اڑ کر ڈیہڑی پہنچ جانا چاہتا ہے۔ سارے پرانے شکوے بھول کر ہر نفع نقصان فراموش کر کے اور دل کے سارے داغ چھپا کر وہ ایک بار پھر روپ وتی کو گلے لگا لینا چاہتا ہے۔ عشق ایسا ہی اوٹ پٹانگ ہوا کرتا ہے۔ اونٹ کی طرح اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ آنے والے لمحے کی طرح کوئی اس کے بارے میں پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ جب اجیت اور روپ وتی کے

چاکرانی کا ماتھا اب پوری طرح ٹھنک چکا تھا۔ وہ منہ کر بولا "میں..... کچھ سمجھ نہیں پا رہا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "سمجھ تو تمہیں ساری آ رہی ہے لیکن تم تسلیم نہیں کر رہے ہو۔"

میں ایک دم آپ سے "تم" پر اتر آیا تھا۔ وہ بولکلا کر رہ گیا "انسپکٹر! کیا ہنگی ہنگی باتیں کر رہے ہو کچھ بی کر تو نہیں آگئے ہو؟" میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اُس نے چری بیک میں رکھی ہوئی پھٹری نکال لی۔ ڈرائنگ روم کی خاموشی میں پھٹری کی کھڑکڑاہٹ بڑی دھماکہ خیز محسوس ہوئی۔ چاکرانی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر ڈرلے کے آثار تھے۔ میں نے اس موقع پر مناسب سمجھا کہ ریوالور نکال لیا جائے۔ ابھی میرا ہاتھ ہولسٹر کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ پہلو میں ایک دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں نے ٹھم ٹھم شای کو تیر کی طرح اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی مانند مجھ سے ٹکرایا اور مجھے لیتا ہوا فرش پر ڈور تک پھسل گیا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے چند لمحوں کے لیے دھند سی پھیل گئی۔ دھند صاف ہوئی تو میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو کھڑکی سے کود کر بھاگتے دیکھا۔ یہ ہندو کانسٹیبل تھا اور اس "قوم کے لوگ" اُسے موقعوں پر اکثر بھاگا ہی کرتے ہیں۔ دوسرا کانسٹیبل سکھ تھا شای کے ساتھ قسم کھتا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رائفل کو ایسی پوزیشن میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شای پر گولی چلا سکے لیکن اس سے پہلے کے رائفل ایسی پوزیشن میں آتی یا میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کانسٹیبل کی مدد کر سکتا۔ ایک برقی سی میری نگاہوں میں کود گئی۔ میں نے شای کی تلوار کو کانسٹیبل کے پیٹ میں گھستے اور باہر نکلتے دیکھا۔

کیسی ہے؟" "بس جی بھگوان کی مرضی ہے" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "وہ جس حال میں رکھے خوش رہنا چاہئے۔" "یعنی کچھ اتفاق نہیں ہوا۔"

"انسپکٹر صاحب! اتفاق اُس وقت ہوتا ہے جب مریض خود بھی صحت یاب ہونا چاہے لیکن جو مریض خود کو تباہ کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہو اُسے کون روک سکتا ہے۔ پہلے وہ دن بھر میں ایک بوتل پیتی تھی اب اس سے بھی بڑھ گئی ہے۔ نشہ نہ ملے تو ہنگامہ کرتی ہے۔ خودکشی کی دھمکیاں دیتی ہے۔" اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ آدمی بے شک بہت بُرا تھا لیکن اداکار اچھا تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس نے ایک عورت کو ڈیڑھ برس سے جھوٹی انا کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ اُس کے علاوہ وہ اغوا، جس بیجا اور ایذا رسانی جیسے جرائم میں ملوث ہے۔ میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا "چچ چچ بہت ترس آرہا ہے آپ پر، اور آپ کی ہمت پر داد دینے کو بھی جی چاہ رہا ہے۔ میاں بیوی کے رشتے کا صحیح حق ادا کر رہے ہیں آپ۔ بیمار بیوی کی تنہا داری کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں بیٹھے ہیں آپ کو..... تو وکٹوریہ کراس ملنا چاہئے بلکہ کوئی اس سے بھی بڑا ایوارڈ ہونا چاہئے۔"

"جی؟" وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "جی" میں نے اشہات میں سر ہلایا "کتنا خیال ہے آپ کو اپنی جتنی کا، اس کی بیماری کو راز رکھنے کے لیے بندے تک اغوا کر لیتے ہیں آپ اور کئی کئی ماہ تک اُن کے لیے طعام قیام کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ کون جتنی ایسا مائی کا لال ہوگا جو اس حد تک جائے گا، وکٹریل..... ریلی ایکسٹرا آرڈینری۔"

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

حج عمرہ اور زیارات

شائع ہو گیا ہے

قیمت 195 روپے

- ❖ نقشہ ارض القرآن مع اہم قرآنی مقامات کی نشان دہی
- ❖ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا روڈ میپ
- ❖ حج اور عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ آسان اور عام فہم زبان میں
- ❖ اہم تاریخی مقامات کا نام، وجہ تسمیہ، محل وقوع، تصاویر اور ان سے متعلق تاریخی واقعات کا بیان نیز متعلقہ آیات اور احادیث کے حوالہ جات
- ❖ تحریروں، تصویروں اور جدید نقشوں سے مزین یہ کتاب ہی نہیں حج اور عمرہ پر جانے والوں کے لئے ایک مکمل گائیڈ ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریوازا گاڑن لاہور فون 042-37245412

اندر ہا دھند مجھ پر وار کرنے لگا۔ میں اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کے وار بجا رہا تھا۔ معلوم نہیں کتنی بار شاہی کی تلوار میرے جسم کو چھو کر گزری۔ کتنے چر کے لگے اور کتنے زخم آئے۔ مجھے وہ مناظر ”دھندلے دھندلے“ سے یاد ہیں۔ بنگلے کے نوکر ڈرے سبے دیواروں سے لگے تھے۔ چاکرانی کا چہرہ خنجر ہو رہا تھا اور وہ چلا چلا کر شاہی سے کچھ کہہ رہا تھا میرا لباس کٹی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور تلوار چھیننے کی کوشش میں ایک ہاتھ بُری طرح سے زخمی تھا جو نمی میں ڈرائنگ روم کی کمر کی پر پہنچا میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ بنگلہ چونکہ ڈھلوان پر تھا لہذا کمر کی سے چھلانگ لگا کر میں قریباً بیس فٹ نیچے پتھریلی زمین پر گرا۔ دونوں پاؤں پر چوٹ آئی تاہم ایسی چوٹ نہیں تھی کہ میں گھڑانہ ہوسکتا۔ جیب قریباً چالیس گز کی دوری پر موجود تھی اور اس میں ایک بھری ہوئی شاٹ گن رکھی تھی۔ میں دوڑ کر جیب تک پہنچ سکتا تھا لیکن نجانے کیوں مجھے امید تھی کہ جیب تک جانے کی نوبت نہیں آئے گی اور پھر وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا غضب میں پھنکارتے ہوئے شاہی نے اپنے ڈیل ڈول کی پرواہ کیے بغیر کمر کی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ ترچھا ہو کر زمین پر گرا۔ جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر پھر گر گیا۔ میں نے اسے دوسری کوشش کرنے کا موقع نہیں دیا اور لپک کر دیوچ لیا۔ جونہی اس کی تلوار والی کلائی میری گرفت میں آئی میں نے بے پناہ نفرت سے کلائی کو مروڑا اور تلوار اُس کے ہاتھ سے گرا دی۔ اس نے اپنے استرا پھرے ہوئے سر سے ٹکڑا کر مجھے گوبند کی طرح کسی کھائی میں پھینکنا چاہا لیکن اس دفعہ اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی ٹکر میرے چہرے کی بجائے سر پر لگی یہ آخری وار تھا جو اس

کا ٹیبل کے منہ سے ایک جھج ٹکلی اور وہ تڑپ کر فرش پر جا گرا۔ یہ سارا واقعہ ایک سیکنڈ کے مختصر وقت میں رونما ہو گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں سیدھا کھڑا ہوا تو شاہی دونوں ہاتھوں میں خون آلود تلوار سونت کر میرے سامنے آچکا تھا۔ وہ مناظر میری زندگی کی چند ناقابل فراموش یادوں کا حصہ ہیں۔ آج بھی تصور کرتا ہوں تو سب کچھ آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ جاتی ہے۔ شاہی کا صفا چٹ چہرہ انگارے کی طرح دھب رہا تھا اور آنکھوں میں جنون کا رقص تھا۔ وہ بڑی خوفناک آواز میں غرایا، ”تھانیدار تجھے کہا تھا ناں۔ اس وقت کو بھولنا مت..... اس وقت کو یاد رکھنا۔ بول..... کہا تھا ناں تجھے؟“ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ تھا اور میرے خون کا پیاسا نظر آ رہا تھا۔ میں اسے جوڈیشل ریماڈ پر جیل میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا رہا ہونا بعید از قیاس تھا۔ یقیناً وہ جیل توڑ کر آیا تھا۔ بہر حال یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔ یہ وقت تھا شاہی کی قاتل تلوار پر لگا رکھنے کا اور خود کو اس تلوار کی ظالم کاٹ سے بچانے کا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس وقت میرے قدموں میں زخمی کا ٹیبل کا جسم پھڑک رہا تھا اور میں دیوار سے پشت لگائے شاہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید چاکرانی نے شاہی کو روکنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن شاہی کہنے سننے کی حد سے گزر چکا تھا ”میرے گل“ سے کم وہ کسی بات پر راضی نہیں تھا، غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ہی وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے پہلے دو وار میں نے صاف بچائے لیکن تیسرا وار میرے کندھے پر پڑا اور تلوار کی دھار جرسی قمیص اور بنیان کاٹ کر کندھے میں پیوست ہو گئی..... ایک بار مجھے نشانہ بنانے کے بعد شاہی کی زندگی کچھ اور بڑھ گئی وہ

جوش میں کھو گئے ہوش

کہتے ہیں کہ جوش میں کبھی بھی ہوش نہیں کھوئے جانتے دہنہ لیتے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔ امریکہ کے ایک صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جو اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ چھٹی منانے چھٹی کے شکار پر جا پہنچے اور جیسے ہی چھٹی کاٹنے میں آئی یہ ایسے جوش میں آئے کہ ہوش ہی کھو بیٹھے۔ چھٹی کے کاٹنے میں پختے ہی یہ بھی بھول گئے کہ وہ کشتی میں ہیں اور حزام سے پانی میں جا گرے۔ چھٹی ہاتھ میں کیا آئی تھی اٹلا اسی کے پاس پانی میں پہنچ گئے۔ (مرسلہ: نورین سفیر۔ لالہ موسیٰ)

جادوئی گاڑی

گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کا محاورہ ایک کار پر بالکل صادق آتا ہے جو پہل بھر میں رنگ، منظر اور شکلیں بدل کر دلفریب مناظر پیش کرتی ہے۔ جرمنی میں ایک شو کے دوران پیش کی گئی یہ کار مختلف لائنوں کے ذریعے انتہائی تیزی سے یہ انوکھے کرب دکھاتی ہے جو دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے لیکن حرے کی بات تو یہ ہے کہ یہ کار خود کرب نہیں دکھا رہی بلکہ یہ صرف آنکھوں کا حسین دھوکہ اور جدید ٹیکنالوجی کا کمال ہے۔

(مرسلہ: ناجیہ خالد۔ راولپنڈی)

زور زور سے رونے لگی۔ اجیت نے اسے کندھے سے لگا لیا اور دلاسہ دینے لگا۔

ڈلہوڑی کے تھانے میں پہنچ کر روپ وٹی نے جو طویل بیان دیا اس میں اہم بات یہی تھی کہ چاکرانی نے اسے جس بیجا میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ ”یہ میرا شریک حیات نہیں جلاد ہے۔ اس نے ڈیڑھ برس سے مجھے قید تہائی میں رکھا ہوا ہے۔ میں دن رات اس کی گالیاں سنتی اور

نے کیا۔ اس کے بعد وہ صرف دفاع کرتا رہا اور آخر دفاع کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ ارد گرد کے بہت سے مقامی لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو چکے تھے۔ یہ میرے حق میں بہت بہتر ہوا کیونکہ مجمع گھٹنے کے بعد چاکرانی یا اس کے نوکروں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ کسی بھی طرح شاعری کی مدد کر سکتے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر یہ سارا کھیل ختم ہو گیا۔ شاعری لہو لہان فرش خاک پر پڑا تھا۔

شاعری اور چاکرانی گرفتار ہوئے (شاعری کے کارندے دو لورام کو بعد میں، میں نے پشاکوٹ سے پکڑ لیا) تھوڑے دیر بعد ڈلہوڑی سے پولیس کی مزید نفری گورا پہاڑ پہنچ گئی۔ اس نفری کے ساتھ دو ڈاکٹر اور ابتدائی طبی امداد کا سامان بھی تھا۔ سکھ ہیڈ کانسٹیبل کے پیٹ میں تلوار کا گہرا زخم آیا تھا اور آنتوں کو نقصان پہنچا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے چاکرانی کے ہتھکے میں ہی طبی امداد پہنچائی اور پھر حرید علاج معالجے کے لیے جیپ میں ڈال کر ڈلہوڑی لے گئے۔ پولیس کی مزید نفری آنے کے بعد ہم نے چاکرانی کے وسیع ہتھکے کی تلاشی لی۔ چاکرانی کے پیڑروم سے عیاشی کے دیگر سامان کے علاوہ ایک نو عمر طوائف بھی برآمد ہوئی جس وقت میں ہتھکے میں پہنچا چاکرانی اسی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں منارہا تھا۔ نتیجے میں میں پندرہ بیس منٹ اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ آکر چاکرانی نے بتایا تھا کہ وہ ”پوچا پاٹ کے کمرے“ میں تھا۔۔۔۔۔ (اچھی پوچا پاٹ تھی) روپ وٹی کو بالائی منزل کے ایک تنگ تاریک کمرے سے برآمد کیا گیا۔ شراب نوشی نے اس کی حالت بہت ہلکی کر دی تھی پھر بھی وہ خوبصورت نظر آتی تھی۔ یقیناً وہ بہت خوبصورت رہی ہوگی۔ ڈلہوڑی سے پولیس پارٹی کے ساتھ اجیت کمار بھی آیا تھا۔ اجیت کو دیکھ کر وہ

بعد جب وہ ڈلہوڑی پہنچا اور اپنے اہل خانہ سے ملا تو ایک دیدنی منظر دیکھنے میں آیا۔ اس موقع پر اس کے کئی پرستار بھی جمع ہو چکے تھے۔ پرستار..... پرستار ہی ہوتا ہے۔ ان پرستاروں کو بھی یہ معلوم تھا کہ ان کے ”بھیرو“ نے سالانہ ریس میں اپنی فتح کا سودا کیا تھا پھر بھی وہ اُس کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ اس موقع پر گوبند اپنے کیے پر بہت نادم نظر آ رہا تھا..... بہر حال اس عداوت میں ایک نئی زندگی مل جانے کی خوشی بھی شامل تھی۔ زندگی..... جو انسان کو میسر ہو تو غلطیوں کی تلاشی کے ہزار ہا موقع مل جاتے ہیں۔ گوبند کے لیے ایک اور خوش کن بات یہ تھی کہ وہ قتل کے الزام سے بچ گیا۔ چاکرانی کے بچنے سے فرار ہوتے وقت اس کے ہاتھوں جس چوکیدار کو گولی لگی تھی وہ مرا نہیں تھا صرف زخمی ہوا تھا۔ یہ جسمانی ضرر کا کیس تھا اور حفاظت خود اختیاری کے ضمن میں آ کر زیادہ سنگین نہیں رہتا تھا۔

اس کیس کے بڑے مجرموں شای اور چاکرانی کو بالترتیب بارہ اور آٹھ سال قید با مشقت کی سزا ہوئی جبکہ دولورام کو مختلف دفعات کے تحت پانچ سال قید بھگتنا پڑی..... ان واقعات کے قریباً ایک سال بعد اجیت کمار اور روپ دتی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ واقعی بہت خوب جوڑی تھی وہ۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ میاں بیوی تھیر کے لوگ ہیں۔ زیادہ دیر یہ ساتھ بھا نہیں سکیں گے لیکن اس جوڑے نے ان تمام دعوؤں کو غلط ثابت کر دیا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد بھی مجھے ان دونوں کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں۔ گو ان کی نرینہ اولاد نہیں تھی مگر وہ دہلی میں بڑی خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے.....!

ٹھوکریں کھاتی رہی ہوں۔ بھگوان جانتا ہے مجھے شراب کی عادت ڈالنے والا شخص بھی یہی ہے۔ یہ پرلے درجے کا شکی حراج اور مکار شخص ہے۔ یہ میری پاک دامنی پر شبہ کر کے مجھے بے وفائی کے طعنے دیتا تھا اور خود بازاری عورتوں کے ساتھ سوتا تھا۔ اس نے مجھے قتل نہیں کیا باقی ہر وہ ظلم کیا ہے جو یہ کر سکتا تھا.....“۔

روپ دتی کے سخت ترین بیان کے بعد چاکرانی کے خلاف کیس حرید مضبوط ہو گیا۔ جو رہی سہی کسرتھی وہ شای کی وجہ سے پوری ہو گئی۔ شای کے ساتھ چاکرانی کا تعلق اب ثابت ہو چکا تھا۔ اس تعلق کی مختصر کہانی یہ ہے کہ کھائی سے گوبند کے غائب ہو جانے کے بعد شای ہاتھ پر ہاتھ دھر کے نہیں بیٹھ گیا تھا۔ وہ مسلسل اس کی تلاش میں رہا تھا۔ آخر اُسے شک ہو گیا تھا کہ گوبند گورا پہاڑ پر اداکار چاکرانی کے بچنے میں ہے۔ وہ چاکرانی کے بچنے تک جا پہنچا تھا۔ چند دن کے تعلق کے بعد ان دونوں میں ”ایڈر سٹینڈنگ“ ہو گئی تھی شای نہ صرف چاکرانی کا راز دار بن گیا تھا بلکہ چاکرانی کی راتوں کو ”چکانے“ کے لیے اُس کے واسطے شہر سے بازار حسن کے ”تختے“ بھی لاتا تھا۔ جب شای میرے ہاتھوں پکڑا گیا تو یہ کام اس کے کارندے دولورام نے سنبھال لیا۔ ان لوگوں کی بد قسمتی اور روپ دتی کی خوش قسمتی کہ دولورام میری نگاہ میں آ گیا اور میں اس کا پیچھا کر کے چاکرانی کے بچنے تک جا پہنچا۔

شای کو گرفتار کرنے کی کوشش میں مجھے کافی زخم آئے تھے لیکن خوش قسمتی سے کندھے کے علاوہ کوئی زخم سنگین نہیں تھا۔ تین چار روز کی مرہم پٹی سے یہ زخم ٹھیک ہو گئے۔ اس کہانی کا اہم ترین کردار گوبند ہے..... نو مہینے کی پراسرار کشدگی کے



فیضان مبارک

تغاوت

اب وہ سارا کتبہ بینار پاکستان :- ہا تھا وہاں سیٹھ صاحب نے پہلے سے ہی تمام احکامات دیئے ہوئے تھے۔ ساگرہ کا نوکلوزنی ہوموم بیوں والا کیک رکھا جا چکا تھا۔ قلعے جلنے کو تیار تھے۔ تالیاں بجنے کو منتظر تھیں۔ بوسے لیوں پر مچل رہے تھے اور چہرے مسکراہٹوں کے لئے بے تاب تھے۔ گاڑی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

ایک خاندان کا فساد، چند لمحوں نے اُن کی زندگی کی کہانی بدل دی تھی

اس کے ہاتھ میں اسٹک اعلیٰ لذیذ ہوں۔
وہ تھا بھی تو نو سال کا بچہ، جس کی سات بہنیں
اسی کی آرزو کے نتیجے میں دنیا پر آئیں تھیں۔ آج وہ
خوب تیار ہو کر سجا ہوا تھا۔ معصوم سا پھول تھری پیس
سوٹ پہنے ہوئے کمال لگ رہا تھا۔ بوٹ خود چمکا کر

آج لوگ معمول سے زیادہ گزر رہے تھے۔
سرکیں قدموں کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں۔
دھوپ بہت ترش معلوم نہ ہوتی تھی۔ گاڑیاں جھوم
سے بے پردا ہو کر فرالے بھر رہی تھیں۔ درخت جھوم
جھوم کر فطرت کا سہرا سارے تھے۔ فیضان کو لگا جیسے



دے گئے اور جب وہ بغل گیر ہوئے تو فیضان کافی دیر تک ان کے ہال کھینچا رہا۔

اور اب وہ سارا کنبہ بیٹار پاکستان جا رہا تھا وہاں سیٹھ صاحب نے پہلے سے ہی تمام احکامات دیئے ہوئے تھے۔ سالگرہ کا نوکلو ورنی، موسم تہوں والا کیک رکھا جا چکا تھا۔ قہقہے جلنے کو تیار تھے۔ تالیاں بجنے کو مقرر تھیں۔ بوسے لمبوں پر چل رہے تھے اور چہرے مسکراہٹوں کے لئے بے تاب تھے۔ گاڑی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

یہ ایک ایک دلدوز گرج سے لاہور لڑا تھا۔ یہ کسی خودکش کا کمال تھا جھوٹے فضاؤں میں بلند ہوئے اور سرخ پانی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ کٹے پھٹے لاشے بکھر گئے۔ سات بہنوں کا اگلوٹا بھائی، بہنوں سمیت کئی کلوڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ہر طرف ہلکا کارنچ گئی فوارے کا زور ختم ہوتا گیا اور بالآخر دھرتی پر خون کا تالاب بن گیا اور اعضاء یوں تیرنے لگے کہ عرش بھی کانپ اٹھا ہوگا۔

ایک قلم سی چل گئی تھی، تحفوں کا انبار ڈوب گیا تھا۔ تازہ خون اور بارود کی ملی جلی لٹ سے فیضان شراپور ہو گیا تھا، بوٹ اور تھری پیس بے مصرف ہو گئے تھے۔ ساتوں بینیں اسی کی آرزو میں واپس ہو چکی تھیں۔

لوگ معمول سے کم ہو گئے تھے، سڑکیں بوجھ سے آزاد ہو چکی تھیں۔ دھوپ اور گرمی ہڈیوں کو پگھلا چکی تھی۔ گاڑیاں بالکل رُک چکی تھیں۔ درختوں سے مریچے پڑنے کی آوازیں آرہی تھیں اور دیکھنے والوں نے سمجھا کہ فیضان کلاسٹ بہت بے ذائقہ لگے ہیں کیونکہ اس کے ہونٹوں پر سرخ پانی اور بسکٹوں کا آمیزہ بکھرا ہوا تھا اور اور فیضان کی زندگی کا کیک کٹ چکا تھا۔

شیخ سعدی

شیخ سعدی سفر کر رہے تھے۔ ساتھ ان کا گدھا تھا۔ ایک گاؤں میں پہنچے تو رات پڑ گئی۔ سردی کے دن تھے۔ رات بسر کرنے کا ٹھکانا تلاش کرنے لگے۔ گاؤں والوں میں سے کوئی ٹھکانہ دینے پر رضامند نہ ہوا۔ آخر ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر والے نے کہا ”میری بیوی دردِ زہ میں تڑپ رہی ہے۔ اگر دُعا کریں تو جگہ دے دوں گا۔“ شیخ سعدی مان گئے۔ انہیں کمرہ مل گیا۔ پھر انہوں نے کاغذ کے ایک پمڈے پر ایک تعویذ لکھا اور گھر والے سے کہا، اسے مریضہ کے بدن پر باندھ دے۔

تعویذ باندھتے ہی بچہ پیدا ہو گیا۔ اگلی صبح شیخ سعدی تو چلے گئے لیکن گاؤں والوں نے تعویذ سنبھال کر رکھ لیا۔ جب بھی کسی گاؤں کی عورت کو زچگی کی تکلیف ہوتی تو وہ وہی تعویذ لے جا کر باندھ دیتے۔ تکلیف رفع ہو جاتی۔

گاؤں کے مولوی کو اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر تعویذ پر لکھی ہوئی آیت کا پتہ چل جائے تو اسے بڑا فائدہ ہوگا۔ مولوی نے جھوٹ موٹ کا بہانہ تراشا اور تعویذ مانگ کر لے گیا۔ اسے کھولا تو لکھا تھا ”یا اللہ میں اور میرا گدھا اب آرام سے ہیں۔ ٹھکانہ مل گیا ہے۔ ہاتی ٹو جانے اور تیرا کام جانے۔“

(مرسلہ: ندیم احمد۔ ساہیوال)

سویا تھا۔ خوشبو کے جھوٹے اس کے بدن سے اٹھ رہے تھے۔ رات کو اس کی بہنوں اور ماں نے اس کی سالگرہ کا کیک کاٹا تھا اور تحفوں کے انبار میں دبا ہوا وہ کتنا پیار لگ رہا تھا۔

آج فیضان کے ابو نے فون پر بھی اس سے بات کی اور اگلے ہی لمحے وہ فیضان کے سامنے آ گئے۔ اسے لگا وہ کوئی قلم دیکھ رہا ہے۔ وہ بار بار آنکھوں کو مل رہا تھا۔ سیٹھ نذیر اپنے بیٹے کو سر پر اتار

گرمی دالنے

حکیم راحت نسیم سوہدروی

جب جس کی حالت ہو تو جلد کی سب سے بیرونی جھلی کے نیچے آبی رطوبات کے چھوٹے چھوٹے قطرے موتیوں کی طرح اکٹھے ہو کر گرمی دالنے بنا دیتے ہیں۔ اگر ان کو دبایا جائے تو کبھی دردِ تکلیف اور جلن ہوتی ہے۔

ساتھ انسان کے سارے وجود پر بھی ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اعمال و افعال میں سستی چھا جاتی ہے۔ جسم میں حرارت بڑھ جاتی ہے اور پیاس میں شدت ہو جاتی ہے۔ بعض حالات میں زبان خشک ہو کر تالو

موسم گرما میں جب تمازت آفتاب کے باعث جھلسا دینے والی گرمی ہوتی ہے تو انسان ہی نہیں حیوان اور پرند و چرند بھی اذیت محسوس کرتے ہیں۔ اس شدید موسم کا اثر جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں کے



موتیوں کی طرح اکٹھے ہو کر گرمی دانے بنادیتے ہیں۔ اگر ان کو دبایا جائے تو کبھی دروازہ تکلیف اور جلن ہوتی ہے۔ اس طرح یہ کسی نقصان کا باعث نہیں ہوتے تاہم اگر جس یا شدید گرمی ہو تو ان دانوں میں بہت جلن یا جھن ہوتی ہے۔ جس سے اذیت ہوتی ہے۔ جب ان کا اوپر والا حصہ الگ ہو جائے تو ان کی جلن کا باعث پھوڑے پھنسیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ دانے بہت اذیت ناک اور تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ چھوٹے بچے زیادہ متاثر ہوتے ہیں کیوں کہ وہ گرمی کا اثر جلد قبول کرتے ہیں اور ان کا مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ دانے ٹپکتے ہیں وہ ان کے باعث شدید بے چینی اور گھبراہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ان دانوں میں بہت خارش جھن ہوتی ہے۔ ان کی وجہ سے اکثر بچے رات بھر روتے ہیں۔ اگر ہوا چلتی رہے یا بجلی کا پکھا ایئر کولر یا ایئر کنڈیشنر میسر ہو تو پھر سکون رہتا ہے۔

بعض افراد اور خاندان میں یہ بہت زیادہ اور بعض میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کھانے کی خوراک سے بے مشا جو لوگ گرم اشیاء جن میں انڈا، مچھلی، مرغی، مصالحہ جات وغیرہ کا زیادہ استعمال کرتے ہیں، اس کے علاوہ تنگ و تاریک مکانات میں رہائش رکھنے والے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ جو افراد یا خاندان شخصوں اور سرد مکانات میں رہتے ہیں۔ وہ اگر گرمی والے علاقوں میں یا مقامات پر جائیں تو ان کے جسم پر دانے بہت زیادہ ہو سکتے ہیں۔

علامات

جب جلد سے پسینہ کا اخراج رک جاتا ہے اور یہ آبی قطرے جلد کے نیچے یک جا ہو کر دانوں کی صورت نمودار ہوتے ہیں تو گرمی دانے کہلاتے ہیں۔ ان میں جلن اور جھن کا احساس ہوتا ہے کبھی

ایک کروڑ سال پرانا ڈائنوسار کا ڈھانچہ دریافت کر لیا گیا

امریکہ میں دس ملین سال پرانا ڈائنوسار کا ڈھانچہ دریافت کر لیا گیا ہے جسے ماہرین نے کنگ آف گور کا نام دیا ہے۔ سات اعشاریہ تین میٹر لمبے اس ڈھانچے کو نمائش کے لئے امریکی ریاست لوائس کے شہر سالٹ لیک سٹی کے عجائب گھر میں نمائش کے لئے پیش کر دیا گیا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ڈائنوسار کی یہ نسل پہلی بار منظر عام پر آئی ہے جس سے قدرت کے پوشیدہ رازوں کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔

(شیخ اسامہ یعقوب / دھرم پورہ لاہور)

موبائل اور قلم ساتھ ساتھ

یوں تو موبائل فون سے کئی طرح کے مفید کام لئے جاتے ہیں لیکن اب اسے بطور ہال بین بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جی ہاں ایک تخلیقی کمپنی نے "جیک بین" نامی انوکھی آئی فون ایسری (Accessory) متعارف کرا دی ہے جسے ہیڈ فون پوڈ میں نصب کرتے ہوئے با آسانی زیر استعمال لایا جاسکتا ہے۔ اس ننھے سے پن نما قلم کو جب لکھنے کیلئے استعمال نہ کیا جا رہا ہو تو فولڈ کر کے فون کے اندر چھپایا جاسکتا ہے اور ضرورت کے تحت پوڈ سے نکال کر لکھا بھی جاسکتا ہے۔ کیوں ہے نا ایک تیر سے دو شکار قلم کا قلم اور سیل فون کا سیل فون۔

(مرسلہ: صفیر احمد - لاہور)

سے جالٹی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہونٹوں کی سرخی غائب ہو کر سیاہی اور بے رونقی جنم لے لیتی ہے۔ پسینہ کثرت سے آتا ہے جس سے جسم پسینہ سے شرابور ہوتا ہے۔ جب جس کی حالت ہو تو ان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس دوران جلد کی سب سے بڑی جھلی کے نیچے آبی رطوبات کے چھوٹے چھوٹے قطرے

اور گرمی سے محفوظ رہنے کے لیے مفید ہے۔
موسم گرما میں جب شدت کی گرمی کے باعث
گرمی دانے ٹکلتے ہیں تو انتہائی اذیت ناک ہوتے
ہیں لہذا ان سے محفوظ رہنے کے لیے مندرجہ بالا
تدابیر اختیار کر لی جائیں تو ان کا دشوں سے ایک حد
تک بچا جاسکتا ہے۔

علاج

☆ برف ملنے سے گرمی دانوں کی اذیت سے
وقتی سکون ملتا ہے۔

☆ صندل سفید، عرق گلاب میں گھس کر شہدا
کر کے لگانا مفید ہے۔

☆ لعاب بھی دانہ تین گرم، عتاب پانچ دانے،
مغز کدو تین گرام کا شیرہ نکال کر شربت نیلوفر دو چمچے
بڑے ملا کر صبح و شام پینا مفید ہے۔

☆ خالق کائنات نے موسم گرما کی گرمی سے ٹکلتے
والے دانوں کے انسداد کے لیے اس سے پہلے ہی موسم
بہار میں گندم کے کھیتوں میں شاہترہ کی بولی پیدا کی
ہے۔ جس میں فشار خون اور حدت خون کی اصلاح کے
لیے عجیب النوع استعداد رکھی ہے۔ مطلب کے تجربات
شاہد ہیں کہ شاہترہ چھ گرام آدھے گلاس پانی میں جوش
دے کر چھان کر شربت عتاب دو چمچے ملا کر صبح و شام قبل
از غذا پینا مفید ہے اور بہت مریضوں کو شفاء ہوئی ہے۔
☆ گرمی دانوں کی جلن اور خارش کے لیے
بیرونی استعمال کے لیے شب بھائی (پھلگری) اور
کانور کو اہمیت حاصل ہے۔

☆ پھلگری چھ گرام کو پانی میں حل کر کے غسل
کیا جائے۔ چند روز تک یہ غسل دانوں کے لیے
مفید ہے۔

☆ جوانہ ایک موثر دوا ہے اس کا استعمال گرمی
دانوں کے لیے مفید ہے۔

ایک طرف زیادہ ہوتے ہیں اور دوسری طرف قاصلے
پر کم ہوتے ہیں۔ پہلے دانے کم ہوتے ہیں تو
دوسرے سے نکل آتے ہیں۔ یہ کبھی سرخ اور کبھی
سفید ہوتے ہیں۔ عام طور پر کمر، گردن اور بظلوں
کے درمیان ٹکلتے ہیں۔

بچاؤ کی تدابیر

☆ گرم اور محرک اشیاء سے پرہیز کیا جائے۔
☆ گرمی کی شدت سے بچا جائے، اس طرح
گرمی کم ہونے سے پسینہ کم آئے گا۔

☆ روزانہ صبح و شام غسل کیا جائے تاکہ جسم میل
پکھیل سے محفوظ رہے اور مسامات کے بند ہونے کا
امکان نہ رہے۔

☆ Polysists یا دیگر مصنوعی ریشہ دار
اشیاء والے کپڑے بھی حساسیت (Allergy) کا
باعث بن جاتے ہیں۔ ان سے احتیاط کی جائے اور
سونی کپڑے استعمال کیے جائیں۔

☆ غذا میں گھیا، توری، کدو، موگ کی دال اور
نماثر مفید ہیں۔

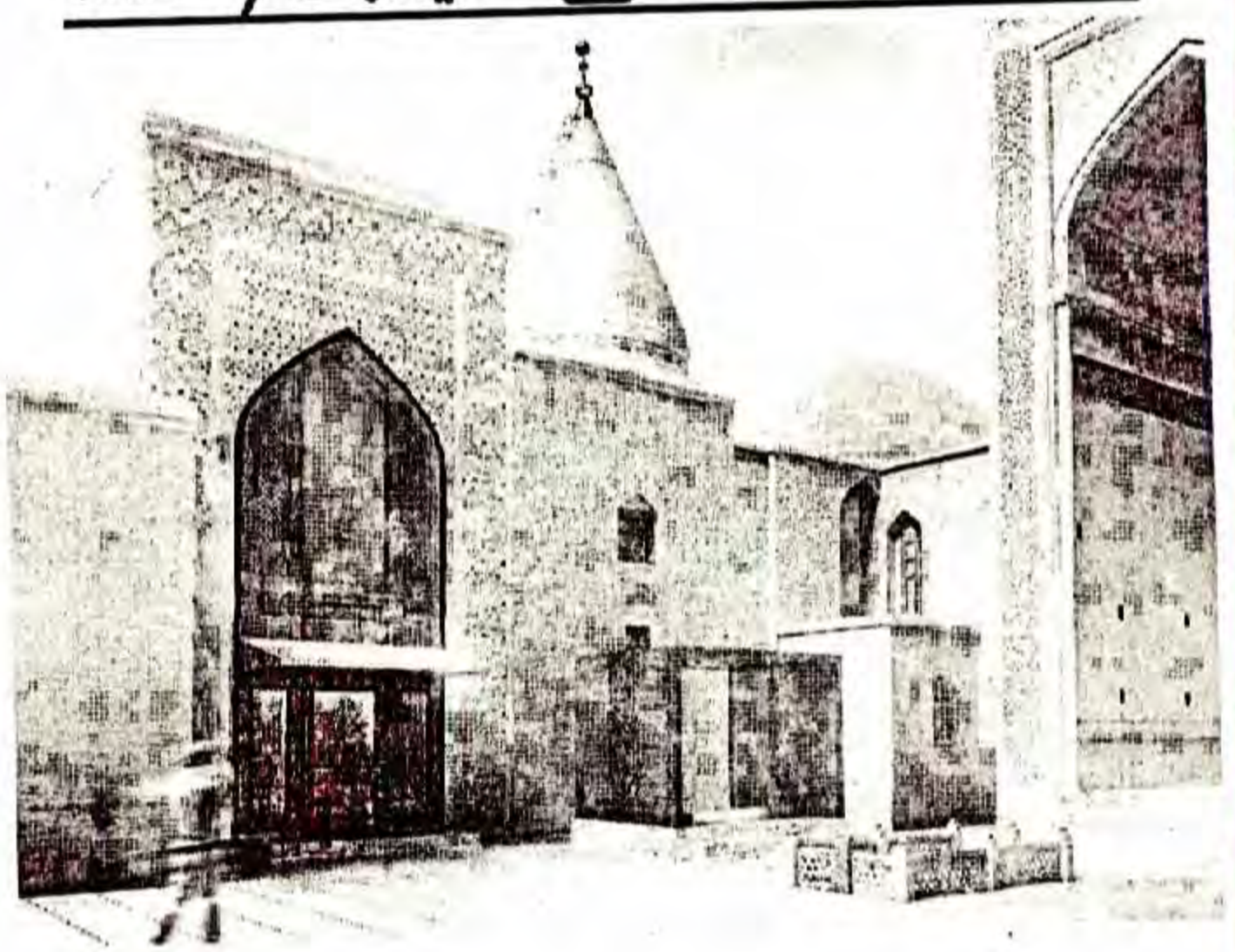
☆ آم کھانے کی زیادہ خواہش ہو تو آم کھانے
کے بعد کچی کسی ضرور پی جائے تاکہ اس کے نتیجے
میں ہونے والی گرمی کے اثرات کو ختم کیا جاسکے۔

☆ دھوپ میں چلتے پھرنے سے احتیاط کریں
اور پسینہ زیادہ آنے کی صورت میں تولیہ یا سونی
کپڑے سے صاف کریں۔

☆ کمزور اشخاص کو اپنی صحت کی طرف متوجہ
ہونا چاہئے۔

☆ موسم گرما میں انڈا، مچھلی، اچار، چائے اور
کافی کا استعمال نہ کیا جائے کیونکہ یہ خون میں حدت
پیدا کرتی ہیں۔

☆ آلو بخارا، لیموں، انار، جامن، تربوز، خربوزہ
اور نیم کی مٹولی کا موسم گرما میں استعمال گرمی دانوں



حضرت بایزید بسطامیؒ

پروفیسر غلام رسول

سلطان العارفین کے حالات زندگی، آپؒ کو بزرگان دین میں وہ مقام حاصل ہے جو فرشتوں میں جبریلؑ کو حاصل ہے!

چینی سے دو چار ہونا پڑتا اور جب تک وہ غذا اُن کے پیٹ سے باہر نہ آجانی ان کی طبیعت بے قرار ہی رہتی بعض اوقات تو اُن کو حلق میں انگلی ڈال کر وہ غذا باہر نکالنی پڑتی۔ اس کیفیت کو وہ بہت شدت سے محسوس کرتی تھیں۔ بچے کی ولادت میں ابھی چند ماہ باقی تھے کہ شیخ عیسیٰ اس دارقانی سے رحلت فرما گئے۔

ایرانی صوبے قومس کے شہر بسطام میں ایک حجرہ موبدان تھا۔ اس میں ایک بہت ہی عابد و زاہد اور نیک نفس بزرگ رہتے تھے۔ جن کا نام شیخ عیسیٰ تھا۔ اُن کی زوجہ محترمہ اُمید سے تھیں۔ اُن کو یہ بات شدت سے محسوس ہوئی کہ جب بھی وہ کوئی مشتبہ غذا لاعلمی میں کھا لیتیں تو اُن کو عجیب قسم کی بے کلی اور بے

اور علماء سے علوم دنیوی اور دنیاوی سکھے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ رہنمائی اور فیض مجھے اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوا ہے کیونکہ دیگر مشائخ اور بزرگوں نے علم اپنے جیسے لوگوں اور بزرگوں سے سیکھا بھی ان کا علم باقی نہیں رہا جبکہ میں نے علم خدا سے حاصل کیا اس لیے میرا علم زندہ ہے۔ آپ آنحضرت ﷺ کے اس قول مبارکہ ”جو شخص اس چیز پر عمل کرتا ہے جسے وہ جانتا ہے تو اسے خدا ایسے علم کا وارث بنادیتا ہے جو اسے معلوم نہیں ہے“ کی تفسیر تھی۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرے علم کا ماخذ خدا کی بخشش ہے۔

آپ کرملت ظاہر کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کے ساتھ کافی مدت رہا۔ پھر آپ سے بدل ہو کر جانے لگا۔ آپ نے اس طرح جانے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اتنی مدت ساتھ رہنے کے باوجود اس شخص نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا تم نے مجھے خلاف سنت اور خلاف شریعت کبھی کوئی کام کرتے دیکھا۔ جواب ملا بالکل نہیں۔ آپ اس پر سختی سے پابند ہیں۔ آپ نے فرمایا اس سے بڑی اور کیا کرامت ہوگی۔

آپ ہمیشہ مسجد کی خدمت کرتے۔ آپ نے چالیس سال تک مسجد کی صفائی ستھرائی کا ذمہ اپنے سر لے رکھا تھا۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت لرز جاتے کہ مبادہ کہیں میں ناپاک تو نہیں ہوں کہ اس طرح میرے جانے سے مسجد آلودہ نہ ہو جائے۔ آپ کے مجاہدات بہت سخت تھے۔ آپ نے ایک مرتبہ آدمی رات کو ارادہ کیا کہ میں بقیہ رات عبادت کروں گا جبکہ نفس نے مخالفت کی اس پر آپ نے قسم کھائی کہ میں اپنے نفس کو ایک سال تک پانی سے محروم رکھوں گا۔ چنانچہ ایک سال آپ نے پانی کے بغیر گزارا۔ بقول مولانا روم ”پانی کا بکثرت استعمال سستی اور کمال کا باعث بنتا ہے۔“

پاپ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والا یہ یتیم بچہ آئندہ زندگی میں روحانیت کی کن بلندیوں کو چھوئے گا اور سلطان العارفین کہلائے گا اس بات سے کوئی بھی واقف نہیں تھا کہ یہ بچہ کون تھا۔ ان کو کیا مقام ملا، یہ بعد کی آنے والی دنیا نے دیکھا اور رہتی دنیا تک اس کا نام روشن رہے گا۔ یہ یتیم بچہ حضرت یازید بسطامی تھے آپ کو بزرگان دین میں وہ مقام حاصل ہے جو فرشتوں میں جبرئیل کو حاصل ہے۔ توحید کے معاملات اور مسائل میں تمام بزرگوں کی انجھا آپ کی ابتدا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ حضرت کے گلستان میں جو پھول لوگوں نے دو سو سال کی محنت شاقہ سے حاصل کیے وہ میں نے اپنی اوائل عمری میں ہی حاصل کر لیے۔ بزرگان کی متفقہ رائے ہے کہ یازید کے مراتب تک کوئی اور نہیں پہنچا۔

آپ نے مکتب میں داخل ہوتے ہی قرآن مجید کی آیات سے استدلال حاصل کرنا شروع کر دیا۔ آپ خدا کے اس فرمان کو کہ ”میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو“ پڑھ کر بہت زیادہ بے چین ہوئے اور والدہ سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا۔ والدہ نے کہا کہ میں تم کو خدا کے سپرد کرتی ہوں تم خدا کا شکر ادا کرو اور علم کی تلاش کرو۔ علم کی تلاش میں آپ نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں خاک چھانی۔ بہت سے علماء اور مشائخ حضرات سے ظاہری اور باطنی علوم سکھے۔

وہ مسلسل تیس سال شام کے صحراؤں اور میدانوں میں پھرتے رہے۔ اس مدت میں آپ نے 170 علماء اور مشائخ سے فیوض حاصل کیے۔ آپ کے اساتذہ میں امام جعفر بھی شامل ہیں۔ آپ نے اپنے اساتذہ کی طرف کبھی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ بہت جلد مکمل ہو گئے۔ امام صاحب کے حکم سے آپ واپس بسطام لوٹے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بلاشبہ میں نے اساتذہ

حاضرین میں تقسیم کر دیئے اور فرمایا کہ اگر میں نفس کی آرزو پوری کر دوں تو یہ مجھ پر غالب آجائے گا اور میں کچھ بھی نہ رہوں گا۔ جو شخص نفس کی آرزو پوری کرے وہ بیچ ہے اس کے عمل میں سستی واقعی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک عقیدت مند کہیں سے بہت ہی خوبصورت سیب لایا غالباً اس کو معلوم تھا کہ حضرت کو سیب بہت پسند ہیں۔ آپؐ نے سیب دیکھا اس کی رنگت اور خوبصورتی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ کس قدر لطیف سیب ہیں۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ اللہ کا نام لطیف ہے اور یہ نام سیب کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔ بہت پشیمان ہوئے۔ اس کے بعد عمر بھر سیب کو چھوا تک بھی نہیں۔

حضرت بایزیدؒ ایک مرتبہ حضرت رسول اکرم ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضر تھے۔ درود و سلام کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی عالم میں غنودگی طاری ہو گئی۔ آنحضرتؐ کا دیدار ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بایزیدؒ اٹھو جا کر اپنی ماں کی خدمت کرو۔ آپؐ اسی وقت بسطام کے لیے روانہ ہو گئے۔ رمضان کا مہینہ تھا آپؐ کی آمد کی خبر سن کر لوگ آپؐ کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے۔ آپؐ کا نفس اس طرح والہانہ استقبال پر بہت خوش ہوا۔ آپؐ نے فوراً روٹی کھانا شروع کر دی۔ لوگ آپؐ سے بدظن ہو کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بعد میں آپؐ نے اپنے خاص مریدین کو بتلایا کہ یہ لوگ کس قدر ظاہرین ہوتے ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ مسافر پر روزہ فرض نہیں ہے۔ آپؐ جس وقت اپنے گھر پہنچے اس وقت آدمی رات ڈھل چکی تھی، آپؐ کی والدہ محترمہ مناجات اور درود و طائف میں مشغول تھیں اور دعا کر رہی تھیں یا اللہ میرے لخت جگر کو واپس بھیج دے۔ آپؐ نے فوراً دروازے پر دستک دی اور کہا کہ والدہ میں آپؐ کا بیٹا بایزید ہوں اور واپس آ گیا ہوں۔ آپؐ کی والدہ آپؐ

حضرت محبوب الہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جناب بایزیدؒ بسطامی کے مجاہدات اور نفس کشی کے متعلق اپنے مریدین کو بتلایا کرتے تھے کہ اسلام نام کے طور پر تو بہت آسان ہے لیکن اس کے کام اور پابندیاں بہت مشکل ہوتی ہیں۔ بایزیدؒ فرماتے کہ جب میں مسلمان ہوں۔ لوگ مجھے مسلمان سمجھتے ہیں تو میں مسلمان ہونے کا حق کیوں نہ ادا کروں۔

جب حضرت بایزیدؒ خراسان کی سیاحت میں مصروف تھے تو آپؐ کو حج کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ آپؐ ہر قدم پر نفل ادا کرتے کرتے کعبہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حج کے بعد آپؐ نے خیال کیا کہ میں خدا کے گھر گیا ہوں لیکن گھر والا مجھے کہیں نظر نہیں آیا لہذا میرا حج قبول نہیں ہوا۔ دوسرے سال بھی اسی طرح ہوا لیکن تیسرے سال آپؐ بہت خوش ہوئے کہ اب کی مرتبہ مجھے گھر والا ہی چہار سو نظر آیا اور گھر نظر نہیں آیا۔

حضرت بایزیدؒ آنحضرت ﷺ کے سچے عاشق تھے مکہ جاتے تو مدینہ نہ جاتے کہ یہ خلاف ادب ہے کہ مدینہ کی زیارت مکہ کے ماتحت رکھی جائے۔ بلکہ وہ مدینہ باقاعدہ اہتمام کے ساتھ جاتے۔

آپؐ کے اشیاء کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حج پر روانہ ہو رہے تھے کہ ضرورت مند آ گیا۔ آپؐ سے کہا کہ آپؐ کے پاس کتنی رقم ہے؟ آپؐ نے فرمایا میرے پاس 200 دینار ہیں اور میں حج پر روانہ ہو رہا ہوں۔ اس نے سوال کیا کہ میں ضرورت مند ہوں آپؐ یہ رقم مجھے دے دیں اور میرے گردطواف کر لیں آپؐ کا حج ہو جائے گا اور میری ضرورت پوری ہو جائے گی۔ آپؐ نے ایسا ہی کیا۔

نفس کشی کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کو عمر بھر سیب کھانے کی آرزو رہی لیکن صرف اس وجہ سے نہیں کھایا کہ اس سے نفس کو تسکین حاصل ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ ایک عقیدت مند سیب لایا آپؐ نے

پوچھا کہ تم کون ہو اُس نے بتلایا کہ جب تم نے کسی کامل شخص کو خدا سے طلب کیا، میں تقریباً یہاں سے تیس ہزار میل دور تھا اور یہاں حیرے پاس آیا ہوں اور تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ اپنے دل کی عمرانی کرو۔ ایک رات حضرت بایزید بسطامی عبادت میں مصروف تھے کہ آپ کا حجرہ ایک دم منور ہو گیا۔ آپ حیران ہوئے اور فرمایا کہ اگر تو یہ شیطان کی کارستانی ہے تو میں اس کے فریب میں آنے والا نہیں اور اگر یہ نور مقربین کی جانب سے ہے تو میں اس کو اپنی خوش نصیبی خیال کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ آپ کو عبادت میں سکون نہیں آرہا تھا آپ گھبرا گئے گھر والوں سے دریافت کیا کہ گھر میں کوئی چیز تو نہیں ہے۔ پتہ چلا ایک انکڑ کا گچھا موجود ہے آپ نے اُس کو فوراً خیرات کر دینے کا حکم دیا۔ اس پر اُن کے اوپر انوار کی بارش ہونے لگی اور عبادت کا مزاد بالا ہو گیا۔ آپ ہی کے متعلق ایک غیر مسلم نے کہا تھا کہ اگر اسلام اس کا نام ہے جو بایزید کو حاصل ہے تو اس کی مجھ میں طاقت نہیں اور اگر اسلام وہ ہے جس کے تم سب لوگ ناسخدے ہو تو مجھ کو اس پر اعتماد نہیں ہے۔ کسی شخص نے حضرت بایزید سے سوال کیا کہ آپ کا مرشد کون ہے؟ آپ نے فرمایا ایک بوڑھی عورت کیونکہ میں ایک مرتبہ جنگل میں تھا۔ ایک بڑھیا سر پر آٹا اٹھائے آرہی تھی۔ تھکاوٹ اور پیراں سالی کی وجہ سے وہ بوجھ اٹھانے سے قاصر تھی چنانچہ مجھے کہا کہ میں یہ آٹا اس کے گھر پہنچا دوں۔ اسی اثناء میں ایک شیر آگیا اور بایزید فرماتے ہیں کہ میں نے آٹا شیر کی کمر پر رکھ کر بڑھیا سے کہا کہ آٹا تو یہ شیر تمہارے گھر پہنچا دے گا مگر اس سلسلہ میں لوگوں سے کیا کہیں گی۔ اس پر بڑھیا نے جواب دیا کہ میں کہوں گی کہ آج جنگل میں میری ملاقات ایک خود نما ظالم سے ہوئی۔ بایزید شپٹائے اور کہا کہ نیک

کی جدائی میں پٹائی سے محروم ہو چکی تھیں اور ان کی کمر دوہری ہو چکی تھی۔ انہوں نے فوراً آپ کو کلیجے سے لگایا۔ اس کے بعد بایزید کہیں نہیں گئے۔ ماں کی خدمت کرتے رہے۔ آپ فرماتے تھے کہ ماں کی خدمت اور رضا جوئی ہر کام پر فوقیت رکھتی ہے جو کچھ باہر جا کر مجاہدوں اور ریاضتوں میں تلاش کرتا رہا وہ ماں کی خدمت میں مل گیا۔ آپ نے والدہ کی بہت خدمت کی ایک رات کو آپ کی والدہ نے پانی مانگا گھر میں پانی موجود نہیں تھا۔ آپ دریا سے پانی لینے چلے گئے واپس آئے تو والدہ سو چکی تھیں۔ آپ اس خیال سے والدہ کے سرہانے رات بھر پانی پکڑے کھڑے رہے کہ مبادا والدہ جاگ جائیں اور پانی نہ لی سکیں۔ آپ کے ہاتھ سخت سردی کی وجہ سے ٹھنڈے ہو گئے لیکن آپ اس وقت تک کھڑے رہے جب تک آپ کی والدہ کی آنکھ نہ کھلی اور انہوں نے پانی نہ پی لیا۔ آپ کی والدہ نے ایک مرتبہ رات کو بایزید کو کہا کہ کمرے کا آدھا دروازہ کھول دو۔ آپ ساری رات دروازے کے پاس کھڑے رہے کہ کہیں آدھا دروازہ بند نہ ہو جائے اور والدہ کی حکم عدولی نہ ہو۔ آپ نے ماں کی خدمت کر کے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کے ایک مدت سے حلاشی تھے۔

آپ نے خدا سے ایک دعا کی جب تک ٹوکسی ایسے کامل بندے کو نہیں بھیجے گا جو مجھے میری حقیقت سے آگاہ کرے میں اس وقت تک جنگل میں پڑا رہوں گا۔ آپ تین دن اور تین راتیں اسی طرح لیٹے رہے، چوتھے روز ایک شخص اونٹ پر سوار ہو کر آیا۔ آپ نے اونٹ کو دیکھا تو اس کے پاؤں زمین میں دھنسنے لگے۔ اس پر سوار نے نہایت غصے کے عالم میں کہا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی کھلی آنکھ کو بند کر لوں اور بند آنکھ کو کھول لوں تاکہ بایزید سمیت پورا بسطام غرق ہو جائے۔ آپ حیران ہوئے اور اس شخص سے

تک پہنچے تو بایزید پانی لینے کی غرض سے جنگل کی طرف گئے ہوئے تھے۔ مرید نے بایزید کو آتے دیکھا نظریں چار ہوئیں اور وہ ہیبت سے اس قدر لرزہ برآمد ہوا کہ وہیں گر پڑا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ یوزاب بخشی نے بایزید سے کہا حضرت آپ نے تو ایک نظر میں اس کا کام تمام کر دیا۔ آپ نے فرمایا اس میں کشف کا ایک مقام خالی رہ گیا تھا جو اُس کو اس وقت حاصل ہوا لیکن یہ ہمداشت نہیں کر سکا۔

حضرت بایزید چالیس سال مسجد میں مقیم رہے۔ اس مدت میں انہوں نے مسجد کی دیوار کے سوا کسی چیز سے ٹک نہیں لگائی۔ چالیس سال عام انسانوں جیسی غذا کچھ کر بھی نہیں دیکھی۔ فرماتے تھے کہ میرا رزق اوپر سے آتا تھا اور میں صرف اپنے دل کی نگرانی کرتا رہا۔ اس کے بعد غور کیا تو معلوم ہوا کہ سمت بندگی اور خدائی نظر آئی۔ پھر میں نے کھل میں سال خدا کی جستجو میں گزار دیئے۔ پھر خدا کو طالب اور خود کو مطلب پایا، تیس سال سے میری یہ کیفیت رہی کہ جب بھی خدا کا نام لینا چاہتا تو زبان کو دھولیتا۔

بایزید پر وجد کی کیفیات طاری ہوتیں اور آپ لوگوں میں کھڑے ہو کر ایسی باتیں کرنا شروع کر دیتے جو عام فہم سے بالاتر ہوتی تھیں اور لوگ اُن کو شرک سے تعبیر کرتے اور کفر کے فتویٰ صادر کر دیتے۔

ایک مرتبہ آپ نے بسطام شہر میں ایک بہت بڑے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو تمام اسرار اور رموز اور اپنے نور سے سرفراز فرما کر تمام موجودات سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے خدا کے نور اور اپنے نور کا مشاہدہ کیا لیکن میرا نور تاریک تھا۔ میں کم تر ہوں، وہ مصفا اور مشفا ہے جبکہ میرے اندر کثافت ہے۔ میری عبادات اس کے حکم سے ہیں۔ حقیقی قائل خدا کی ذات ہے۔ وہ جب کسی کام کرنے کا حکم دے تب

خاتون ٹو نے مجھے خود نما عالم کیوں کہا۔ اس پر بدھیا نے کہا کہ جب شریعت نے شیر کو مکلف نہیں بنایا تو تم اپنا بوجھ ایک غیر مکلف کی پشت پر کیوں لا رہے ہو۔ یہ سراسر ظلم ہے تم ایسا کر کے لوگوں پر اپنی کرامت ظاہر کر رہے ہو اور اس کا نام خود نمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے بدھیا سے ایسی نصیحتیں اور عبرت حاصل کی اور ایسی باتیں ظاہر کرنے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔

آپ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ آپ کے پاس عورتوں کا جہوم ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ عورتیں نہیں ملا لگہ ہوتے ہیں جو میرے ساتھ عبادت کے خواہش مند ہیں۔ میں نے کہا مجھ میں اتنی طاقت کیا کہ میں آپ کے ساتھ ذکر سکوں میرے اعتذار کے باوجود وہ وقتاً فوقتاً میرے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور اپنی خواہش دہراتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آپ کے ذکر میں کب طاقت آئے گی۔ آپ نے جواب دیا روز جزا اور مزا کے دن جب یہ مرحلہ سر ہو جائے گا اور میں عرش کا طواف کرتا ہوا اللہ اللہ کے نعرے لگا رہا ہوں گا۔

حضرت یوزاب بخشی نے اپنے ایک مرید کو جو ریاضت کے اعتبار سے بہت زیادہ بلند مرتبہ پر تھا، بایزید کی صحبت اختیار کرنے کے لیے کہا اور فرمایا کہ جب تک تو بایزید سے فیض حاصل نہیں کرے گا تیری تکمیل ممکن نہیں۔ اس نے جواباً عرض کیا کہ میں جن مراحل کو سر کر کے خدا شناسی جانتا ہوں بایزید مجھے کیا بتا سکیں گے۔ حضرت یوزاب نے فرمایا جس پیمانے پر تُو نے خدا کو پہچانا ہے وہ نامکمل ہے۔ حقیقی دیدار بایزید کی توجہ سے ممکن ہے۔ کیونکہ روز قیامت خداوند کریم ایک تجلی ساری مخلوق پر ڈالے گا اور ایک تجلی صرف حضرت صدیق اکبر پر ڈالے گا۔ یہ سن کر وہ مرید یوزاب کے ساتھ ہو لیے جب بایزید کے حجرے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



سے محروم رہی۔ مجھ پر ہیبت اور فشی طاری ہوگئی۔ ہوش آنے پر میں نے در حضور کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ اس طرح مجھے خدا تک رسائی ہوئی۔ قاضی شہر آپ پر کوئی فتویٰ صادر نہ کر سکا۔ اس کی محفل و خرو بیکار ہوگئی۔ آپ کی ہاتھیں قاضی کی سمجھ سے بالاتھیں وہ آپ سے نظر ملانے کی ہمت خود میں نہیں پارہا تھا لیکن حاکم بالانے آپ پر حد لگانے کا جو حکم دیا تھا۔ وہ ماننا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے عرض کی کہ بایزید آپ بسطام چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ آپ کی ہاتھیں میرا دل سمجھ رہا ہے لیکن یہ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح یہ لوگ آپ کو بُرا کہنے سے بچ جائیں گے۔ آپ نے قاضی کی بات تسلیم کر لی اور فوراً شہر چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا اور فرمانے لگے، اے شہر تو کتنا اچھا ہے اور میں کتنا برا ہوں۔

اسی طرح بایزید وجد کے عالم میں بعض اوقات ایسے کلمات زبان سے ادا کر دیتے کہ سننے والا اُن کے ایمان پر شک کرنے لگ جاتا اور اُن کے مرتد اور کافر ہونے کا خیال کرنے لگ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو سات مرتبہ بسطام سے نکالا گیا پھر اُن کی خدا رسیدگی کی وجہ سے لوگ اُن کو واپس بسطام لے آتے۔ آپ کو اس بات کا شدت سے احساس ہوتا کہ میری عبادت میں کہیں غلط نہ پڑے۔ آپ اس وجہ سے اپنے گھر کے درو دیوار کے تمام سوراخ بند کر دیتے۔ عموماً اپنا سر زانو میں کیے رکھتے۔ ایک مرتبہ آپ نے تیس سال تک کسی سے بات نہیں کی۔ ایک دفعہ آپ کے منہ سے کھل گیا کہ میں پاک ہوں اور آپ اپنی شان کی بڑائی بیان کرنے لگے۔ جب وجد تمام ہوا تو آپ نے عقیدت مندوں سے کہا کہ اگر آئندہ میں اس قسم کے کلمات کہوں تو مجھ کو قتل کر دینا چنانچہ دوسری مرتبہ جب آپ نے اسی قسم کی باتیں کیں تو جمع آپ پر تلواریں لے کر ٹوٹ پڑا

تھی وہ کام ہو سکتا ہے۔ مجھے میری ہستی کے فنا نے بھلا عطا فرمائی۔ اس طرح مجھے ازلی علوم سکھائے گئے۔ میری آنکھوں کو نور عطا ہوا۔ مجھے سب کے ساتھ رکھ کر بھی سب سے جدا کر دیا گیا۔ مجھے وسائل کے بغیر تمام وسائل حاصل ہو گئے لیکن میں نے ان چیزوں سے قطع نظر ہو کر اپنے وجود کو اس کے وجود کے بغیر ناپسند جانا پھر مجھ کو شریعت اور اعتدال کی حدود سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا میری تمنا برآئی اور میری ذات نقص و عیب سے پاک ہوگئی۔ اس پر لوگوں نے کفر کے فتوے لگا دیئے۔ قاضی حسین عیسیٰ نے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ آپ نے اُس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے بزرگ تو قاضی نہیں ایک مدرسہ کا ناظم اعلیٰ بھی ہے لیکن تُو نے جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں الفاظ تھے علم نہیں تھا۔ اللہ نے مجھے علم دیا۔ میرے قلب کی تاریکی اور میرے نفس کی کثافت دور کر دی۔ اللہ نے میری حیات اور مجھے اپنے فضل و کرم میں ملبوس کر دیا۔ میں نے اللہ سے صرف اللہ کو طلب کیا۔ اس نے مجھ پر اپنی رحمت کی بارش نازل فرمائی اور صاحب کرامت بنا دیا۔ اس طرح میں نے حق دیکھ لیا اور پالیا۔ آپ کی طرف دیکھ کر قاضی عیسیٰ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو بایزید سے فرمایا کہ حسین بن عیسیٰ من میں نے تیس سال وحدانیت کے علوم حاصل کیے۔ تیس سال الوہیت کی فضا میں پرواز کی۔ اس طرح میں چار ہزار مراتب طے کرنے کے بعد اولیاء کے مقام تک پہنچا اور میں نے محسوس کیا کہ ولایت کی انتہاء نبوت کی ابتدا ہے اور نبوت کی کوئی انتہاء نہیں۔ اس کے بعد مجھ کو بہشت و جہنم اور ملائکہ سے مشاہدہ کروایا گیا۔ مجھے انبیاء سے نیاز حاصل ہوا۔ میری روح نبی کریم ﷺ کے اوپر پہنچی۔ چار سو نور کے حجابات تھے سو میری روح آنحضورؐ کے دیدار

رموز جانے کی کوشش کرتے ہو۔ وہ شخص بہت نام ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ شخص مجھ کو پہنچا۔

ایک بار ایک بزرگ ابو سعید شیخ آپ کا امتحان لینے کی غرض سے آئے۔ آپ نے فرمایا تم اپنے ایک ہم نام ابو سعید رامی کے پاس چلے جاؤ وہ میرا مرید ہے۔ تمہارے سوالوں کا جواب دے دے گا۔ شیخ ابو سعید اپنے ہم نام ابو سعید رامی کے پاس پہنچے۔ ابو سعید رامی نے پوچھا کیا کام ہے۔ آپ نے فرمایا انکسور درکار ہیں حالانکہ اس وقت انکسور موجود بھی نہ تھے اور نہ ہی انکسوروں کا موسم تھا۔ چنانچہ ابو سعید رامی نے چھڑی کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑا اپنے پاس رکھا اور دوسرا ابو سعید شیخ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ سے چھڑی کے ٹکڑوں کو زمین میں نصب کر دیا چند لمحوں کے بعد دونوں ٹکڑوں پر انکسور کی سبز بیللیں نمودار ہوئیں اور پھر دونوں پر انکسور لگ گئے۔ ایک سرخ انکسور تھے اور دوسرے پر کالے انکسور لگ گئے۔ شیخ ابو سعید نے اس کی وجہ پوچھی، آپ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے صدق و یقین کا درجہ حاصل ہے جب کے تم کو امتحان منظور تھا۔ اس لیے خدا نے ان انکسوروں کی رنگت میں قلبی صورتحال نمایاں کر دی۔ وہ بڑے نام ہوئے اور آئندہ اس قسم کی آزمائشوں سے تاب نہ ہو گئے۔

بایزید اپنی دعاؤں میں ہمیشہ خدا سے دُوری اور جدائی کے خاتمہ کا ذکر کرتے تھے آپ ہمیشہ بخشش اور استغفار کرتے رہتے تھے آپ کو خدا پر کامل بھروسہ تھا۔

۲۶۱ھ شعبان المعظم کی 15 تاریخ کو آپ کا وصال ہوا۔ آپ نے عمر بھر روزے رکھے۔ قرآن مجید کا لاتعداد مرتبہ مکمل مطالعہ کیا۔ راتوں میں نمازیں اور نوافل پڑھے۔ آپ کو سلطان العارفین کا درجہ حاصل ہوا۔

مگر جب لوگ نکواریں چلاتے تو یوں محسوس ہوتا کہ نکواریں پانی پر چل رہی ہیں اور چاروں طرف لاتعداد بایزید نظر آنے لگے۔ جب لوگ بے بس ہو گئے تو یہ صورت حال خود بخود ختم ہو گئی۔ لوگوں نے آپ سے اس بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ سب کرمہ خدا کی ہے۔ اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آپ نے عمر بھر سخت سے سخت مجاہدے کیے۔ ضبط نفس کی وہ مثالیں پیش کیں جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آپ نے زندگی بھر عبادت و ریاضت میں گزارے۔ لاتعداد مرید ہوئے۔ لیکن کسی سے کچھ طلب نہ کیا۔ جب لوگ آپ کی کرامات و عبادات سے متاثر ہونے لگتے تو آپ کوئی نہ کوئی ایسا کلمہ کہہ جاتے یا کوئی ایسا عمل سرزد کر دیتے جس سے لوگوں کا اعتقاد حیران ہو جاتا۔ آپ مطمئن ہو جاتے کہ لوگوں سے آپ کی جان کی خلاصی ہوئی۔

آپ نے کرامات دکھانے سے حتیٰ امکان گریز کیا لیکن بعض اوقات خود بخود کرامات ظاہر ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ بارش نہیں ہوتی تھی۔ چرند و پرند بھوک و پیاس کا شکار تھے۔ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے خدا سے عرض کیا کہ اے مولا! لوگ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں کہ میں کامل بندہ ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میں گنہگار ہوں۔ اسی لمحہ آسمان پر چار سو پانی برسنے لگا۔

ایک دفعہ ایک شخص بایزید کے خلاف تھا، آپ کے پاس آیا اور کہا مجھے خدا کے رموز سے آگاہ کیجئے۔ آپ نے فرمایا فلاں پہاڑ پر چلے جاؤ وہاں میرا ایک دوست ہے اس کو ملو وہ فوراً اس پہاڑ پر پہنچا۔ وہاں ایک کالا اڑدہا بیٹھا تھا وہ اس کی بیٹ سے بیہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا عجیب آدمی ہو۔ خلق کی رموز سے نادانف ہو اور خالق کی



آپے تقریر کرنا سیکھیں

ڈاکٹر سید نعیم احمد ادیب جعفری

.....بھئی ذرا ٹھہریں پہلے تقریر کرنا سیکھیں پھر ہوا میں مکے گھمائیے گا!



فن خطابت کے بنیادی رموز و نکات سے آگاہ کرتی ایک تحریر

بیان بھی ہے..... ایک اچھا مقرر بننے کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے؟ ایک اچھی تقریر کس طرح تیار کی جاتی ہے؟ اور فن تقریر کے بنیادی رموز کون کون سے ہیں؟ ان تمام سوالوں کا جواب آپ کو ذیل کے مختصر سے مضمون میں فراہم کرنے کی کوشش

فن خطابت یا تقریر گوئی دراصل قوت ارادی کے جادو کا واضح اور مدلل ثبوت ہے یہ فن اس قدر مشکل نہیں جتنا اسے سمجھا جاتا رہا ہے، ایک کامیاب مقرر کی کامیابی کا راز نہ صرف اچھی لکھی تقریر کا ترتیب دینا ہے بلکہ اس کا خوبصورت انداز زبان و

معلومات میں اضافہ کرنا اور علم کو بڑھانا ہے۔ لوگوں کی اکثریت تقریباً تقریر سننے کے لیے نہیں جاتی اور وقت گزاری بھی تقریر سننے کا سبب نہیں اگر آپ چاہیں تو گھر بیٹھے یا کتب خانوں میں جا کر ہزاروں کتابوں کے مطالعے سے اپنے علم لیاقت، قابلیت کو بڑھا سکتے ہیں۔ مگر وہ علم جو آپ کو طویل المدتی مطالعے کے بعد حاصل ہوگا یقیناً اس مقرر کی تقریر سے بہتر نہیں جو کم وقت میں آپ کو مطلوبہ معلومات فراہم کر دے۔

فن خطابت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا میں وہ مذاہب زیادہ تیزی سے پھیلے جن کے پاس اچھے مقررین کی تعداد کافی تھی۔ اسلام میں تقریر کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ مختلف مواقع پر حضور ﷺ نے خطبے دیئے اور اسلام کی دعوت کو پھیلا یا اسی طرح آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کے لیے بھی مختلف وفود مختلف علاقوں میں بھیجے جو وہاں جا کر اسلام کے احکامات کے متعلق تقاریر کرتے تھے، خطبہ حجۃ الوداع اس کی شاندار مثال ہے گویا اسلام بھی اپنے پیروکاروں کو ”فن تقریر“ سے قریب دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

ملکوں کی سیاسی اٹھانچ، تعلیم، فوجی فتوحات الغرض تمام تمام زندگی کے شعبوں میں تقریر کی اہمیت مقصد و مقام واضح نظر آتا ہے۔

فن خطابت اور منصوبہ بندی:-

فن تقریر گوئی میں منصوبہ بندی بے حد ضروری ہے چند بنیادی امور ہیں کہ جن کا اگر خیال نہ رکھا جائے تو آپ کی تقریر ہرگز کامیابی حاصل نہ کر سکے گی۔ تقریر کرتے وقت بالخصوص ان باتوں کا دھیان رکھنا چاہئے۔

☆ چیخ کر بولنے سے احتراز کریں۔

☆ الفاظ اور جملے آہستگی کے ساتھ ادا

خوف کا کمال

ایک صاحب موت سے بہت ڈرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے گھر میں اس لفظ کا استعمال بالکل بند کر دیا تھا۔ اگر محلے میں کوئی مر جاتا تو کہا جاتا کہ وہ پیدا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ ایک روز ان کے گھر مہمانوں کے ساتھ ہاتھیں ہو رہی تھیں کہ گھریلو ملازم روتا ہوا آیا۔۔۔۔۔ مالک نے رونے کی وجہ پوچھی تو ملازم کہنے لگا۔ ”میرے بچہ پیدا ہو گئے ہیں۔“ مہمان نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”اور تمہاری ماں؟“ نوکر نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ تو تین سال پہلے ہی پیدا ہو گئی تھیں۔“ مہمان نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پھر سوال کیا۔ ”پھر تم کب پیدا ہوئے تھے؟“ نوکر نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ ”صاحب! اگر یہی حالت رہی تو میں بھی کسی روز پیدا ہو جاؤں گا۔“

(فاروق رشید۔ لاہور)

کی گئی ہے۔

فن خطابت یا تقریر کوئی کسی تعریف:- کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات، احساسات کو مناسب و احسن انداز میں عوام الناس کو پیش کرنا ہی ”فن خطابت“ ہے۔ قوت قرطاس و قلم کا کوئی بھی منکر نہیں مگر ایک اور طاقت بہت عظیم قوت ہے اور وہ ہے ”زبان کے بولنے کی صلاحیت“ بلاشبہ یہ ایک ناقابل شکست شے ہے۔ خطابت دراصل سامعین کو اپنا ہم لو اپنا لینے کا فن ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ”دنیا پر جس فن کی حکمرانی ہے وہ فن خطابت ہے۔“

فن تقریر کا مقصد و اہمیت:-

تقریر سننے کا سب سے بڑا مقصد اپنی

شائع ہو گیا ہے

سیارہ ڈائجسٹ کے لازوال اسلامی نمبروں میں ایک اور اضافہ

قصص القرآن نمبر

قیمت: 175 روپے

ان تمام واقعات کا جدید علم و تحقیق کی روشنی میں تفصیلی ذکر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور اس کی امت کو بتانا ضروری سمجھے
انبیائے کرام کی مقدس اور پاکیزہ زندگیوں سے وابستہ واقعات
قصے ان قوموں کے جن پر انبیائے کرام کی نافرمانی، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی اور سرکشی کے باعث عذاب الہی نازل ہوا

عمدہ ترتیب، دلچسپ انداز بیاں اور پرکشش رنگین ٹائٹل
500 صفحات پر مشتمل یہ عظیم الشان نمبر جلد پیش کیا جائے گا

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاڑڈن لاہور۔ فون: 37245412

وسیع و جدید ذرائع ابلاغ آپ کے لیے ایک اچھی تقریر کی تیاری میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

”عصر حاضر کی مشہور کتاب“ دل کی دھڑکن پاکستان کے خالق ممتاز شاعر اور قائد اعظم کے تحریر کی ساتھیوں میں سے ایک سید یاور حسین کیف بناری اپنے ابتدائی دور طالب علمی میں تقریر کی تیاری کس طرح سے کرتے تھے اس کا ذکر وہ اپنی کتاب مذکورہ بالا میں کچھ یوں کرتے نظر آتے ہیں ”صبح ہوتے ہی میں اپنے شہر بنارس کے نزدیک واقع ایک شفاف تالاب پر چلا جایا کرتا اور تالاب کی لہروں کو سامعین تصور کر کے وہاں دھواں دھارا انداز میں تقریر کرنے لگتا۔ روز کے اس عمل اور مشق کا نتیجہ یہ نکلا مجھے فن زبان و بیاں (فن تقریر) پر قدرت حاصل ہو گئی اور ایک دن وہ بھی آیا کہ میں نے کل بنارس تقریری مقابلے میں اول انعام حاصل کیا۔ یہ سب خدا کی دین اور میری متواتر مشق کا نتیجہ تھا۔“

چند مشہور مقررین و خطیب:-

بانی پاکستان حضرت قائد اعظم محمد علی جناح تو ایک عمدہ مقرر تھے ہی آپ کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، خان لیاقت علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، بی امان، قاضی جتو، حضرت شاہ ولی اللہ، جسٹس سید امیر علی، سر سید احمد خان، سر سید جتو، نائیڈو اندرا گاندھی، کیف بناری، مولانا احمد رضا خان بریلوی، مفتی شفیع اودکاڑوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ڈورائی جارج، واشنگٹن، ابراہام لنکن، علامہ عرقان حیدر، عابدی، رشید ترابی، راجہ صاحب محمود آبادی وغیرہ کا شمار اعلیٰ پائے کے مقرروں میں کیا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مختصر سے مضمون کے مطالعے کے بعد آپ اپنی تقریر میں جدت کے ساتھ ساتھ مزید نکھار و اثر پیدا کر سکیں گے۔

کریں، تیز تیز نہ بولیں ☆ کوشش کیجئے کہ ہر لفظ ہر جملہ طبعہ ادا ہو۔

☆ ذو معنی اور بے معنی باتوں سے اجتناب رہیں۔
☆ دوران تقریر لمبے لمبے واقعات اور قصے کہانیوں سے گریز کریں ☆ تقریر میں وقفہ کی اہمیت بہت ہے۔ ماہر و باشعور مقررین عموماً کوئی خاص بات کہنے سے پہلے یا بعد میں تھوڑا سا وقفہ دے دیتے ہیں۔ اس طرح سے نہ صرف وہ سامعین کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب رہتے ہیں بلکہ ان کی تقاریر بھی با اثر ہو جاتی ہیں۔

☆ تقریر کرنے کے لیے اپنا ایک الگ انداز اختیار کیجئے اپنی تقریر میں جدت و نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کیجئے یہ نیا پن آپ کو ممتاز مقررین کی صف میں لاکڑا کر دیگا۔

فن تقریر اور مزاح:-

بعض مقررین اپنی تقاریر میں گفتنی اور مزاح کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، ایسے لوگ لاکھ اپنی تقریر میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کریں مگر انہیں بغیر مزاح کے بذات خود اپنی تقریر غیر جانبداری محسوس ہوگی۔

انگلستان کے ایک سابق وزیر اعظم اور عالمی شہرت یافتہ مقرر ”ڈورائی“ نے ایک بار کہا تھا ”اگر تقریر میں مزاح اور کرافت نہ ہو تو ایسی تقریر مقرر کے مستقبل اور مقاصد کو دھندلا کر کے رکھ دیتی ہے۔“ کوئی پر مزاح جملہ گفتہ چٹکے یا کوئی مسکراتا سا واقعہ اپنی تقریر میں ضرور شامل کیجئے۔

تقریر کیسے تیار کی جائے؟

اب آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک اچھی اور موثر تقریر کیسے تیار کی جائے؟ سب سے پہلے تو جس موضوع پر تقریر کرنا ہو اس موضوع سے متعلقہ کتب اور رسائل و جرائد جمع کیجئے اچھی کتابیں، کتب

ابرار مجیب

ساگون دیتا کا مندر

اس کے ایک ہاتھ میں رنگ آلود گوار جیسی کوئی شے تھی اور دوسرے ہاتھ میں.....
دوسرے ہاتھ میں، آف یہ تو اشوک مجدار کا کٹا ہوا سر تھا۔ مجدار کا دھڑ وہیں اس
کے قدموں تلے پڑا ہوا تھا اور کئی ہوئی گردن سے خون نکل کر چاروں طرف پھیل رہا
تھا۔ کیرتی کے حلق سے مسلسل تھیمے اور چیخنے کی غیر انسانی آوازیں نکل رہی تھیں۔

آثار قدیمہ کی تحقیقاتی ٹیم کے ساتھ پیش آئے حیرت انگیز اور پراسرار واقعات

پر تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں ایمر جنسی کی
صورت میں کسی فوری مدد کے امکان کو خارج کر دینا
چاہیے تھا۔ آرکیالوجی سروے آف انڈیا کے زیر
اجتہام ہمیں اس علاقے کا تفصیلی جائزہ لینا تھا، کھدائی

جب ہم اُس علاقے میں پہنچے تو اندازہ ہوا کہ یہ
علاقہ شہری علاقے سے کم از کم سو، سوا سو کیلو میٹر دور
ہے اور اس پاس کوئی انسانی آبادی بھی نہیں ہے۔
چند ایک قبائلی گاؤں یہاں سے تین کلومیٹر کے فاصلے



بھی حاصل کی گئی تھیں جو انہی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ انہی قبیلہ اس علاقے کا قدیم ترین قبیلہ مانا جاتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ بڑو انہی بعض قدیم تصویری تحریروں کو پڑھ لیتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ انجینئر، فیکٹیشن، حیراک اور سیکورٹی کے لوگ بھی تھے۔ ہم لوگ یہاں ابتدائی جائزے کے لئے آئے تھے جس میں تجسس کا جذبہ بھی کارفرما تھا، فی الحال تمام لوگ شہر کے ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ یہاں مستقل قیام کے لئے دوسرے دن سے انتظام کیا جاتا تھا اور اس کے لئے ایک کنٹریکٹر سے معاہدہ کر لیا گیا تھا۔

ابھی سورج غروب ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ سرسری طور پر دیکھیں تو یہ علاقہ چھدرے جنگل اور بھوری پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا، جو نہ جانے کہاں ختم ہوتا تھا۔ ایک طرف کرم ناساندی بہہ رہی تھی جس پر ہمارے قریب ہی ایک ہل اپنی ادھوری حالت میں موجود تھا۔ یہ ہل اس لئے بنایا جا رہا تھا کہ شہر کے کارخانوں میں تیار شدہ مال کو بندرگاہ تک بھیجا جاسکے، اس سے پہلے مال بیچنے کے لئے تقریباً "چار سو کلومیٹر دور ایک دوسرے شہر کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ کافی دنوں سے ہل بنانے کا کام روک دیا گیا تھا، اس کی وجہ پوری طرح معلوم نہیں ہو سکی، جتنے منہ اتنی باتیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ٹھیکیدار اور مزدوروں کے درمیان "مختلانے" کو لے کر اتفاق رائے نہیں ہے۔ بڑو انہی جو ہمارا گاڑا تھا اس کا کہنا کچھ اور ہی تھا۔ اس کے مطابق ہل کے دوسرے کنارے پر دیوتا ساگون کا مندر ملا تھا جس کی وجہ سے قبائلی مزدوروں نے کھدائی کر کے وہاں ستون گاڑنے سے انکار کر دیا، جب سے معاملہ ڈکا ہوا ہے۔ ہم نے دوسرے کنارے کی طرف دیکھا لیکن مندر کے آثار نظر نہیں آئے۔

مندر شاید اس بڑے گڑھے کے اندر ہو جو دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ بہر حال اس ہل کے علاوہ یہاں

کرنی تھی اور ایک رپورٹ تیار کرنی تھی، ابتدائی جائزے کی رپورٹ ایک کمپنی پیش کر چکی تھی اور اس کے مطابق اس علاقے میں پانچ ہزار سال پرانی کسی تہذیب کے آثار موجود تھے۔ یہ نتیجہ یہاں سے ملنے والی بعض چیزوں کی کاربن ڈیٹنگ رپورٹ سے نکالا گیا تھا، ان چیزوں میں ایک دیوتا نما شخص کی مورتی بھی تھی جس کے سر پر سیٹک تھے اور اس کے اطراف جنگلی جانور کھڑے تھے۔ ایک سیاہ رنگ سے رنگا ہوا برہنہ عورت کا مجسمہ تھا جو شاید اس عہد کی کوئی دیوی رہی ہو۔ کچھ انسانی کھوپڑیاں، دانت اور شکستہ ڈھانچے بھی پائے گئے تھے۔ یہ چیزیں اس وقت برآمد ہوئی تھیں جب یہاں کرم ناساندی پر ایک ہل بنانے کے لئے کھدائی کا کام چل رہا تھا۔ ایک جگہ تو انسانی ڈھانچوں کا ڈھیر برآمد ہوا تھا، جیسے بہت سارے لوگوں کو ایک ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا ہو۔ چوں کہ ان ڈھانچوں کا ابھی تجزیہ نہیں کیا گیا تھا اس لئے یہ کہنا مشکل تھا کہ اتنے سارے لوگوں کو کسی گروہ نے قتل کر کے ایک ساتھ گڑھے میں دبا دیا تھا یا یہ لوگ کسی دہائی مرض کا شکار ہوئے تھے اور لوگوں نے انہیں ایک ساتھ مٹی کے اندر دفن کر دیا تھا۔ بہر حال اس علاقے کا تفصیل سے جائزہ لینے کے لئے یہاں کھدائی کا پروگرام بنایا گیا تھا اور ہم لوگوں کی ایک ٹیم تشکیل دی گئی تھی۔

میں کچھس مزدوروں کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں جو پاس کے قبائلی گاؤں کے باشندے تھے۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی ٹیم میں میرے علاوہ ماہر آثار قدیمہ ڈی ڈی پانٹک، مس کرتی سبراہیم اور اشوک مجمدار تھے۔ کھدائی کے ماہرین میں رحمت کریم پاشا، انوبھو سنہا تھے۔ علم کیمیا کے ماہر تندر کشور سہائے اور ان کی اسسٹنٹ جیولی راجپوت تھیں۔ اس علاقے کے جے جے سے واقف عمر دناز بڑو انہی کی خدمات

تھے۔ وہ دیکھتے وہاں زمین مسطح بھی ہے اور کام کرنے میں آسانی بھی ہوگی۔“ میں نے مشورہ دیا۔
 انو بھوسنہا کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ رحمت پاشا بول پڑے۔ ”مشرورہ تو آپ کا دست ہے لیکن ڈھلوان علاقے میں اگر کھدائی شروع کی جائے تو ہمیں مٹی تہوں میں موجود قدیم آثار تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔“
 ”اس بات پر ہونٹ میں بحث کر لیں گے۔“ انو بھو سنہا نے کہا۔

افق پر شام کی لالی نمودار ہو رہی تھی اور سورج چھدرے جنگل کی پشت پر غروب ہو چکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بیڑوں میں آگ لگ گئی ہے اور بھوری پہاڑیاں شعلے اُگل رہی ہیں۔ کرم ناسا ندی کا پانی بھی سرخ ہو چکا تھا۔ ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی طرف چل دیے۔ راستے میں قبیلائی گاؤں کے بعض گھروں سے دھواں اٹھتا نظر آیا، شاید چولہے جلانے جارہے تھے۔ گاؤں کے یہ گھر مٹی سے بنائے گئے تھے اور دیواروں کو سرخ اور سفید رنگوں سے لپکا گیا تھا۔ ان دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں بنائی گئی تھیں، جانور اور انسانی جسم کو ایک ساتھ ملا دیا گیا تھا، اسی طرح پرندے اور چوپائے ایک وجود کی صورت موجود تھے۔ بعض حشرات الارض کی بھی تصویریں تھیں۔ ایک دلچسپ تصویر شیر کا سر اور ایک پرندے کے جسم کو ملا کر بنائی گئی تھی۔ گوکہ قبیلائی گاؤں کے سارے گھر مٹی کے بنے نظر آ رہے تھے لیکن گاؤں کے درمیان مندر کی اینٹوں سے تیار کئے گئے تھے۔

ہونٹ چنبچے چنبچے رات ہو گئی۔ ہم سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ کمرے میں پہنچ کر میں ابھی کپڑے تبدیل کر رہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ریسپور اٹھایا تو دوسری طرف کوئی آواز نہیں آئی، ڈیڈ ٹون بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر تک میں ہاتھ میں ریسپور لئے بیٹھ رہا، پھر جھنجھلا کر اسے کریڈل پر ڈال

ایسی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی جسے انسانی کادشوں کا نتیجہ کہا جاسکے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑا عجب لگا کہ ہمارے قدموں کے نیچے جو مٹی تھی وہ سرخی مائل تھی۔
 نند کشور سہائے جو علم کیمیا کے ماہر تھے ان کا خیال تھا کہ اس مٹی میں آئرن آکسائیڈ کی آمیزش ہو سکتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں زمین کے اندر کچا لوہا موجود ہو سکتا ہے۔

ہم لوگ اس بات پر ہنسنے لگے کہ شہر سے اتنی دور اس ویرانے میں ناگہانی افتاد کی صورت فوری مدد کا امکان بالکل نہیں ہے۔ ویسے کھانے پینے کا سامان، فریج اور دوسرے لوازمات کا انتظام کیا جا چکا تھا۔ ہیوی جزیئر بھی لایا جا رہا تھا تاکہ اس سے بجلی پیدا کی جاسکے اور اس کے لئے ڈیزل کا بھی مناسب ذخیرہ مہیا کیا جا رہا تھا۔

”یہ پورا علاقہ عجیب و غریب خاموشی سے گہرا محسوس ہوتا ہے۔“ جیونی راجپوت دھیرے سے بولی جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔

”ہاں بڑی عجیب بات ہے، جنگل ہونے کے باوجود جانور اور پرندوں کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ارے ایسی بات نہیں ہے، ہم لوگ جنگل سے دوری پر ہیں، بجلی پھٹکی آوازیں تو آ رہی ہیں۔“ ڈی ڈی پانٹھک ہنستے ہوئے بولے۔

”کل شام تک چھو لداریاں تیار ہو جائیں گی اور سارا سامان بھی آجائے گا، مزدوروں کا ٹھیکیدار بھی کل شام ہی کو مزدور لے کر آنے والا ہے۔“ ایک انجینئر جو پروگرام کو آرڈینیٹر تھا ہمیں اطلاع دیتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھتا ہوں ہمیں اس حصے سے کھدائی کا کام شروع کرنا چاہیے جہاں سینک والے دیوتا کی مورتی برآمد ہوئی تھی اور اس کے قریب ہی ایک بڑے گڑھے میں بہت سارے لوگوں کے ڈھانچے ملے

کمرے میں واپس آکر غسل خانہ میں چلا گیا، نہا کر واپس آیا اور کافی کا آڈر دے کر بستر پر لیٹ گیا۔ رات سکون سے گزری ایک بار بھی فون کی گھنٹی نہیں بجی۔ میں نے سوچا شاید لائنز میں کوئی خرابی واقع ہوئی ہوگی جسے ہونٹ والوں نے ٹھیک کر لیا ہوگا۔

صبح ہم لوگ لابی میں یکجا ہوئے اور اس علاقے کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ شام چار بجے تک ہمیں پہنچنا تھا۔ اس وقت تک تمام تیاریاں مکمل ہو جانے کا امکان تھا۔ اس سے پہلے راستے میں بڑو مانجھی کو اس کے گاؤں سے لینے کی ذمہ داری میری تھی۔ رات کے فون والے واقعے پر سب حیران تھے بلکہ انوبھو نے استقبالیہ خاتون سے جا کر پوچھا بھی، اس نے بتایا کہ لائنیں چیک کی گئی تھیں، کہیں کچھ نہیں ملا بس ایک جگہ ایک وائر کا انسولین کٹا ہوا تھا جسے بدل دیا گیا ہے، شاید اسی کی وجہ سے ایسا ہوا ہو، بہر حال کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا۔

جب ہم لوگ بڑو مانجھی کے گاؤں پہنچے تو ایک عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑو مانجھی کے گھر کے سامنے گاؤں والوں کی ایک بھیڑ جمع تھی۔ قریب پہنچ کر جو منظر نظر آیا اسے دیکھ کر حلی سی ہونے لگی۔ بڑو مانجھی ایک چار پائی پر بیٹھا، دونوں ہاتھ سے سر پکڑے ہو رہا تھا اور سامنے ہی زمین پر ایک بکری پڑی ہوئی تھی جس کی آنتیں باہر تھیں اور جس کا زرخرہ اوڑھا ہوا تھا۔ کسی قبائلی کے لئے اس کی بکری کی کتنی اہمیت ہے یہ میں سمجھ سکتا تھا۔ بڑو مانجھی کو ہم لوگوں نے دلا سہ دیا اور پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ اس نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے جب وہ فطرنی ضرورت کے تحت میدان جا رہا تھا تو ہنسواڑی (بالس کے بیڑوں کا جھرمٹ) میں اسے اپنی بکری اس حالت میں ملی۔ ہم لوگوں نے کہا کہ شاید کسی جنگلی جانور نے بکری کا یہ حشر کیا ہو لیکن بڑو مانجھی بڑے یقین سے بولا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہی

دیا۔ میں نہا کر فریش ہونا چاہتا تھا۔ ابھی میں ہاتھ روم کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ دوبارہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اس بار غصے میں لپک کر فون اٹھایا اور زور سو بولا۔ ”ہیلو۔“

”میں ہوں کیرتی سبرائیم، کیا ہوا اتنی زور سے کیوں چلا رہے ہیں؟“

”نہیں، کوئی بات نہیں۔ اچھا بولو کوئی خاص بات؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے رنگ کیا تھا مجھے؟“ کرتی نے پوچھا۔

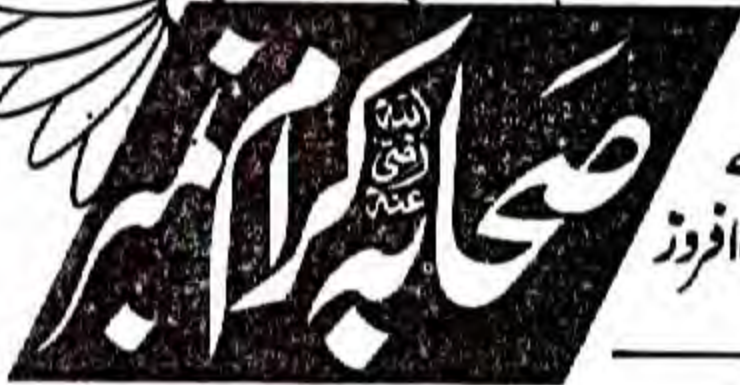
”نہیں تو، بلکہ ابھی ابھی کسی نے مجھے رنگ کیا تھا، جب ریسیور اٹھایا تو کسی نے جواب نہیں دیا، یہی وجہ تھی کہ میں جھنجھلایا ہوا تھا۔“

”ارے یہی بات میرے ساتھ بھی ہوئی ہے، اور جب میں نے استقبالیہ سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کال آپ کے کمرے سے آئی تھی۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے فون کیا ہی نہیں ہے تمہیں۔“ میں حیرت سے بولا۔

”پتہ نہیں کیا چکر ہے۔“ کیرتی سبرائیم حیرت سے بولی اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے جیسے ہی ریسیور رکھا پھر فون کی گھنٹی بجی، اس بار رحمت پاشا تھا اور وہ بھی یہی پوچھ رہا تھا کہ میں نے اسے فون کیوں کیا تھا۔ اب تو ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں فون رکھتا اور کسی اور ساتھی کی کال آ جاتی، سب یہی پوچھ رہے تھے کہ میں نے انہیں کال کیا تھا۔ میرا تو دماغ ہی ماؤف ہو گیا۔ نہانے کی بجائے میں سیدھا استقبالیہ پر گیا اور ساما ماجرایان کر کے پوچھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ استقبالیہ پر موجود خاتون بھی حیران تھی۔ اس نے کہا کہ ذرا ٹھہریں شاید فون لائنز میں کوئی مسئلہ ہو، ویسے یہ قح ہے کہ تمام لوگوں کے کمرے میں آپ ہی کے نمبر سے فون کیا گیا ہے اور یہ کمپیوٹر میں صحت بھی ہے میں



سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور
ایمان افروز فخریہ پیشکش

قیمت 185 روپے

۴۰ درخشندہ ستاروں کے
روح پرور اور بصیرت افروز
تذکروں پر مشتمل

- جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جلوۂ یار کا بے نقاب مشاہدہ کر کے شرف صحابیت پایا
- جنہوں نے منہج رشد و ہدایت ﷺ سے براہ راست کسب فیض کیا۔
- جنہوں نے صاحب قرآن ﷺ سے قرآن کے رموز و اسرار سمجھے۔
- جنہوں نے اپنے خون جگر سے چینستان اسلام کی آبیاری کی۔
- جنہوں نے اپنے ارفع سیرت و کردار سے چہرۂ انسانیت کی سیاہیاں دموڈالیں۔
- جنہوں نے انتھک مخلصانہ جدوجہد سے جنت نظیر معاشرہ کی صورت گری کی۔
- جنہوں نے فیصلہ کن اور غیر مصالمانہ ٹکڑے کر باطل کو تہہ و بالا کر دیا۔

۵۰۰ صفحات پر مشتمل سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب سرورق

شائع ہو گیا ہے

دیوی کا بھیٹ چڑھ گیا۔
 میں اپنی ہنسی کو روک نہیں سکا۔ ”اچھا دیکھو تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، ہمیں ابھی چلنا ہے وہاں پر۔ آج ہی سے کام شروع ہوگا۔“ میں نے بڑو مانجھی سے کہا۔ اسے یہ بھی دلا سہ دیا کہ اسے تین چار بکریاں خرید کر دے دی جائیں گی وہ مگر نہ کرے۔ بڑو مانجھی نے پاس کھڑے ایک نوجوان قبائلی سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلایا۔ شاید اس نے اسے تاکید کی تھی کہ بکری کو گڑھے میں گاڑ دے۔ بڑو مانجھی کچھ دیر تک انگلیوں پر کچھ گنتا رہا پھر بڑوایا۔ ”اماوسیہ۔ کالا رات۔“ ایک بار پھر وہ جھونپڑی کے اندر گیا اور جب باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں چوکور چڑے والے بہت سے تعویذ تھے۔ خود اس کے گلے میں ایک تعویذ پہلے سے موجود تھا۔ وہ ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور ہم تیزی کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنے لگے۔

شام کے لگ بھگ پانچ بج چکے تھے جب ہم اس علاقے میں پہنچے جہاں قدیم تہذیب کی بازیافت کے لئے کھدائی کا کام کرتا تھا۔ بہت سارے ٹینٹ لگائے جا چکے تھے۔ جزیئر بھی آچکا تھا۔ ٹھیکیدار نے بتایا پروگرام کے مطابق مزدور کل صبح حاضر ہو جائیں گے۔ رات میں ہمیں یہ طے کرنا تھا کہ کھدائی کا کام کہاں سے شروع کیا جائے، وہاں سے جہاں ایک اجتماعی قبر ملی تھی یا اس ڈھلوان جگہ سے، جہاں پرانی تہوں سے تہذیب کے قدیم آثار برآمد ہونے کا امکان تھا۔ یہ فیصلہ ان نقشوں کو پڑھ کر ہی کیا جاسکتا تھا جو ہم ساتھ لائے تھے اور جسے پہلی فیم نے تیار کیا تھا۔ کبھی لوگوں کو ٹینٹ دئے دیا گیا تھا جس میں بنیادی ضرورت کا سامان بھی موجود تھا۔ ایک ٹینٹ میں کیمیکل لیپ بھی تیار کیا گیا تھا تاکہ چیزوں کا تجزیہ کر کے ان کی قدامت اور فطرت کے متعلق

گاؤں کے اطراف کبھی جنگلی درندے دیکھے گئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جنگل یہاں سے تین کلومیٹر دور ہے اور اس جنگل میں بھی کسی درندے کی موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں سنا گیا ہے۔ بڑو مانجھی کی باتیں سن کر ہمیں حیرت بھی ہوئی اور ایک قسم کا خوف بھی محسوس ہوا۔ اسی درمیان ایک قفلظہ بلند ہوا اور ایک وحشت زدہ قبائلی بھیڑ کو چیرتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر میں لگ بھگ ڈر گیا۔ اس کی آنکھیں ٹھہری ہوئی تھیں اور وہ بالکل ہلکی نہیں جھپکا رہا تھا۔ آنکھوں کی سفیدی اتنی زیادہ سفید تھی کہ اس کی پتلیاں بھی سفیدی مائل نظر آ رہی تھیں۔ وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا اور عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہوئے شہر کی طرف جانے والی سڑک کی طرف مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”ہن جا، ہن جا، مارو دیو، ہن جا، ہن جا۔“

وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا۔

خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ حالانکہ میں پوری طرح سے سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ دوسرے ساتھی بھی سرا سہہ نظر آ رہے تھے۔ دفعتاً بڑو مانجھی تیزی سے اٹھا، اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنی جھونپڑی کے اندر لے گیا، وہاں کسی کونے سے اس نے ایک چوکور چڑے کی تعویذ نمائشے نکالی اور اسے میرے گلے میں ڈال دیا، ایسے ہی بہت ساری تعویذ لے کر وہ باہر آیا اور ایک ایک کر کے تمام ساتھیوں کو پہنانے لگا۔ سفید آنکھوں والا وحشت زدہ شخص یہ دیکھ کر کاہنے لگا اور ایک چیخ مار کر ناک کی سیدھ میں دوڑتا چلا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے بڑو مانجھی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس پر ماما دیوی آیا ہوا ہے صاحب اور ماما دیوی ابھی بہت غصے میں ہے۔ ہمارا بکری بھی ماما

”کیا پڑھ رہے ہو۔“ جیوتی نے پوچھا۔

”ماتا دیوی کا منتر ہے میم صاب۔“

”اچھا، اس سے کیا ہوگا؟“ تندر کشور نے ہنس کر پوچھا۔

”ماتا دیوی سب کی رکشا کرے گا۔“

”کس سے رکشا کرے گا؟“ مس کیرتی سبراشیم نے پوچھا۔

”جنار سے، سینگ والا دیوتا سے۔ یہ سینگ والا دیوتا ہر سے ایک بی مانگتا ہے۔“ بڑو مانجھی خوف زدہ جھرجھری لے کر بولا۔

تمام لوگ ہنسنے لگے لیکن نجانے کیوں میری نظر کے سامنے اچانک اس وحشت زدہ آدمی کی تصویر ابھر آئی جو بڑو مانجھی کے گاؤں میں اپنی سفید آنکھوں سے ہم سب کو گھور رہا تھا۔ بڑو مانجھی کے جانے کے بعد ہم لوگ ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اس نتیجہ پر پہنچنے کے ڈھلوان حصے سے کھدائی کا کام شروع کیا جائے، رحمت پاشا اور انو بھوسنہا اس سلسلے میں اپنے تجربات کام میں لائیں گے تاکہ چیزیں بحفاظت کسی ٹوٹ پھوٹ کے بغیر نکالی جاسکیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے نیموں میں چلے گئے۔

یہ نہیں وہ رات کا کون سا پہرہ تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ابھی میں اس بات پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک عجیب و غریب آواز سنائی دی، یہ کوئی انسانی آواز ہرگز نہیں تھی اور نہ ہی کسی جانور کی آواز۔ تو پھر یہ کس کی آواز تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی کھر دری سطح پر کچھ گھسا جا رہا ہو۔ اچانک آواز ختم گئی۔ میں نے غصے کے اندر چاروں طرف نظر دوڑائی، نیم تاریکی تھی لیکن چیزیں نظر آرہی تھیں۔

سامنے میز پر نقشے پڑے تھے، دوسری چیزیں بھی

معلوم کیا جاسکے۔ ایک اسٹورج بھی بنایا گیا تھا جہاں چیزوں کو محفوظ کیا جاسکے۔ بڑو مانجھی کو بھی ایک ٹیلیفون کے ساتھ چھو لداری دی گئی تھی۔ تمام لوگ اپنی چھو لداریوں کا معائنہ کر کے مطمئن تھے۔ ایک طرف رات کے کھانے کا انتظام ہو رہا تھا اور دوسری طرف ایک میز کے گرد ہم تمام لوگ بیٹھے نقشے دیکھ رہے تھے اور کل کے لائحہ عمل پر گفتگو کر رہے تھے۔

”اجتماعی قبر کی بیشتر کھدائی ہو چکی ہے اور وہاں سے کچھ اور برآمد ہونے کا امکان نہیں ہے، میں رحمت پاشا کی اس بات سے متفق ہوں کہ اس جگہ ذرا ڈھلوان حصے سے کھدائی کا کام شروع کیا جائے، یہی وہ جگہ ہے جہاں سے سینگوں والے دیوتا کی مورتی برآمد ہوئی تھی۔“ انو بھوسنہا نے نقشے پر ایک جگہ ہاتھ رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”جی لیکن اس کے لئے اسکاٹی فولڈنگ کی ضرورت ہوگی، خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں لیکن اس میں وقت لگ جائے گا۔“ انجیترنگ کو آرڈی نیٹر نے کہا۔

”یار میں نہ جانے کتنے علاقوں میں گیا ہوں، مہینوں رہا ہوں لیکن یہ علاقہ پہنچ نہیں کیوں کچھ عجیب اور پراسرار لگ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے ہمارے بنگال کے کالے جادو کا اثر ہے یہاں پر۔“ اشوک مجمدار بظاہر ہنستے ہوئے بولا لیکن اس کا چہرہ اس کی ہنسی کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

”تم بنگالی لوگ یہ جادو دادو کے چکر میں بہت ہوتا ہے۔“ ڈی ڈی پانٹھک نے قہقہہ لگایا۔ ”ارے یار کام کی بات کرو۔“

تھوڑی دُوری پر میں نے دیکھا بڑو مانجھی آسمان کی طرف منہ اٹھائے کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ مجھے لگا وہ کوئی قبائلی منتر کا جاپ کر رہا ہوگا۔ میں نے اشارے سے دوسرے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ جیوتی راجپوت سنجیدہ ہو گئی اور اس نے بڑو مانجھی کو آواز دے کر بلایا۔



میں اس کی باتوں کو نظر انداز کر کے غصے میں چلا آیا اور سوچنے لگا جو کچھ ابھی ابھی میں نے دیکھا ہے وہ حقیقت ہے کہ میری نظروں کا دھوکا۔ شاید نظروں کا دھوکا ہی ہو کیونکہ ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور ہوسکتا ہے بیڑوں کے پلٹے ہوئے سايوں نے گھوڑ سواروں کی بینت اختیار کر لی ہو۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو دن چڑھ چکا تھا، یہاں دھوپ میں تمازت نہیں تھی۔ حرور کام میں لگے ہوئے تھے۔ ڈھلوان حصے پر اسکاٹی فولڈنگ باندھا جا چکا تھا اور رحمت پاشا ایک پلیٹ فارم پر کھڑا حروروں کو ہدایت دے رہا تھا۔ ایک بڑے حصے کی کھدائی جاری تھی۔ ٹھلٹھا ہوا میں لیب والے غصے میں داخل ہو گیا، یہاں نند کشور مستعدی سے کام میں لگا ہوا تھا اور جیوتی راجپوت کو ہدایت بھی دے رہا تھا۔ میز پر یہاں کی سرخ مٹی رکھی ہوئی تھی اور ایک بیکر میں نند کشور سہائے کچھ کیمیکل ڈال کر اسے چمک کر رہا تھا۔

”کیا مٹی کا کیمیائی تجزیہ کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں دیکھ رہا ہوں کہ اس میں آئرن آکسائیڈ ہے یا کوئی اور چیز۔“

”اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟“ میں نے پوچھی پوچھ لیا۔

”جیوتی، ذرا وہ بوتل دینا۔“ سہائے نے ایک بوتل کی طرف اشارہ کیا، پھر بولا۔ ”پتہ نہیں، یہ تو تجزیہ کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔“ جیوتی نے بوتل لے کر اس نے بیکر میں چند بوتلیں ڈالیں اور پھر اسے اچھی طرح ہلانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیکر میں موجود مٹی کا رنگ، سرخ سے گہرا سیاہ ہو گیا۔ سہائے کو میں نے چمکتے ہوئے دیکھا۔

”کیا بات ہے؟ تم اچانک چمکتے کیوں؟“ سہائے کے چہرے پر پریشانی تھی۔ ”یار بڑی عجیب

اپنی جگہ تھیں۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے کسی چیز کے گھسنے کا اندازہ قائم کیا جاسکتا۔ میں بستر پر ساکت لیٹا رہا۔ ہر طرف سناٹا طاری ہو چکا تھا، گھسنے کی آواز جو ایک بار بند ہوئی وہ اب تک بند تھی۔ مجھے صرف اپنی سانسیں یا جھینگروں کی پراسرار آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔ دلچسپا ایسا محسوس ہوا جیسے دور ایک ساتھ بہت سارے گھوڑوں کی ٹاپیں ابھر رہی ہوں۔

ہاتھ میں ٹارچ لے کر میں باہر نکل آیا۔ سامنے دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا، پھر میری نظر اس طرف اٹھ گئی جہاں اجتماعی قبریں تھیں، اس سے کافی فاصلے پر تیز رفتار گھوڑوں پر سوار پرچھائیاں تیزی سے بڑھتی نظر آرہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کیونکہ وہ سارے سوار گھوڑوں سمیت اجتماعی قبر پر پہنچ کر قانع ہو گئے۔ میں جیسے ہی پلٹا چیخ پڑا سامنے کوئی کھڑا تھا۔

”ہاؤ، بڑو ماٹھی۔“

جب میں نے غور سے دیکھا تو وہ کوئی اور نہیں بڑو مانجھی تھا۔ میری جان میں جان آئی۔ ”تم اتنی رات کو یہاں کیا کر رہے ہو۔“ میرے لہجے میں سختی تھی۔

”صاب، سینک والا دیوتا آئے گا۔“

”کب؟“

”بہت جلدی۔“ بڑو مانجھی اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے بولا۔ میں نے غور کیا تو دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ کھردرا پتھر ہے اور ایک چمڑے کا بڑا سا کھڑا جو شاید وہ اپنے سامان کے ساتھ لایا تھا۔ شاید وہ گھسنے کی آواز جو میں نے سنی تھی وہ بڑو مانجھی کی حرکت کا نتیجہ تھی۔

”تم یہ پتھر کیوں گھس رہے ہو؟“

”صاب، اس سینک والے دیوتا سے بچنے کے لئے۔“

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور فخریہ کاوش

ازوالِ اسلامی واقعات

قیمت: ۲۴۱ روپے شائع ہو گیا ہے۔

☆ رسولِ خدا، خلفاء راشدین، صحابہ کرامؓ اور صالحینؓ کی قابلِ تقلید زندگیوں سے لیے گئے سنہری واقعات

☆ دورِ نبوت، خلافتِ راشدہ اور تاریخ میں موجود عدل و انصاف کی عظیم روایات

☆ مسلم خواتین کی ذہانت، متانت اور شجاعت کے حیرت انگیز قصے

☆ دورِ جدید میں نئی نسل کے جذبہ ایمانی کو از سر نو تازہ کر دینے والے روح پرور واقعات

☆ ہر مسلم گھرانے کی لائبریری کی زینت، نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ۔ دعاؤں کے ساتھ

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 042-7245412

کی بات ہے کہ چلی تھوں سے پکی اینٹوں کی دیوار برآمد ہوئی تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے پکی اینٹوں کا استعمال کیا تھا وہ بعد کے لوگ تھے اور پکی اینٹوں کا استعمال کرنے والے مقامی لوگ یا پہلے سے آباد لوگ، اس سے یہ بھی نتیجہ نکلا تھا کہ پرانے باشندے بعد میں پکی اینٹوں سے گھر بنانے والے باشندوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ کھدائی کے دوران سینگ والے دیوتا کی ایک اور مورتی برآمد ہوئی تھی۔ یہ مورتی بھی پہلے ملنے والی مورتی جیسی ہی تھی لیکن اس کی جسامت دوگنی تھی۔ ایک اور بات یہ تھی کہ اس دیوتا کا سارا جسم ایک سیاہ پرت سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ پرت چوڑی کی طرح کہیں کہیں سے اکھڑ رہی تھی۔ یہ پرت کس چیز کی بنی ہوئی تھی یہ جاننے کے لئے مورتی کو سہائے کی لیب میں بھیج دیا گیا۔

رات کا کھانا کھا کر ہم ایک میز کے گرد اکٹھے ہوئے۔ سہائے نے آتے ہی انکشاف کیا کہ سینگ والے دیوتا کے جسم پر جو پرت جمی تھی وہ دراصل انسانی خون کی پرت تھی، ایسا لگتا ہے کہ اس دیوتا کو لگاتار انسانی خون سے نہلایا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس علاقے میں نرمی کی رسم ہوا کرتی تھی۔ آج کی کھدائی سے بہت ساری کام کی چیزیں برآمد ہوئی تھیں اور ہمارے نقطہ نظر سے یہ ایک کامیاب دن تھا۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔

وہ ایک بھیا تک چچ تھی جسے سن کر میری آنکھ کھل گئی، کسی عورت کی چچ، پھر وہ چچ قہقہہ میں تبدیل ہو گئی، پھر چچ اور قہقہہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک عجیب و غریب غیر انسانی آواز میں ڈھل گئے۔ میں بستر پر پڑا دل کی اچانک تیز ہو جانے والی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن مسلسل قہقہہ اور چچ کی ملی جلی آوازیں آتی رہیں، ساتھ

بات ہے۔ مٹی میں آئرن آکسائیڈ نہیں خون ملا ہوا ہے۔
”کیا؟“ میں لگ بھگ چیخ پڑا۔
”مجھے بھی حیرت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس زمین میں ہزاروں انسانوں کا خون گھل مل گیا ہے۔“
”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“

”تمہیں وہ اجتماعی قبر یاد ہے نا، ایسا لگتا ہے بڑے پیمانے پر یہاں کل عام ہوا ہوگا، شاید ایسی اور بھی قبریں برآمد ہوں۔ ہزاروں سال پہلے بہت ممکن ہے مغرب سے آنے والی بربری قوم نے اس علاقے پر حملہ کر کے یہاں کی آبادی کا صفایا کر دیا ہو اور ان کی لاشیں اجتماعی قبروں میں دفن کر دی ہوں تاکہ بدبو نہ پھیلے۔“ سہائے نے اپنا نظریہ پیش کیا۔
ایسا ممکن تھا لیکن ابھی تک اس سچ پر تحقیق نہیں کی گئی تھی۔ سہائے کی اس بات سے مجھے رات والا گھڑسواروں کا واقعہ یاد آ گیا جسے میں وہم سمجھ کر نظر انداز کر چکا تھا۔ سہائے سے جب میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو وہ ہنسنے لگا، اس نے بھی اسے وہم ہی سمجھا۔ میں نے سہائے سے کہا کہ اس بات کے کافی شواہد موجود ہیں کہ بربری قوم نے جب اس ملک پر حملہ کیا تھا تو وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر ہی آئے تھے، لیکن وہ اس علاقے میں آئے تھے یا نہیں یہ بات ابھی نامعلوم ہے تاہم دوسرے علاقوں میں بھی ایسے آثار ملے ہیں کہ وہ لوہے کے ہتھیار استعمال کرتے تھے جبکہ اس ملک کے باشندے ابھی تک لوہے سے واقف نہیں تھے، وہ یا تو تانبے کا استعمال کرتے تھے یا مدوز کا۔

شام چار بجے تک ایک بڑے حصے کی کھدائی مکمل ہو چکی تھی۔ اس حصے کا باریک بینی سے معائنہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر اور گہرا کھودا جائے تو یہاں سے مکالوں کے آثار ملنے کے امکانات ہیں کیونکہ کچھ پکی اینٹوں سے بنی دیواریں نمایاں ہو چکی تھیں۔ ایک جگہ ذرا زیادہ گہرائی تک کھودا گیا تھا اور تعجب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



پچھے پچھے بھاگے لیکن کیرتی سبرائیم کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ ندی کے کنارے کی ڈھلوان پر اُتری اور چھلانگ لگا کر ندی میں کود پڑی۔

ساری رات ہم کیرتی سبرائیم کو ٹارچ لے کر ندی میں تلاش کرتے رہے لیکن وہ نہیں ملی۔ اسی وقت کسی نے ہیڈ کوارٹر فون کیا اور صبح صبح ہوتے ہوتے پولیس آگئی۔ ایک بار پھر کیرتی کی تلاش شروع ہوئی۔ اس علاقے سے کافی دوری پر ندی کے کنارے کیرتی سبرائیم کی لاش ملی۔ اس واقعہ نے مزدوروں کو بے حد خوفزدہ کر دیا تھا، سارے کے سارے صبح ہوتے ہی رُف پھر ہو گئے۔ پولیس نے اشوک مجدد اور کیرتی کی لاش کو اپنے قبضے میں لے لیا اور علاقے کو سیل کر دیا۔

اتنے برس بیت گئے، آج بھی یہ واقعات میرے ذہن سے نہیں ہوتے۔ حکومت نے ان واقعات کے بعد اس علاقے کی کھدائی کا کام ملتوی کر دیا تھا۔ جب بھی یہ واقعات یاد آتے ہیں تو ان سب کے درمیان اچانک مجھے ایک گہری دھند سے ابھرتا ہوا پہلے بڑو مانجھی کا چہرہ نظر آتا ہے اور پھر اس کا پورا وجود۔ میں دیکھتا ہوں اس کے ہاتھوں میں سینک والے دیوتا کی صورتی ہے جس سے تازہ لبوئی بوندیں ٹپک رہی ہیں اور وہ تیزی سے ساگون دیوتا کے مندر کی طرف بھاگا جا رہا ہے جہاں ایک طرف اپنی سرخ زبان نکالے ماتا دیوی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اپنے گلے میں پڑے ہوئے اُس چڑے کے چوکور تعویذ کو، جو بڑو مانجھی نے مجھے اپنے ہاتھوں سے پہنایا تھا، واپسی پر میں نے بڑو مانجھی کے گاؤں کے پاس ہی پھینک دیا تھا۔ تعویذ بھینکنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سینے سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہو۔

ساتھ خیمے کے باہر لوگوں کی ہلچل بھی محسوس ہوئی۔ سلپہر پاؤں میں ڈال کر میں جلدی سے باہر نکلا۔ لوگ تیزی سے کیرتی سبرائیم کے خیمے کی طرف بھاگ رہے تھے اور وہ خوفناک آوازیں بھی ادھر ہی سے آرہی تھیں۔ ایک کونے میں مجھے بڑو مانجھی نظر آیا جو چاند کی طرف منہ اٹھائے جلدی جلدی کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا کیرتی سبرائیم کے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے ہی میں کیرتی کے خیمے میں داخل ہوا میری چیخ نکل گئی، یہی حال دوسروں کا بھی ہوا۔ اندر کیرتی سبرائیم..... نہیں وہ کیرتی سبرائیم نہیں ہو سکتی، وہ تو کسی اور ہی روپ میں نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آرہی تھیں اور منہ پر خون لگا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک زنگ آلود تلوار جیسی کوئی شے تھی اور دوسرے ہاتھ میں..... دوسرے ہاتھ میں، اُف یہ تو اشوک مجدد کا کٹا ہوا سر تھا۔ مجدد کا دھڑ دھڑ اس کے قدموں تلے پڑا ہوا تھا اور کئی ہوئی گردن سے خون نکل کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ کیرتی کے حلق سے مسلسل نچھہ اور چیخنے کی غیر انسانی آوازیں نکل رہی تھیں۔

اسی وقت بھیڑ کو چیرتا ہوا بڑو مانجھی اندر داخل ہوا۔ ”ہن، ہن، کائی بولیو، ہے ماتا، کائی بولیو، پالاگی، ماتا لگی، ہے ماتا، ہے ماتا۔“ بڑو مانجھی زمین پر سجدہ ریز ہو گیا۔ کیرتی سبرائیم یادہ جو کوئی بھی تھی بڑو مانجھی کی طرف مڑی اور اس کے سفید دانت نمایاں ہو گئے، جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔ اچانک اس نے زنگ آلود تلوار نما شے اور مجدد کے سر کو نیچے گرا دیا اور زمین پر کسی چوپائے کی طرح گر پڑی۔ اس نے اپنی گردن ادھر ادھر گھمائی اور تیر کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتی ہوئی لوگوں کی بھیڑ کو چیرتی اندھیرے میں باہر نکل گئی۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ کسی جانور کا گمان ہوتا تھا۔ سارے لوگ اس کے



”دو کردار“

مدیحہ اصغر

اسفرحہ کے قریب بیٹھے بڑے گہرے لہجے میں نہ جانے اسے کیا کہہ رہے تھے اور حنا کے چہرے پر پھرے رنگ مجھے ابھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ اس وقت وہ مجھے ایک بچی کی بجائے ایسی عورت لگ رہی تھی جو نقب زنی کر رہی ہو۔ ”مجھے جواب چاہیے“ اسفرحہ لہجہ اور انداز جذبول سے لبریز تھا۔

ایک مصنفہ کی کہانی، جو خود ایک بے رنگ کردار بن گئی تھی

مے جیسا کہ مصنف نہیں لکھتا ہے۔ اپنی اڑتیس سالہ زندگی میں ایک لڑکی میری زندگی میں مجھ سے ایسے ٹکرائی کہ میں ٹھٹھک گئی۔ گندی رنگت والی، بے انتہا سیاہ آنکھیں اور ان آنکھوں سے ٹپکتی ذہانت کی

کہانی لکھتے لکھتے انسان کو کبھی یہ احساس تک نہیں ہو پاتا کہ جن کرداروں کو وہ اپنی کہانی کی لڑی میں موتیوں کی طرح پروں پر رہا ہے اگر حقیقت میں وہ کردار اس سے ٹکرا جائیں تو کیا واقعی ایسے ہی ہوں

تھا اور ماں معذور تھی گھر کا بیشتر کام وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے کرتا تھا۔ وہ جائے بنالیتا تھا، روٹی پکالیتا تھا بیٹھے کڑ والے چاول اور حلیم بھی بہت حرے کی بناتا تھا۔ اس کی ہاتھیں سن کر میں مزید حیران ہوئی تھی اور متاثر بھی۔ وہ جب بھی مجھے یاد آتا ہے تو میری آنکھوں میں چمکتی نمی اس کے لیے دعا گو ہو جاتی ہے۔

حتا بھی اس کا پرتو لگ رہی تھی، اُبلے ہوئے چنوں اور کٹی ہوئی پیاز، ٹماٹر اور ہری مرچ سے بھرا ہوا چھوٹا سا ڈول اٹھائے وہ بے حد معصوم اور پیاری لگی تھی مجھے ”تمہیں بھی میرے ساتھ کھانے ہوں گے“ میں اسے پیسے ادا کرتے ہوئے بولی۔ ”ہیں؟“ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے یوں گھور رہی تھی جیسے میں نے کوئی انوکھی اور انہونی بات کر دی ”ہاں تم اور کون؟“ میں نے ٹشو پیپر سے اپنے ہاتھوں سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”اچھا ٹھیک ہے“ وہ مسکرائی تھی۔ میں اسے لے کر قریبی پارک میں آ گئی۔ اس کے ساتھ چنے کھاتے ہوئے میں نے اس سے بہت کچھ پوچھ لیا تھا۔ اس کی فیملی کے بارے میں، اُن کے حالات کے بارے میں۔ وہ ایک پینٹر کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ رنگوں سے کھیلنے کا ہنر جانتا تھا مگر فسوس کہ اس کی زندگی نے وفا نہیں کی تھی۔ وہ کینسر کے جان لیوا مرض سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ حتا سے چھوٹی بہن سدرہ تھی۔ وہ سلائی کڑھائی سیکھ رہی تھی۔ اس کی ماں بیکری کے لیے کیک اور بسکٹ بھی بناتی تھی اور کپڑے بھی سیتی تھی یعنی کہ پورا خاندان محنت مشقت کر رہا تھا مجھے ایک عجیب طرح کا غر محسوس ہوا تھا اور اس ننھی سی بچی پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ ”حتا تم جانتی ہو کہ اگر میری سچ وقت پر شادی ہو جاتی تو آج تمہاری عمر کی میری بھی اولاد ہوتی“ میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

”اچھا..... مگر آپ تو اب بھی لڑکی لگ رہی ہیں“

چمک، وہ محض چودہ چودہ سال کی ایک کم عمر لڑکی تھی مگر اس کی بہادری، محنت، مشقت اور جرأت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ سر پر دوپٹہ لپیٹے وہ دھوپ میں چنے بچ رہی تھی۔ تب گرمی بھی اپنے عروج پر تھی، مگر اس کے چہرے پر عزم و حوصلہ نمایاں تھا۔

اس سے پہلے میں بہاولپور میں ٹھنڈا پانی بیچنے والے ننھے سجد سے بھی مل چکی تھی۔ جو بس شاپ پر ٹھنڈے شربت کا گلاس پانچ روپے میں بیچ رہا تھا۔ اچانک لوگوں کی بھیڑ میں وہ کسی سے ٹکرایا تو اس کے ہاتھ سے ایک گلاس چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور چمکا چور ہو گیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، میں اس وقت اس سے شربت لے کر پی رہی تھی۔ مجھے بے انتہا رحم آیا پانچ روپے کا شربت بیچتے ہوئے میں روپے کا گلاس ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے ٹوٹے ہوئے گلاس کی قیمت ادا کرنا چاہی تو اس نے سختی سے منع کر دیا۔ میں دم بخود رہ گئی۔ ایک ننھا سا نرم و نازک سا بچہ جس کا بچپن حالات کی تپتی دھوپ میں وقت سے پہلے یوڑھا ہو گیا تھا۔ وہ اتنا خوددار تھا۔ مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی اور رونا بھی آرہا تھا۔ ”غریبہ تم صرف عورت ہی نہیں بلکہ ماں بھی ہو۔ ساری دنیا کے مظلوم، یتیم و مفلس بے یار و مددگار لوگوں پر تمہیں اتنا رحم اور پیارا آتا ہے کہ تمہاری اپنی شخصیت اور پہچان کھو گئی ہے تمہیں شادی نہیں کرنی چاہیے تھی تم تو درڑیا ہو۔“ فون پر میں نے اس کو سجد کے بارے میں بتایا تھا تو اس نے نیند سے بوجھل آواز میں چڑ کر کہا تھا خود سے عشق کرنے والا شخص زندگی کے آئینے میں فقط اپنا چہرہ اور وجود کھوجتا ہے۔ میں ننھی سے سوچ کر رہ گئی تھی۔

بہاولپور میں اپنے قیام کے آخری دن میں نے ایک دوست کی حیثیت سے اسے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی تو اس نے قبول کر لی۔ اس کا باپ برف بیچتا

کچھ پڑھ رہی ہو۔ حالات کی دھوپ میں پلنے والے بچے اپنی عمر سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ اتنا آگے کہ کبھی کبھی بڑی عمر کے لوگ بھی ان کے سامنے بچے بن کر رہ جاتے ہیں۔ ”وہ آپ کو روکتے نہیں سفر کرنے سے؟“ وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا، شاید وہ پہلی انسان تھی جو مجھ میں دلچسپی لے رہی تھی۔ ورنہ میں تو خود اپنے لیے کسی پرانے اور بوسیدہ فرنیچر کی طرح بن کر رہ گئی تھی۔ جس پر پڑی گرد کی تہ ہر روز بڑھتی ہی جا رہی تھی!

”نہیں! حالانکہ کبھی کبھی تو میرا بھی دل چاہتا ہے کہ وہ مجھے روکیں کہیں غریبہ تم کہیں نہ جاؤ، کوئی ضرورت نہیں ہے گھر سے نکلنے کی۔ مگر وہ کچھ کہتے ہی نہیں، وہ بہت آزاد خیال ہیں چودہ سال وہ لندن میں رہے ہیں۔“

”اچھا انہوں نے آپ کو کہاں دیکھ تھا“ میں نے گزرے وقت کو مڑ کر دیکھا تھا۔

”ہم دونوں نے ایک دوسرے کو یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ میں اور وہ کلاس فیلو تھے۔۔۔۔۔ وہ بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے اور میں بھی۔ ہماری مکتبی بغیر کسی رکاوٹ کے ہو گئی۔ وہ اسکالرشپ پر لندن چلے گئے مگر لندن جانے کے بعد اچانک انہوں نے مکتبی توڑ دی اور پھر چودہ سال کے بعد ایک دن وہ میرے گھر آئے اور معافی مانگتے لگے۔ میرے بابا ان دنوں شدید بیمار تھے اور میری وجہ سے بہت پریشان بھی تھے کیونکہ میری شادی کی عمر تقریباً گزر چکی تھی۔ میں اسفر کی خاطر بیشتر اچھے رشتوں کو ٹھکرا چکی تھی۔ پھر وہ جب شرمسار سے آگئے تو میں نے سب کچھ بھلا کر انہیں معاف کر دیا اور ہماری شادی ہو گئی۔ وہ یونیورسٹی میں اسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ میرے بابا بھی پروفیسر تھے۔ مجھے ٹریولنگ کا بچپن

اس نے کچھ حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”لڑکی گلے اور ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے، پندرہ سال پہلے میں جو تھی اب وہ نہیں ہوں میں نے چودہ برس انتظار میں گزار دیے اور پھر جب وہ آیا تو میری شادی اس سے ہو گئی، جسے میں نے خود سے بڑھ کر چاہا تھا۔ اب میری زندگی مکمل ہو گئی ہے، اس نے ہر آسائش دی ہے لیکن ہم جو ادیب ہوتے ہیں ناں کبھی بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ میں بھی اکثر اپنے اندر کی بے چینی سے گھبرا جاتی ہوں تو پھر سفر کرتی ہوں میں“ میں اسے بتا رہی تھی یا خود کو مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھی۔ میں اپنی ذات میں شامل تنہائی کی دیواروں سے گھبرا کر اس سے بے تکلف اعجاز میں ایسے بات کر رہی تھی جیسے وہ اڑتیس برس کی میچو اور سمجھدار پختہ عورت ہو اور میں پندرہ چودہ سال کی نا سمجھ لڑکی! کبھی کبھی انسان کو ایسا کندھا دھکا دے کہ جو اجنبی تو ہو مگر اس کی تکلیف کو محسوس کر سکے۔ میں بھی اسی کیفیت سے دوچار تھی۔ ”اوہ۔۔۔۔۔ آپ نے اب تک کتنے شہر دیکھ رکھے ہیں“ اس نے خوش ہو کر پوچھا تھا ”میں نے بہت سے شہر دیکھ رکھے ہیں تقریباً سارا پنجاب دیکھ لیا ہے ابھی پچھلے دنوں میں بہاولپور احمد پور شرقیہ خانیوال، احمد پور اور سمہ شہ سے ہو کر آئی ہوں مجھے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔“

”اور آپ کے شوہر، وہ کیا کرتے ہیں کیا وہ بھی آپ کے ساتھ جاتے ہیں۔“ اس نے انجانے میں میری دکتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ کتنی ہی دیر لگی تھی مجھے سمجھنے میں ”نہیں وہ پروفیسر ہیں انہیں گھومنے پھرنے کا کوئی خاص شوق نہیں ہے، وہ تو مجھ سے بھی کم ہی بات کرتے ہیں کہتے ہیں کہ تم سے تو بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں مجھ پر کوئی کہانی نہ لکھ ڈالو۔ میں کہتی ہوں آپ تو میرے شوہر ہیں آپ سے بات کرتے وقت میں صرف ایک بیوی ہوتی ہوں اور بس“ وہ میرا چہرہ بخور دیکھ رہی تھی جیسے

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

(اور ہم نے آپ کا ذکر (سب پر) بلند کر دیا۔ القرآن)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

پیغمبرِ آخر الزماں کی سیرتِ پاک **سیارہ ڈائجسٹ** کی طرف سے ایک لاثانی پیشکش

قیمت: ڈیکس ایڈیشن: 275 روپے
ڈیکس ایڈیشن: 450 روپے

عکس سیرت

”میں نے جب یہ کتاب ختم کی تو اونچی آواز میں جسے میں بھی صاف
سن سکوں ایک بار پھر کلمہ پڑھا۔ گویا اپنے آپ سے اپنے مسلمان
ہونے کا اعلان کیا۔“ (عبد القادر حسن، مشہور صحافی)

یہ ایمان افروز کتاب خود بھی پڑھیے اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھائیے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ، ریواز گارڈن لاہور

فون: 042-37245412

بھی اولاد کی شدید خواہش ہونے لگی تھی۔ یہ بات میں اچھی طرح سے جانتی تھی لیکن قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے!

”ہیلو! انہوں نے اپنا ہاتھ حنا کی جانب بڑھایا تھا۔“

منہی حنا حیرت اور بے یقینی سے ان کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ شرمارہی تھی گھبراہی تھی مگر اس نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔ میں دیر تک ہنستی رہ گئی تھی۔ میرے شوہر شرمندہ سے ہو کر مسکرا رہے تھے۔ ”بھئی میرے شوہر نامدار ولایت کے اثر سے کل ہی نہیں رہے اکثر بھول جاتے ہیں کہ پاکستان واپس آ گئے ہیں“ میری بات پر انہوں نے گھورا تھا غصے سے۔ پھر اکثر پیشتر میں حنا کو اپنے گھر لے آتی تھی اس کے آتے ہی ہمارے دیران بڑے گھر میں یوں رونق ہو جاتی جیسے نئے نئے منڈے چھپکارے ہوں حیرت کی بات یہ تھی کہ اپنی دنیا میں کم رہنے والے اسٹری بھی ہماری محفل کا حصہ بنتے جا رہے تھے!

”کاش تم جلدی لوٹ آتے، ہماری شادی مناسب وقت پر ہو جاتی تو آج حنا کی عمر کی ہماری اپنی اولاد ہوتی“ رات کو ٹیبل لیپ کی روشنی میں کتاب پڑھتے ہوئے سگار سے لطف اٹھاتے اسٹری کو بخوردیکھتے میں نے نہایت شکستہ انداز سے کہا تھا۔

”اچھا..... یہ شکوہ اور طنز کرنے کا نیا انداز ڈھونڈ لیا ہے تم نے ارے حنا تو ویسے بھی آ جاتی ہے، کہو تو ہمیشہ کے لیے اسے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں“ وہ مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولے۔ میں نا بھی کے عالم میں انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ دوسروں کے احساسات اور جذبات کو سمجھ کر قابض نہ کرنا اور خود کو سمجھنے اور بیان کرنے میں بے حد فرق ہوتا ہے۔ کب ہمارے جذبات ریت کی مانند ہمارے اختیار کی منہی

سے ہی شوق تھا میں پہلے بابا کے ساتھ گھومنے جاتی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد میں اکیلی ہی ہر جگہ جاتی ہوں۔ ان کی جو تھوڑی بہت چائیداد تھی وہ میں نے بیچ دی ہے اور اب اس رقم سے سفر کے اخراجات پورے کرتی ہوں۔ میرے شوہر کہتے ہیں کہ ان فضولیات کے لیے میرے پاس تمہارے لیے ایک روپیہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے میں ان سے مانگتی بھی نہیں اب تو اتنی عادت ہو گئی ہے کہ سفر کرنا سانس لینے کی طرح ضروری ہو گیا ہے۔ اب اتنی شدید گرمی پڑ رہی ہے تو سوچ رہی ہوں کہ مری چلی جاؤں مجھے اس بات کی قطعاً پروا نہیں تھی کہ وہ میری بات دلچسپی سے سن بھی رہی ہے یا مروت بھا رہی ہے۔ تنہائی کی دیواروں سے سرخ میخ کر بعض اوقات ہم اتنے لہو لہان ہو جاتے ہیں کہ جو بھی انسان نظر آئے اسے میسا سمجھ کر اپنا درد حال بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہماری دوستی کا نکتہ آغاز تھا۔ یہ بات میرے لیے تقویت کا باعث تھی کہ وہ میرے شہر کی باسی تھی۔

پھر ایسا بھی ہوا کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر گئی اس کے دو کمرے کے گھر کو میں نے بے حد سجا ہوا پایا تھا۔ گھر کیا تھا چھوٹا سا باغ تھا۔ گلاب کے پھول کیاری میں کھلے مسکرا رہے تھے۔ ان پھولوں نے جھوم کر مجھے سلام کیا تھا۔ میں دیر تک مسکرا ہو کر پھولوں اور پودوں سے سچے اس ننھے سے باغیچے کو نگتی رہ گئی تھی۔ اس کی ماں نے بے حد سلیقے سے میرے سامنے رکھی لکڑی کی پرانی سی تپائی پر مونگ پھلی والے بسکٹ، کریم رول اور کیک رکھ دیئے تھے اس کی ماں کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ تھا۔ چائے بھی بہت مزے کی تھی۔ پھر ایک مرتبہ میں حنا کو اپنے گھر لے آئی تھی۔ وہ اتنی پیاری اور معصوم تھی کہ میرے شوہر اسٹری سے دیر تک گھورتے رہ گئے تھے۔ آج کل انہیں

اشارہ میری طرف ہے ناں اسفر..... حالانکہ آپ کے حرام کو بھی میں نے حلال سمجھا ہے، کتنا پیتے ہیں کہ آپ کو اچھے اور برے کی تمیز نہیں رہتی آپ کی وجہ سے کوئی نوکرانی چار دن سے زیادہ نہیں نکلتی شاید اسی لیے ہمارے ملک میں حیوانیت اور انتہا پسندی اپنے عروج پر ہے کہ اساتذہ ہی..... میرے جیلے کو مکمل اسفر کے زوردار تھپڑنے کیا تھا اور اس تھپڑنے میرے لمبوں پر خاموشی کی مہر لگادی تھی۔ اس دن کے بعد سے میں نے کبھی بحث نہیں کی تھی کیونکہ مرد کا ہاتھ جب ایک مرتبہ اٹھ جائے تو پھر بنا بات کے بھی مارنے پر اپنا حق روا سمجھتا ہے۔ اسفر کا شمار ان رنگین حراج مردوں میں ہوتا تھا جو ہر روز نئی عورت اور پرانی شراب پاتے ہیں۔ اب تو میرا دل ہر اچاٹ رہنے لگا تھا کبھی میرے لیے یہ وہ شخص تھا جو میرے کردار کو خوبصورتی اور اعتدال فراہم کرتا تھا میں بھگی اور ساکت آنکھوں سے اس شخص کے ہل ہل بدلتے رنگ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ نجانے مغرب نے اس کا روپ بدلا تھا یا اس کے اندر چھپے ہوئے سفاک اور عیاش مرد کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کی بے وقائی کے دکھ کو بھی میری کہانیوں کے کرداروں نے ہلکا کیا تھا اور جب وہ لوٹ کر میری زندگی میں آیا تھا تو اس نے مجھ سے شادی کر کے کتنے ہی طوفان میرے دامن میں چھوڑ دیئے تھے۔ تب یہی ادب میری بیساکھی بن گیا تھا میرے کرداروں نے مجھے زندگی کی طرف کھینچا تھا۔ میں کھانا تیار کر کے دبے قدموں سے ڈرائنگ روم میں آ رہی تھی کہ دروازے کے قریب اچانک میرے قدم رک سے گئے تھے۔ اسر حاک کے قریب بیٹھے بڑے گہرے لہجے میں نجانے اسے کیا کہہ رہے تھے اور حاک کے چہرے پر بکھرے رنگ مجھے الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ اس وقت وہ مجھے ایک بچی کی بجائے ایسی عورت لگ رہی

سے نکل کر بے لگام ہو جائیں گے خبر ہے؟ چند دن یونہی مکان کو گھر بنانے میں گزر گئے تھے ورنہ اس سے پہلے تو یہ مکان نما گھر مجھے بڑا اجنبی اور خالی خالی سا لگتا تھا۔ مہینے میں چند دن تو میں لازمی سفر کرتی تھی اور جب لوٹتی تھی تو لگتا تھا کہ اپنا دل، اپنی روح اور اپنے جذبات کسی دیران سے کشن پر بھول آئی ہوں۔ عصر کا ڈھلتا ہوا وقت تھا۔ میں لان میں واک کر رہی تھی کہ اچانک حاک کو میں نے لان میں آتے ہوئے دیکھا۔ میرے لمبوں کو بے ساختہ مسکراہٹ نے چھوا تھا۔ حاک سے باتیں کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا تھا کہ میں اسفر کے لیے کھانا بنانا تو بھول ہی گئی ہوں۔ اسفر کی خوراک بھی بے حد کم تھی لیکن وہ شام کو کھانا ضرور کھاتے تھے۔ اسفر کے سامنے والے صوفے پر حاک بیٹھی تھی اور میں چپکے سے کچن میں گھس گئی تھی۔ اگر اسفر کو پتہ چل جاتا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں بنایا تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ وہ اپنی پروفیسری یونیورسٹی میں رکھ کر آتے تھے۔ گھر میں وہ ایک روایتی شوہر کا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرتے تھے۔ اب تو میں یہ بھی بھول چکی تھی کہ کبھی اس شخص نے مجھے محبت بھری نگاہ سے دیکھا بھی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم دریا کے دو کنارے ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے تو ہیں مگر درمیان میں قاصد رکھ کر۔ وہ مجھ پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ میری تعریف نہیں کرتے تھے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جو ان کے رویے کے باعث مجھے جھنجھے والے رنج اور اداسی کوذور کر دے۔ وہ کہتے تھے کہ مشرقی عورت اتنی مظلوم نہیں ہے جتنی کہ ناشکری ہے۔ باہر عورتیں کام بھی کرتی ہیں اور بچے بھی سنبھالتی ہیں مگر یہاں عورتیں گھر میں بیٹھے بیٹھے رونا چلاتی ہیں کہ ہم دنیا کی سب سے معصوم اور مظلوم قوم ہیں۔ ان کا طریقہ جملہ میرے دل کو تیر کی انی کی طرح چبھا تھا۔ ”آپ کا

”کون ہے وہ..... مجھ میں کیا کمی ہے.....“
میری آواز میں ساون تھا۔

میرے ٹوٹے دل کی کرچیاں چر رہی تھیں
مگر اسے میری پرواہی کب تھی وہ تو..... وہ تو میری
طرف بھی لب لونا تھا جب اس کے لیے سارے راستے
سارے دروازے بند ہو گئے تھے اور میں تنہائی میں
تنہائی کے غلاف میں اُداس کھڑی سولی پر چڑھے قیدی
کی طرح تھی جس کی صبح بھی اندھیروں سے ہوتی تھی۔

”کی؟ کمی کی بات کرتی ہو..... ڈھلتی عمر کی بے
رنگ عورت“ وہ آہستہ آہستہ ہنسا تھا۔ ”اور جس سے میں
شادی کر رہا ہوں تم جانتی ہو اسے بلکہ تمہاری پسند ہے
وہ“ وہ شوخ ہو کر بولے تھے۔ ”کون..... کون.....“
”میرادل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔“ ”حتا..... اور کون“
میں حتا کا نام سن کر گرنے کو گئی۔ ”حتا..... حتا..... جسے
میں اپنا اولاد کی طرح سمجھتی ہوں“ میں رونے لگی تھی مگر
یہ بوندیں میرے وجود کے اندر گر رہی تھیں۔ مگر مجھے یہ
احساس ہی کب تھا۔ ریت کے محل کی ساری دیواریں
ڈھس گئی تھیں اور میں واپس اسی بے آب چٹیل میدان
میں ننگے پاؤں کھڑی تھی جہاں سے میرا خیر اٹھا تھا۔

”حتا سے پوچھا ہے وہ کبھی نہیں مانے گی“ میرادل
”حتا پر یقین کے احساس کے ساتھ ہی پر زور لگتی کرتے لگا
تھا۔ وہ ہنسا تھا“ حتا آج جواب دینے ہی تو آئی تھی،
پرسوں ہوٹل میں کینڈل لائٹ ڈنر کو انجمائے کرتے
ہوئے میں نے اسے پر پوز کیا تھا“ وہ تقاضے سے چور لہجے
میں بولا تھا۔ میری ذات کے پر غمے اڑا کر وہ لوٹ گیا
تھا۔ میری کہانیوں کے بلند دیوالا کردار ریت کے
گھر وندوں کی مانند حقیقت کی بارش میں ڈوب کر میرا
منہ چڑانے لگے اور خود میں..... میں بھی تو اپنی کہانیوں کا
کوئی بے رنگ سا کردار بن کر رہ گئی تھی۔ ایسا کردار جو کٹھ
پتلی کی طرح تقدیر کی ڈور پر ناچتا جاتا ہے۔

تھی جو نقب زنی کر رہی ہو۔ ”مجھے جواب چاہیے“
اسفر کا لہجہ اور انداز جذباتوں سے لبریز تھا۔ ”ادبہ“
میں نے کھٹکا بھراتو دونوں اپنی اپنی جگہ چوٹ کر
سیدھے ہو بیٹھے۔ ”کھانا کھائیں“ میں شرمندہ ہو کر بولی
تھی۔ میں جس شخص کے ساتھ رہتی تھی حقیقت تو یہ تھی
کہ اس کی پرچھائی بھی میرے لیے اجنبی تھی۔ وہ کون تھا
میں اسے سمجھ نہیں سکتی تھی۔ کبھی وہ مجھے گرگٹ لگتا تھا۔ ایسا
گرگٹ جو پل پل رنگ بدلنے کے ساتھ ڈستا بھی تھا۔
صورتحال بہت تکلیف دہ تھی مگر میں نے خود کو
سمجھایا کہ جلد باڑی ٹھیک نہیں۔ ہم رائٹر بھی بڑے
عجیب لوگ ہوتے ہیں سادہ سے جملے سے پوری
کہانی تخلیق کر لیتے ہیں اور جہاں داستان لکھنی
چاہیے وہاں مفروضے گھڑ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔
حتا نے کھانا بس چکھا ہی تھا وہ مجھے بے حد پریشان
سی لگی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اسفر بڑے
خوشگوار موڈ میں میرے پاس آئے۔ میں لان میں
چھل قدمی کر رہی تھی اور اپنے ارد گرد کھلے پھولوں
کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں“ وہ مدھم لہجے
میں بولے، آج تو انہوں نے ”پتی“ بھی نہیں تھی۔

”ہاں کہیں میں نے کب روکا ہے“ میں ان
کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ”غریبہ میں شادی
کر رہا ہوں“ سنجیدہ لہجے میں بولا گیا یہ سفاک جملہ
میرے دل کے ٹکڑے کر گیا۔ میں اپنے شوہر کو دیکھتی
رہ گئی۔ شدت رنج اور احساس بے بسی سے۔ کیا یہ
وہی شخص تھا۔ وہی شخص جس کی خاطر میں ویران صحرا
کی طرح محبت کی چند بوندوں کو ترپتی رہ گئی تھی اور
جب پھر پیار کا بادل برسا تھا تو میرا پیاسا وجود
طوفان کی نذر ہو گیا تھا، میں نے کیسی زمین میں
محبت کے بیج بوئے تھے۔ وہ زمین کتنی بخر تھی جس
نے میرے دامن کو کانٹوں سے بھر دیا تھا۔

جاوید احمد صدیقی

تربیت کا اثر

فسیر اب کام میں خاصا مصروف تھا۔ لیکن کبھی کبھی کھانے پر یا صبح ناشتے پر حکومت کے قلم نمائندوں کی فرمائشیں پوری کرنے کے حوالے سے خاصا پریشان نظر آتا تھا۔ مظہر صاحب اس کا حصہ ٹھنڈا کرتے رہتے تھے۔ اسے تو صاف ستھرا کام کرنے کی عادت تھی مگر ملک کے حالات ماحول عجیب تھا۔



Optimized with a trial version of VSDO - www.vsdsoft.com

ایک باپ کی کہانی جس نے ہمیشہ حلال کمائی سے بچوں کی پرورش کی تھی

کو تو اللہ کے کرم سے میڈیکل کرا کر باہر سینٹلسٹ کا کورس کرانے بھیج دیا تھا اس نے تین سال میں سرجن کی ڈگری لے کر اپنے شہر میں کلینک بنالیا تھا جو پچھلے ایک سال میں بھرپور فرسنگ ہوم میں تبدیل ہو چکا تھا۔

مظہر صاحب نے چھوٹے بیٹے کو چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنانے کا ارادہ کیا اور اب وہ تربیت کے آخری چھ ماہ گزار رہا تھا وہ جہانگیر بھی تھا اور سیکڑو مارکیٹنگ میں بھی خوب تیز تھا۔ ایک سال کے بعد اس نے سی اے مکمل کر لیا تو لڑکی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

انہوں نے اب یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ توئی کمزور ہوتے جا رہے ہیں، کاروبار کو اکیلا سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے اور آگے بھی مشکل تر ہوتا جائے گا۔ انھوں نے تمام عمر سخت محنت کر کے کاروبار کو بنایا اور سنوارا تھا، اور اسی کی مدد سے اپنے اہلخانہ کی بہترین پرورش کی تھی۔ ایک بیٹی اور دو بیٹوں کو انھوں نے نیک بخت بیوی کے تعاون سے یہاں بڑھایا تھا۔ ہمیشہ حق حلال کی روٹی کا نوالہ اپنے بچوں کو کھلایا تھا۔ بچے بڑے ہو گئے تھے اور ان کی تربیت کا اثر بچوں میں صاف نظر آتا تھا۔ بڑے بیٹے

اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے اجازت دے دی۔
نصیر اب کام میں خاصا مصروف تھا۔ لیکن کبھی کبھی کھانے پر
یا صبح ناشتے پر حکومت کے بلڈ لمانہندوں کی فرمائشیں پوری کرنے
کے حوالے سے خاصا پریشان نظر آتا تھا۔ مظہر صاحب اس کا قصہ
شخصاً کرتے رہتے تھے۔ اسے تو صاف ستر کام کرنے کی عادت
تھی مگر ملک کے حالات ماحول عجیب تھا۔

کام میں تیزی آئی تو نصیر چند دنوں کے لیے حامر کے
ساتھ دوسرے شہروں میں اپنے شاہک مال کی عمارت کا تعمیر
کام دیکھنے اور ضروری کام بنانے کے لیے چلا گیا۔

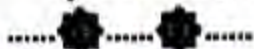
مظہر صاحب نے پہلے دن تو آفس میں مصروف دن
گزارا۔ دوسرے دن انہوں نے آفس میں کام کرتے
ہوئے ایک فچلے دروازہ کو کھولا تو ایک ڈائری نما چیز ہاتھ
آگئی۔ انہوں نے اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ چند
مقامات پر پڑھتے ہوئے وہ چونک اٹھے۔ ایک صفحے پر
حقوق خرچے کے نتیجے میں کچھ اس طرح لکھا تھا۔

1- ناپاک اور پلید جانوروں کو کھانا تاریخ.....
500/- روپے خرچ اور اس کے بعد مظہر صاحب حیران ہوئے
کہ 15 دن کے بعد کی تاریخ میں ایک اور خرچ اس طرح لکھا
گیا تھا۔

2- کتوں کے لیے کھانا..... رات۔ تاریخ.....
600/- روپے خرچ۔

مظہر صاحب کو کچھ سمجھ نہیں آیا، بہر حال انہوں نے
ڈائری رکھ دی اور نصیر کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ نصیر کے
آئے ہی وہ اس کے ساتھ آفس آگئے اور تھوڑی دیر کے بعد
وہی ڈائری نکال کر وہی صفحہ کھولا۔ پوئے بھی یہ کسی قسم کا کھانا
ہے اور یہ کون لوگ تھے۔ نصیر ہنسنے لگا اور پھر بولا، "ابو
آگے 2 والا صفحہ بھی نکالیں۔ یہ اشارہ لکھا ہے۔ پہلے جن کی
تفصیل درج ہے ایکسٹرا اسپیکر اور لیبر والے آئے تھے اور
دوسرے نمبر پر انکم ٹیکس کے کرنا دھرتا تھے، یہ اُن لوگوں کی خاطر
مدارت پر خرچ ہونے والی رقم کی تفصیل ہے!"

یہ سنتے ہی مظہر صاحب نے تہمتہ لگایا۔ پوئے "نصیر
احتیاط ضروری ہے۔ باقی اللہ مالک ہے۔"



ایک دن مظہر صاحب نے اسے بلایا اور پوئے "بھئی تم
کب تک پھرتے رہو گے۔ دیکھو میری تین صد جزل قسم کی
بڑی بڑی دکانیں تھیں جو اپنی محنت سے میں نے شاہک مال
میں تبدیل کر دی ہیں، ان کے لیے اور تمہارے سرجن بھائی
کے لیے ایک لکسی جگہ شاعر بلڈنگ بنا رہا ہوں جہاں بیٹھ کر تم
ان تمام کی دیکھ بھال کیا کرو گے۔ اکاؤنٹس کلب بڑی پارک
بنی سے چیک کرنا پڑے گا کیوں کہ کاروبار کی ہر اکاؤنٹ لسٹ کو
تم نظروں سے چیک تو کرنے سے رہے۔ اس لیے تمام
حساب کتاب کو تینوں شاہک مال اور ہمارے نرسنگ ہوم میں
رکھنے کے لیے کو ایفائنڈ لوگ رکھ لیے گئے ہیں۔"

"یہ تو شاعر کام ہوگا۔ بلڈنگ آفس والی کب تک مکمل ہو
گی؟" بیٹے نے پوچھا۔

مظہر صاحب پوئے "بھئی تقریباً مکمل ہے، مزید ایک مہینے
میں کام بالکل مکمل ہو جائے گا۔" نصیر بولا "ابو یہ بہت ہی اچھی
بات ہے میں کل ہی آپ کے ساتھ جا کر دیکھ لیتا ہوں۔"

نصیر نے تین ہفتے کے بعد دفتر میں بیٹھنا شروع کر دیا اور
معمول کی مصروفیات میں مشغول ہو گیا۔ اس عمارت کا افتتاح بھی
مال سے کرایا گیا۔ اعلیٰ طبقہ کے بڑے بڑے لوگ اور دوسرے
کاروباری افراد بھی اس افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے۔ بیٹی
اور سرجن بیٹے نے بھی باپ کے اس اقدام کو بہت سراہا۔ اور یہ
افتتاح بہترین ماحول میں اختتام پذیر ہوا۔

چند روز کے لیے مظہر صاحب نے بھی نصیر کے ساتھ کچھ
وقت گزارا۔ وہ مختلف برانچوں اور نرسنگ ہوم کا محاسبہ ضرور کرتے۔
یہ مظہر صاحب کا روزانہ معمول بن گیا لیکن نصیر کے ساتھ زیادہ دیر
نہ بیٹھ سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا نصیر بے حد قائل، ایماندار اور فحس
کے کاروباری فحس بن رہا ہے ایک دن نصیر نے مظہر صاحب کو اپنا
منصوبہ بتایا کہ ایسے شاہک مال اب ہمیں دوسرے شہروں میں بھی
کھولنے چاہئیں کیوں کہ ہمارے ہونے والے بہنوئی بھی ماشاء اللہ
سی اے ہیں اور ایم بی اے بھی باہر سے کر کے آئے ہیں۔ ایک ماہ
میں ہماری بہن رخصت ہو جائے گی۔ تو کیوں نہ حامر کو ہمارے
ساتھ ہی کام کی دیکھ بھال اور دوسرے شہروں کی برانچوں کو منجائے
کا کام بھی سونپ دیا جائے۔ مظہر صاحب نے نہایت ہی خوشی سے



ایس۔ امتیاز احمد

دریام سنگہ.....!

دریام جیسے کردار کچھ سوچنے پر مائل کرتے ہیں.....
قیام پاکستان کے پس منظر میں کبھی ایک کہانی.....!!
اُس محبت کی کہانی جو ذاتِ پات اور مذہب سے بالاتر ہوتی ہے۔
14 اگست کے حوالے سے خصوصی تحریر.....!

سے قائم ہے۔ پہلے یہاں بڑے صاحب انگریز ہوا کرتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ دیسی افسران تعینات ہونے لگے۔ یہ دفتر مختلف شعبوں میں منقسم ہے۔ درمیان میں ایک بہت بڑا ہال روم ہے۔ ہال میں

صدر بازار سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر کمپنی باغ سے ملی ہوئی ایک پرانی کوشی 20 بجکٹ پارک کے نام سے واقع ہے۔ یہاں صوبائی حکومت محکمہ تعمیرات عامہ کا سرکل آفس ہے۔ یہ دفتر علقوں

تھا۔

بالکل کالا رنگ اور اس پر سارے بال سفید، داڑھی کے بال بھنڈوں کے بال، حتیٰ کہ کلائیوں پر بھی سفید بال تھے۔ اس کے کالے رنگ نے ان تمام بالوں میں گویا سفیدی بھردی تھی۔ اس کا منہ تو صرف اس وقت دکھائی دیتا جب وہ منہ کھول کر مخصوص انداز میں مسکراتا ورنہ مونچھوں اور داڑھی کے سفید بالوں نے اس کے منہ کو چھپا رکھا تھا۔ اکثر سنتو اس سے مذاق کرتا۔

”سردار جی تہاڑا مونہہ کھتے دے“ اور وہ اس کو موٹی سی گالی دے کر ہاتھوں سے داڑھی مونچھوں کے بال ہٹا کر کہتا ”ایہہ کیہہ اے (یہ کیا ہے)؟“ پرانی سی چٹک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے حرکت کرتی ہوئی اس کی آنکھیں پھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جب دیکھتا تو سر کو پیچھے کی طرف کر کے چہرے اور آنکھوں کو اوپر کی طرف اٹھاتا۔ چٹک کے فریم پر بندھے ہوئے میلے دھاگے اس ہات کا ثبوت تھے کہ شاید اس نے کئی سالوں سے اسے سنبھالا ہوا ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کا ایک مخصوص لباس تھا۔ پرانی میلی سی قمیص موٹے کھدر کی اور ایسا ہی آزاد پاجامہ سر پر ایک بوسیدہ سی گچڑی جس کا رنگ کبھی خاکی ہو گا لیکن مدتوں کے استعمال سے اب اس کا رنگ ملگجہ ہو گیا تھا اور گچڑی جس کے پیچوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ اس بے ترحیب گچڑی سے کہیں کہیں گرد سے اٹے ہوئے سفید بال نکل رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا گویا گچڑی یوں ہی بندھی بندھائی سر پر رکھ لی گئی ہے۔ کبھی محمد خان اس کی گردن کے نچلے حصے پر دھپ مارتا تو گچڑی گر کر زمین پر آ رہتی اور اس کے سر کے چھوٹے بڑے سفید بال ایک موٹے دھاگے سے سر پر جوڑا بندھے دکھائی دیتے۔ اور وہ ایک

ہیڈ کلرک کے علاوہ ڈائری اور ڈسپنچ کلرکوں کی میز پر ہیں۔ ایک کونے میں دفتری کا چپترہ ہے۔ یہاں مکمل خاموشی ہے ہر شخص اپنے کام میں مشغول ہے۔ کبھی کسی دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آتی ہے اور پھر سکوت چھا جاتا ہے۔ یہاں کا ماحول خوشگوار اور دفتر کے لوگوں میں بڑا پیار ہے۔ یہاں مذہب اور ذات پات کی تفریق نہیں۔ سیاسی تہذیبوں اور تحریکوں سے بے نیاز رہتا یہاں کی ریت ہے۔

یہ تقسیم ہند سے پہلے کا وقت تھا۔ ہندو سکھ اور مسلمان کوٹے کے مطابق چالیس کے لگ بھگ دہائی افسران اور عملہ یہاں کام کرتے تھے۔ چیڑا سیدوں میں محمد خان سنتو اور دریام سنگھ تھے۔ محمد خان اور دریام سنگھ تو بوڑھے آدمی تھے۔ البتہ سنتو ادھیڑ پن کی طرف گامزن تھا۔ اسی وجہ سے اسے باہر کی ڈیوٹیاں دی جاتی تھیں۔ اکثر شاف کے لیے بازار سے کھانے پینے کی چیزیں بھی لا کر دیتا تھا۔ میٹرک پاس کر کے ریاض اس دفتر میں ملازم ہو گیا اور یہ اس کی زندگی کا پہلا عملی تجربہ تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان، دفتری ماحول سے بالکل ناواقف سکول سے نکل سیدھا یہاں آ پہنچا۔ مگر اس کے دل میں کام کرنے کی اُمید تھی۔ چند دن تو وہ انجینیئری بنا رہا لیکن جلد ہی وہاں کے ماحول سے مانوس ہو گیا۔ اب اس کو چیڑا سیدوں کے نام بھی یاد ہو گئے تھے۔

ریاض کو ان سب میں پراسرار شخصیت دریام سنگھ کی لگتی تھی۔ اس نے اکثر دیکھا تھا کہ جب وہ کام میں مصروف ہوتا تو دریام سنگھ اس کے سائیڈ ریک کے ساتھ کھڑا رہتا اور جب کبھی ریاض اس کی طرف دیکھتا تو وہ مسکرا دیتا۔ ریاض نے کبھی اس بارے میں سوچ بچار نہیں کی نہ اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی، وہ اسے ویسے ہی بُرا لگتا



احتیاط کیجیے اسی میں سب کی بھلائی ہے۔ ایسوریہ



یہ ایکسیڈنٹ جو آپ دیکھ رہے ہیں اس کی وجہ میں نہیں ہوں کیونکہ یہ حادثہ میری کسی زیر تکمیل فلم کے سیٹ پر نہیں ہوا۔ نہ سڑک کے کنارے لگے ہوئے میرے کسی سائن بورڈ کو دیکھتے ہوئے ہوا ہے اور نہ ہی میری کسی زیر نمائش فلم کے سینما میں۔ یہ حادثہ تو ایک ایسی فیکٹری میں ہوا ہے جہاں گھٹنے کے سیفٹی شوز ہیلمٹ گاگل ماسک کور آل لیڈر گلووز نینڈ گلووز سب ہی کچھ تو موجود تھا مگر ورکرز کی ذرا سی سستی اور لاپرواہی یہ رنگ لائی۔ آپ کو سوچنا چاہیے کہ ورکرز کو اس قسم کی صورت حال سے محفوظ رکھنے کیلئے فیکٹری کی انتظامیہ ان چیزوں پر ایک بڑی رقم خرچ کرتی ہے۔ احتیاط کیجیے اسی میں سب کی بھلائی ہے۔

KOTLAA SAFETY SHOES & KNITED GLOVES

R/NO.1, FIRST FLOOR, ASLAM ARCADE, 16-MILE RD, LAHORE. PH : 7314287-88 FAX : 7225293

”ریاج بابو یہ کام ہم نہیں کر سکتے“
”کیوں دریا بے؟“

”جناب ہم نے ایک مرتبہ ایک بابو صاحب کو ایک پتھر لا کر دیا تھا۔ ایک دوسرے بابو صاحب سے ان کا جھگڑا ہو گیا اور غصے میں انہوں نے وہ پتھر کھینچ مارا، بس خونم خون ہو گیا۔ جب بڑے صاحب تک معاملہ پہنچا تو انہوں نے پوچھا پتھر کس نے لا کر دیئے تھے۔ اس پر ہماری پیشی ہو گئی اور سخت ڈانٹ پڑی، اس دن سے ہم نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ کسی کو بھی پتھر لا کر نہیں دیں گے۔“

ریاض اپنے کام میں پھر مشغول ہو گیا اور دریام سنگھ کے چہرے پر اس کی مخصوص مسکراہٹ پھیل گئی۔ دن گزرتے گئے۔ کچھ عرصے بعد ریاض کو ڈسپینچر کا کام دے دیا گیا۔ ان دنوں دفاتروں میں کام زیادہ ہو گیا تھا۔ ملک میں گہما گہمی تھی، آزادی کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے جلسے ہو رہے تھے۔ انگریز ہندوستان چھوڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اسی لیے مختلف کاموں کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس محکمے میں بھی کام زیادہ ہو گیا تھا۔ ریاض کو اکثر چھٹی کے بعد بیٹھنا پڑتا۔ سب لوگ چھٹی کر جاتے لیکن دریام سنگھ اس کے ریک کے سامنے کھڑا رہتا جب وہ تھک جاتا تو دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی ٹینچ پر بیٹھ جاتا۔ ریاض اسے بیٹھرا کہتا۔ ”جاؤ دریام سنگھ بس میرا تھوڑا سا کام اور ہے، چوکیدار سے کہو کہ دفتر بند کر لے۔“

”نہیں ریاج بابو میں تو ویسے ہی بیٹھا ہوں، آپ کام ختم کر لیں تو میں چلا جاؤں گا۔“ اس کی آواز میں عاجزی ہوتی اور خواہش کا اظہار کہ جب تک ریاض وہاں سے نہ جائے اسے وہیں رہنے دیا جائے۔ پتہ نہیں اس سے اسے کیا سکون حاصل ہوتا تھا۔

ایک ایسا ہی دن تھا جب ریاض کے پاس ڈسپینچر

موٹی سی گالی دے کر جلدی سے چکری اٹھا کر سر ڈھانپ لیتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لوہے کا کڑا ضرور تھا لیکن کبھی اس کے پاس کرپان نہیں دیکھی۔ پاؤں میں چپل ہوتی جو کثرت استعمال سے کھس چکی تھی۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے کالے کالے پیروں پر میل کی تھیں، بڑھے ہوئے ناخن جن میں میل بھرا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی طرف دیکھنے سے کھن آتی تھی۔ ریاض جب اس کے بارے میں سوچتا تو کراہت محسوس کرتا اور اس سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا لیکن کبھی کبھی دوسرے لوگوں کی طرح اسے تنگ کرنے کے لیے عین اس لمحے وقت پوچھتا جب ہال روم کا بڑا کلاک ٹن ٹن ہارہ بجاتا اور دریام لجاجت سے کہتا:-

”ریاج بابو! تم تو میرا بچا نہ اڑاؤ۔“

کچھ عرصے بعد ایک دن ریاض حسب معمول چشیاں ڈائری کر رہا تھا تاکہ بارہ بجے سے پہلے ڈاک پیڈ ہیڈ کلرک کو دے دے۔ وہ بار بار چشموں کو قلمدان کے نیچے دبا تا مگر پھر بھی کاغذ چکھے کی ہوا سے اڑتے اور پھڑ پھڑاتے اور اس طرح اسے کوفت ہو رہی تھی۔ ریاض نے دریام کو آواز دے کر کہا:-

”دریام سنگھ جاؤ باہر سے دو پتھر لے آؤ“ اس کا مقصد تھا کہ چشموں کے اوپر یہ پتھر رکھ دیئے جائیں تاکہ بار بار نہ اڑیں۔ دریام سنگھ اٹھا تو ضرور، مگر جانے کی بجائے حسب عادت سائیڈ ریک کے ساتھ آکر خاموش کھڑا ہو گیا۔

”دریام سنگھ تم نے سنا نہیں، میں نے کہا کہ باہر سے دو پتھر لے آؤ۔“ ریاض کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ وہ پھر بھی ساکت کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر سکون اور مصوہیت تھی، پتہ نہیں چلا تھا کہ آیا اس کی خاموشی میں شرارت ہے اور وہ ریاض کو تنگ کر رہا ہے یا واقعی سنجیدہ ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا:-

ایک گرم گرم پراٹھا مع اچار کی پھاڑی لا کر اس کی میز پر رکھ دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا:-

”ریاج بابو یہ کھالو“ اس کی آواز میں لجاجت تھی۔ ریاض اس کی غیر متوقع پیشکش پر حیران ہو گیا اور سخت لہجے میں بولا:-

”دریام سنگھ یہ کیا؟ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میرے لیے پراٹھا بنا کر لاؤ؟“

”کیا ہوا ریاج بابو؟ آخر آپ کو بھوک بھی تو لگی ہوئی ہے“ دریام نے سراپا درخواست بن کر جواب دیا۔

ریاض کے دماغ میں مختلف خیالات چکر کاٹنے لگے۔ ”پتہ نہیں دریام سنگھ نے کس طرح یہ پراٹھا بنایا ہوگا؟ برتن کیسا تھا جس میں آٹا گوندھا؟ تو کیسا

تھا جس پر پکایا؟ پتہ نہیں اس نے آٹا گوندھتے وقت ہاتھ بھی دھوئے تھے یا نہیں۔ ریاض کو تو دریام سنگھ

سے بڑی گمن آتی تھی۔ کیونکہ اسے اس کے جسم سے تو آتی تھی۔ پتہ نہیں کبھی نہاتا بھی ہے کہ نہیں؟ سر

واڑھی اور بظلوں کے بال بڑھ رہے ہیں۔ اس کی میلی قمیص سینے سے شرابور رہتی ہے۔ سارے جسم

پر میل کی تھیں جھی ہوئی ہوں گی۔“ اس نے چاہا کہ وہ پراٹھا کھانے سے انکار کر دے لیکن اس کے دل

میں دریام کے اس فعل سے ایک گوندہ قدر بڑھ گئی تھی۔“ اس نے دل کو سمجھایا کہ اگر اس نے کھانے

سے انکار کر دیا تو دریام سنگھ کا دل ٹوٹ جائے گا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی ریاض نے آدھا پراٹھا کھا لیا

اور شکر یہ ادا کیا۔ دریام سنگھ کے لبوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ ابھر آئی۔

اب ڈسٹنچ کا کام بھی ختم ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ریاض دفتر بند کروا کر واپس ہوا۔ پھر ایک دن

ریاض نے دریام سنگھ سے کہا۔

”میں کہانیاں لکھتا ہوں..... کچھ اپنے بارے میں بتاؤ، تمہاری کہانی بھی لکھوں گا۔“

کا کام کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان دنوں دفتر کی چھٹی چار بجے ہوا کرتی تھی۔ دفتر کے سب لوگ چھٹی کر کے

چائے پیتے تھے۔ ریاض آج کھانے کے لیے بھی کچھ نہ لایا تھا، آج چھابے والا بھی نہیں آیا تھا اور سنتو بھی

چھٹی پر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جلد کام ختم کر کے گھر چلا جائے گا۔ لیکن کام میں ایسا منہمک ہوا کہ شام

ہو گئی اور پھر رات کا اندھیرا چھانے لگا مگر اسے پورا بھروسہ تھا کہ وہ جلد کام ختم کر لے گا۔ اس نے ہمت

نہ ہاری۔ بد قسمتی سے تھوڑی دیر بعد بجلی چلی گئی۔ ہال میں اندھیرا گھپ ہو گیا۔ صرف روشندان سے چاند

کی کرن ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے کسی زندان کے سوراخ سے آتی ہوئی روشنی یا پھر مشرقی دروازے

سے باہر قافلے سے چاندنی ایسی معلوم ہوتی تھی گویا کسی غار کے منہ پر مدھم روشنی دکھائی دیتی ہو۔

اندھیرا ہوتے ہی دریام سنگھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا۔

”ریاض بابو! دفتری لیکچر رام کے بکس میں موم بنی اور ماچس ہے کہو تو لے آؤں؟“ پہلے تو ریاض

نے یہ مناسب نہ سمجھا لیکن پھر ناچار کہا۔

”اچھا لے آؤ۔“

آج ریاض نے دریام سنگھ کے ساتھ کو فینیت سمجھا۔ تھوڑی دیر میں دریام سنگھ اندھیرے میں ٹٹول

کر موم بنی اور ماچس لے آیا۔ اب اتنی روشنی ہو گئی تھی جس میں کام ہو سکتا تھا۔ ریاض نے جلدی جلدی

لفافوں پر پتے لکھنے شروع کیے لیکن اب اسے بھوک ستانے لگی اور جب برداشت سے باہر ہونے لگی تو

اس نے دریام سنگھ سے بھی غیر ارادی طور پر اظہار کروایا۔ دریام سنگھ کچھ دیر تو خاموش رہا پھر اچانک

اٹھا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ ”ریاج بابو میں ابھی آتا ہوں“ وہ بدستور اپنے کام میں لگا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ریاض نے دیکھا کہ دریام سنگھ نے کئی سے تیار کیا ہوا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



ستبر کی بچیس تاریخ کو کوشش فرین روانہ ہونے کی اطلاع پورے کیمپ میں پکھی چکی تھی۔ ابھی پورا ہفتہ باقی تھا، کیمپ کے باسیوں نے اپنا اپنا مال اسباب باندھنا شروع کر دیا۔ کسی طرح وریام سنگھ کو بھی پتہ چل گیا۔ اس مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیری ہو گئی، وہ دل مسوس کے بیٹھ گیا، جیسے اس کی بہت سی قیمتی شے کھو گئی ہو۔ دو دن اُداس رہنے کے بعد اس نے تہہ کر لیا کہ کوشش فرین جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر وہ ریاض کو دیکھنے جائے گا اور یہ اس کی آخری ملاقات ہوگی۔

وہ رات اس نے کروٹیں بدلتے گزاری، نیند آنی تھی نہ آئی، جونہی وہ آنکھیں بند کرتا اس کے سامنے ریاض کا چہرہ ابھر آتا۔ کبھی اس کو دفتر میں کام کرتے دکھائی دیتا کبھی دفتر سے نکلے ہوئے اور کبھی صبح دفتر کی طرف آتے ہوئے۔ اگلے دن چوبیس ستبر کی صبح نمودار ہوئی۔ وریام سنگھ جلدی اٹھا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دنیا دانیہا سے بالکل بے خبر۔ اس کے تیز قدم شہر کی جانب اٹھ رہے تھے۔ وہ جلد از جلد کیمپ پہنچنا چاہتا تھا۔ ریاض کا آخری دیدار اس کا مقصد تھا۔ اس لیے کسی قسم کی رکاوٹ یا تاخیر اس کی برداشت سے باہر تھی۔ آج اس کے چہرے پر عجیب قسم کی بے بسی تھی۔ من میں ایک نئی ترنگ اور دل میں سرور تھا۔ نامعلوم اس میں کہاں سے روحانی طاقت آگئی تھی، اس کے بس میں ہوتا تو وہ پر لگا کر اڑ کر پہنچ جاتا یا پھر بازی گروں کی طرح ایک ہی چھلانگ میں کیمپ میں جا دھمکتا۔ بالآخر راستہ طے ہوا۔ وریام نے سکون کا سانس لیا۔ وہ جلدی سے کیمپ کی چوکی میں داخل ہوا اور ڈیوٹی آفسر کو آداب کہا۔

”کیا بات ہے بابا“

”صاحب جی ریاض بابو کو ملتا ہے“

”کون ریاض بابو؟“

پیغام پہنچا کہ کوئی وریام سنگھ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ فوراً چوکی پہنچا۔ دیکھا تو واقعی وریام سنگھ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا ہے۔ وہ حیران رہ گیا۔ خیریت معلوم کرنے کے بعد ریاض نے کہا:۔

”وریام تم نے ناحق اتنی تکلیف کی“

”ریاض بابو! کیا بتاؤں مجھے آپ سے مل کر کتنی کھوسی ہو رہی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے مُردہ جسم میں دوبارہ جان پڑ گئی“ پھر اس نے وریام سنگھ کی ایک ماہ کی تنخواہ نکال کر دی، وریام سنگھ نے بے رول پر دستخط کیے اور شکریہ ادا کیا۔ وریام نے بتایا کہ کوئی بھی یہ کام کرنے کو تیار نہ تھا لیکن میں نے ہمت کر کے حامی بھری کہ اس بہانے آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔

پھر پوچھا ”ریاض بابو کب تک پاکستان جائیں گے؟“

”صحیح پتہ نہیں، ممکن ہے پندرہ بیس دن لگ جائیں۔“

”اچھا میں پھر آؤں گا.....“

”کیوں تکلیف کرتے ہو وریام، حالات اچھے نہیں کہیں شریپند کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو غنڈے سکھوں کو بھی مار رہے ہیں اور چھپ کر پیچھے سے وار کرتے ہیں۔“

”ریاض بابو! مجھ بڑھے آدمی کو کوئی کیا نقصان پہنچائے گا۔“

اب کر فو کا وقت ہو گیا ہے۔ یکا یک سائرن کی آواز گونجی، لوگوں میں ہنگامہ مچ گئی۔ ریاض نے وریام سے کہا ”اچھا وریام، اب تم جاؤ کر فو کا وقت ہو گیا۔“

وریام سنگھ پچھلی پچھلی آنکھوں سے ریاض کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ چپ چاپ بھاری بھاری قدموں سے روانہ ہوا تو ریاض نے کہا ”رب راکھا۔“

امیدوں کے محل گرتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔
اب وہ ناامیدی کے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ دل
میں ایک ہوک اٹھی اور زبان سے نکلا۔
”اوہ واہگروا..... کیا اب میں ریاچ بابو کو کبھی
نہ دیکھ سکوں گا؟“

اس نے دل میں پراگھنا کی..... ”کرپا کرو مہا
راج“..... اور اچانک گاڑی ایک جھکے کے ساتھ چند
گز کے فاصلے پر رُک گئی۔ جیسے کوئی معجزہ ہو گیا ہو۔
دارنگی میں دریام سنگھ نے دوڑنے کا ارادہ کیا۔
وہ ایک بھاری پتھر سے ٹکرایا اور لڑکھڑا کر زمین پر گر
پڑا۔ اس کی چیخ نکل گئی ”ہائے“ ٹخنے پر چوٹ لگی
اور خون بہنے لگا۔ عینک کہیں گر کر ٹوٹ گئی پگڑی
گر پڑی۔ اس کے پیچ کھل گئے۔ صرف ایک سرا
دریام سنگھ کے ہاتھ میں تھا..... دوسرے ہاتھ میں
کپڑے کی پوٹلی تھی اور وہ پوری طاقت سے دیوانہ
دار فرین کی طرف بڑھ رہا تھا اور چلا رہا تھا ”میں آ رہا
ہوں ریاچ بابو! میں آ رہا ہوں“۔

اب دریام کی آواز گاڑی والوں کو صاف سنائی
دے رہی تھی۔ کچھ لوگ اس کی طرف لپکے اور اس
کو دونوں طرف سے سہارا دیا۔ کبھی کبھی انسان منزل
مقصود پر پہنچ کر بھی اسے کھو دیتا ہے۔ دریامے
پر اب غصے کی سی کیفیت طاری تھی۔ کسی نے جلدی
سے پانی کے چھینٹے دیئے اور ہوا کی تو دریامے نے
بند آنکھیں کھول دیں۔ لوگوں کے پوچھنے پر دریام
نے کپڑے کی پوٹلی ان کے حوالے کی اور کہا:-

”یہ ریاچ بابو کو پہنچا دیں“۔

کھول کر دیکھا تو اس میں ”گڑ“ کی کا آٹا اور
کچھ مٹھائی کی ڈلیاں تھیں۔ تھوڑی دیر میں ریاض
بھی وہاں پہنچ گیا..... اس نے کہا.....!
”دریامے تمہاری کہانی مکمل ہو گئی“۔



”صاحب جی ہمارے دفتر کے بابو ہیں سنگھ
ہی۔ ڈبلیو۔ ڈی یہاں رہی منزل میں آئے ہیں۔“
”تھرکپ کے لوگ پچھل ٹرین کے لیے جا چکے
ہیں۔ ہم نے فسادات سے بچنے کے لیے شیڈول
میں تہدیلی کر دی اور ایک دن پہلے ہی انہیں منہ
اندھیرے نکال دیا۔ (گھڑی دیکھ کر) اب تو ٹرین
کی روانگی کا وقت ہے۔“

”نہیں صاحب جی میں نے ریاچ بابو سے
ضرور ملنا ہے۔“

”تو جاؤ ملو بابا..... یہاں سے کوئی زیادہ دُور
نہیں دو تین فرلانگ کا فاصلہ ہے۔“

دریام سنگھ پھر ایک مرتبہ سرگرم سفر ہو گیا۔ ابھی
اس کی ہمت نے جواب نہیں دیا تھا اور وہ پورے
عزم کے ساتھ اپنی پوٹلی تھامے ریلوے یارڈ کی
طرف چل دیا۔ اس کا مختصر حیز ہو گیا۔ دل کی
دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی۔ حلق خشک ہو چکا تھا۔
پسینہ اس کے سر اور جسم سے نکل کر پٹریوں تک پہنچ
رہا تھا۔ پکی سڑک ختم ہوئی تو دُور سے فرین کے ڈبے
دکھائی دیئے۔ اس نے اپنی رفتار اور حیز کر دی۔ راستہ
ناہموار تھا۔ اسے چلنے میں وقت محسوس ہو رہی تھی۔
جا بجا ٹھوکریں کھاتا سنبھلتا وہ بڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ
ٹرین کے قریب ہو رہا تھا اس کی کائنات میں ٹھہراؤ
پیدا ہوتا جا رہا تھا جیسے سمندر کی طوفانی کیفیت مدھم
ہوتی جاتی ہے۔

لیکن وائے قسمت ابھی وہ قریب سو قدم کے
فاصلے پر تھا کہ انجن نے ایک زوردار سیٹی بجائی اور
گاڑی نے نضا میں ہری جھنڈی لہرا دی، مسافروں
میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ جونہی دریام سنگھ نے انجن
کی سیٹی سنی اس کے جسم میں پھر ایک بھونچال سا
آگیا۔ اک قیامت کی سی کیفیت، گویا مغرب
زمین و آسمان نہ دبا لاہور جائیں گے۔ اسے اپنی

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نئے نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

فریش کریم چاکلیٹ کیک



اجزاء:

میدہ
چینی
اٹلے
فریش کریم

نوٹیل اسپون
نوٹیل اسپون
دو
ایک پاؤ

آئسنگ شوگر
کوئنگ چاکلیٹ
ریڈ شوگر بال
رول سکٹ
شوگر سیرپ
ٹوکیب:

اٹلے کو اچھی طرح پھینٹ کر اس میں پس ہوئی چینی ڈال کر پھینٹیں پھر تھوڑا تھوڑا میدہ ڈال کر چمچ سے فولڈ کر کے پانچ انچ کے پن میں ایک سو اتنی درجہ حرارت پر بیک کریں۔ بیکنگ کے بعد کیک کو دو حصوں میں کاٹ کر اس پر شوگر سیرپ ڈالیں۔ کریم کو پھینٹ کر آئسنگ شوگر ڈال کر لگائیں دوسرا حصہ رکھ کر کریم لگا دیں۔ سائیڈ پر سکٹ لگا کر اوپر چاکلیٹ ڈال دیں اور ریڈ بال ڈال کر پیش کریں۔

کپ کیک

اجزاء:

ایک کپ اور آدھا کپ	میدہ
آدھا کپ	چینی
ایک چوتھائی کپ	کھن
چار عدد	انڈے
دو کھانے کے چم	ہینگ پاؤڈر
چار قطرے	ونیلا ایسنز
دو کھانے کے چم	کوکو
	چاکلیٹ چپ
	شوگر پکس

توکیب:

میدے میں ہینگ پاؤڈر ڈال کر کس کر لیں۔
انڈے کو اچھی طرح بھینٹنے کے بعد چینی اور کھن ڈال
کر بھینٹیں۔ اب اس میں وینلا ایسنز اور میدہ شامل
کر کے کس کر کے کپ کیک کے سانچوں میں ڈال
کر اوپر چاکلیٹ یا شوگر چمک ڈال کر 180 ڈگری
پر 20 منٹ بیک کر لیں۔ کیک کے ٹکچر میں سے
تھوڑا ٹکچر لے کر اس میں دو کھانے کے چم کوکو تین



کھانے کے چم دودھ ڈال کر کس کریں اور کپ
کیک میں ڈال کر بیک کر لیں۔

چیری رس کسٹرڈ



اجزاء:

دو پکٹ	کسٹرڈ
ایک لیٹر	دودھ
ایک پیالی	چینی
ایک چھوٹا ڈبا	چیری
آدھی پیالی	کارن فلور

ترکیب: دودھ دیکھی میں ڈال کر چوبلے پر
چڑھا دیجئے۔ تھوڑے سے دودھ یا پانی میں کسٹرڈ
گھول لیجئے۔ جب دودھ اُٹنے لگے تو اس میں
کسٹرڈ ڈال دیجئے اور ساتھ ساتھ چمچ ہلاتی جائیے
تاکہ گھٹلی نہ بنے پائے۔ تھوڑا سا گاڑھا ہونے پر
چینی ڈال دیجئے اور حر پکائیے۔ گاڑھا ہو
جانے پر اُتار لیجئے اور کسی برتن میں ڈال کر جمنے
کیلئے فریج میں رکھ دیں۔ چیری کے ڈبے کو کھول
کر چیری کو الگ کر لیجئے اور اس کا رس یا شیرہ کسی
الگ برتن میں نکال لیجئے۔ اس شیرے میں کارن
فلور اچھی طرح گھول لیجئے اور پھر کسٹرڈ کی طرح
پکائیے۔ گاڑھا ہو جائے تو اُتار لیں۔ کسٹرڈ جم
جائے تو اسے فریج سے نکال لیں اور اس پر چیری
کے شیرے اور کارن فلور کا آمیزہ ڈال دیں۔
حسب پسند اس پر چیری سجا کر یا اس کے بغیر ہی
فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیجئے اور ٹھنڈا ہو جانے پر
پیش کریں۔

بادام کا شربت

اجزاء:

انڈوں کی زردی
ہالائی
مغز بادام تلخ
نارنگی کا چھلکا
آٹھ عدد
ایک کلو
چند عدد
ذرا سا

ترکیب:

بادام کی گریوں کو گرم پانی سے بھگو کر پھیل لیں۔ ہالائی کو جوش دے کر اور زردی کو مصری کے ساتھ پھینٹ کر ہالائی میں ملا کر چھان لیں۔ پھر ہلکی آنچ پر مرکب کو بغیر جوش اس قدر پکائیں کہ سخت ہو جائے۔ پھر اتار کر بادام کی قاشیں تھوڑی سی ٹھنڈی ہالائی میں ملا کر اس مرکب کو چند منٹ تک پکائیں پھر آنچ دیں۔ پھر چھان کراتا پھینٹیں کہ بالکل ٹھنڈا



بادام کی گری عمدہ قسم کی
چینی
الابچی سبز
پانی
آدھا سیر
ڈیڑھ سیر
بارہ عدد
ایک سیر

ترکیب:

بادام کی گری ایک دن پہلے پانی میں بھگو دیں۔ اور دوسرے دن باریک پھیں لیں۔ پھر پانی ڈال کر باریک کپڑے سے چھان لیں۔ اب اس پیسے ہوئے باداموں میں چینی اور پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا دیں جب قوام تیار ہو جائے تو الابچی بھی باریک پھیں کر اکٹھا شامل کر لیں۔ اور اسکو گاڑھا ہونے دیں۔ یہ شربت کافی گاڑھا ہوتا ہے۔ اب اسے اتار کر ٹھنڈا ہونے پر کسی مرجان میں ڈال لیں اور دو چمچے ایک گلاس میں ڈال کر پانی یا دودھ میں ملا کر نوش فرمائیں بہت ہی لذیذ اور دل و دماغ کیلئے مفید ہوتا ہے۔

بادام کی آئنس کریم

اجزاء:

پورا
شک ناریل
انڈے کی سفیدی
میدے
بادام (ست)
چھ عدد
تین اونس
بڑے دو عدد
پون اونس
آدھا چمچ

ترکیب:

دو پکانے والی ٹرے پر کاغذ لگائیں۔ انڈوں کی سفیدی کو پھینٹیں۔ تھوڑی سی شکر ملائیں اور گھونٹتے

مغز بادام شیریں
مصری
ساڑھے تین چمچاں
پانچ چمچاں



ہو جائے پھر نارنگی کا ذرا سا چھلکا ملا کر رکھ دیں۔ بعد ازاں مشین کے ذریعے جمائیں۔

کھوپرے کے بسکٹ

اجزاء:

جھاگ اٹھ آئے تو اس میں ایک کپ دودھ کا ملائیں اور یہ کافی کشرڈ میں ڈال کر خوب ملائیں۔ بلکہ اٹھے پھینٹنے والی مشین سے خوب پھینٹیں اور پھر آئس کریم مشین جو کہ برف ڈال کر تیار کر لی ہو اس میں بنالیں۔

کریمل کیک

اجزاء:

تین کپ	میدہ
سات عدد	اٹھے
دو پیکٹ	کھن
ایک کپ	دودھ
دو کپ	چینی
	ونیلا این



ترکیب:

کھن اور چینی اچھی طرح پھینٹ لیں اور کریم سی بنالیں اور چھ اٹھے ایک ایک کر کے ڈالیں۔ چار چھ چینی کریمل بنالیں اور سانپے میں ڈال دیں۔ میدے میں وینلا اور بیکنگ پاؤڈر ڈال کر کریم میں ملا دیں۔ ٹرے میں پانی ڈال کر سانپہ دکھ کر دو سو سٹھی گریڈ پر رکھ کر 35 تا 40 منٹ کے لیے رکھ دیں۔



بنالیں۔ میدہ کھوپرے کے ساتھ گھونٹیں۔ کچر کوچ کے تھور میں پچیس منٹ تک پکائیں۔ ٹھنڈا کر کے گڈے کاٹیں اور کاغذ نکال دیں۔ اسے ٹین میں رکھیں جس میں ہوا کا گزر نہ ہو۔

کافی آئس کریم

اجزاء:

دو کلو	دودھ
چار اونس	کریم
تین چمٹاں	چینی
ایک بڑا چمچ	کافی کے دانے
چار چمچے	نہیں کافی
چار چمچے	کشرڈ پاؤڈر

ترکیب:

دودھ کو پکنے کے لیے چڑھا دیں اور سکھا کر ڈیڑھ کلو کر لیں۔ اب اس میں چینی ڈالیں اور کشرڈ ڈال کر تیار کر لیں۔ کافی کو ایک پیالے میں ڈالیں اس میں کریم ڈال کر اس کو خوب حل کریں۔ جب





نعت

تیری رحمت کے آشیانوں میں
حاصلہ آگیا اُڑانوں میں
تذکرہ ایک ذات کا ہر سو
سب زمینوں میں آسمانوں میں
کہنے کو اس جہان میں ہیں وہ
اور ظاہر سبھی جہانوں میں
اسم ان کا محمدؐ عربی
اور گونجے ہے سب زبانوں میں
ذکر میرے حضورؐ کا جاری
آتے جاتے سبھی زمانوں میں
ایک نقشِ حسین جھلکتا ہے
میری نعتوں مرے ترانوں میں
ظاہر ابدال ہوں غلام رسولؐ
میں بھی شامل ہوں مدح خوانوں میں

(ظاہر ابدال ظاہر)

لیلیۃ القدر

قدرِ تعظیم اور تکریم اور توصیفِ کمال ہے
کہ یہ شبِ عظمت و شرف اور عزت میں بھی کمال ہے
ہزاروں شب سے ہے بڑھ کر فضیلت ایک اس شب کی
کہ امت پر محمدؐ کے خصوصی نظر ہے رب کی
اگر ہو بندگی دس مات کی رمضانِ اعظم میں
تو یہ کمال عبادت آٹھ صدیوں سے بھی بڑھ کر ہے
انعامِ خاص رب نے امتِ احمدؐ کو دے ڈالا
ثواب و اجر میں صدیوں کی رحمت کو پرو ڈالا
فضائلِ عظمتِ قرآن کے لغزوں سے گونج اٹھیں

ہوائیں نور سے پر نور ہو کر اس طرح جھومیں
خدا نے خود یہ فرمایا یقیناً ہم نے بھیجا ہے
بلا شک و شبہ قرآن کو ہم نے اتارا ہے
پھر اس کی عظمتیں دیکھو ہے اس شب میں نزول اس کا
وہ شب جو قدر والی، افضل و اشرف و برتر ہے
مفسر کچھ تو کہتے ہیں عبادتِ سال بھر کی میں
یہ بندہ پانی لیتا ہے قدر کی شب بزرگی میں
مگر کچھ شائق تھے ماہِ قیام کی عشرہ بھی راتیں
اللہ کی رحمتوں کی لے کے آتی ہیں یہ برساتیں
وہ شب بیدار ان راتوں کے اس کو پا ہی لیتے ہیں
کہ اس شب میں ہر اک نیکی ہزاروں بار کرتے ہیں
تراسی قرون پر حاوی ہے یہ شب ارفع و اعلیٰ
کہ ہر لمحہ ہے اس شب کا ہزاروں نعمتوں والا
فرشتے اور روحِ الا میں ہر امر خیر کو قہاے
اُترتے ہیں پزلے بن کر کہ سب میں خیر کو ہائیں
عظیم الشان برکتِ خیر اور رحمت اترتی ہے
یہ سب برکت حیاتِ ہائیں کی ان کو ملتی ہے
یہ راتوں کی غذا بنتی ہے شب بیدار لوگوں کی
فرشتوں سے دعائیں اجر کی ملتی ہیں جنتوں کی
رحمتِ وصال کے ملائکہ سدۃِ انتہی کے فرشتے ہیں
کہ جن کے دل ہر اک مومن کی الفت میں دھڑکتے ہیں
یہ چاروں سو پھیلائے پر ہر اک مومن کے مسکن پر
اللہ کے نور کی چاروں طرف برسات کرتے ہیں
اسی شب میں امن اور خیر اور سلامتی اترتی ہے
کہ شب بھر مومنوں پر امن کی برسات ہوتی ہے
مجھبی ہوتی ہے اس کی صبح ملائکہ کی قطاروں سے
تو ملتا ہے سکون مومن کو رحمت کے قطاروں سے

چراغوں میں کیسی ہوا دے گیا
 وہ میکہ اور رانا ہیں ہم
 وہ جینے کی کیسی ادا دے گیا
 (قدیر رانا/راولپنڈی)
 کچھ خواہشیں

کچھ خواہشیں بھی
 کتنی ضدی اور منہ زور ہوتی ہیں
 کدول کی قبر میں انہیں
 ہتھکڑیاں بھی دفن کر دو
 ذرا سی ہموار کر
 کبھی نہ کبھی کسی صورت
 ناگ پھنی کے پودوں کی مانند
 خواہشوں کے صحرائیں
 سر نکال ہی لیتی ہیں
 نند گیاروں کی تپش

میں تابندہ بھی تو اس صبح چھپا لیتا ہے کروں کو
 یہ امر رب ہے صبح قدر لاتی ہے بہادری کو
 بہت ٹھنڈی بہت پر نور یہ صبح قدر آتی ہے
 کہ ہر مومن کو جنت کا حسیں مژدہ سناتی ہے
 نوشاہی خیر

غزل

محبت کے بدلے سزا دے گیا
 عجب دوستی کا صلہ دے گیا
 وفا میں نے مانگی جفا دے گیا
 وہ جاتے ہوئے غم نیا دے گیا
 تڑپتا سکتا ہی اب رہ گیا
 پھرتے ہوئے وہ دعا دے گیا
 نہ جانے کتنا رے کہاں کھو گئے
 سفینہ کہاں ناخدا دے گیا
 اندھیروں کا ہے رقص چاروں طرف

معراج کی شب

یہ عرش کی ساری راہوں میں
 محبوب ہمارے راہوں میں
 یہ عرش ہمارا قائم ہے
 یہ سسکیوں میں اور آہوں میں
 وہ راہوں میں چوراہوں میں
 ہے فرق محمد و موسیٰ میں
 ہے ایسا نور لگا ہوں میں
 تو جسم سے آیا ہے لئے
 ابلیس کی ذلت گاہوں میں
 یہ عرش کے سارے کینوں کا
 ہے نور بھرا مصباحوں میں
 (شوق خانوانی خانوانی)

معراج کی شب اعلان ہوا
 لطیف ہی پہنے آج
 لطیف کے بوسے کے صدقے
 رہتا تھا مگر اس سے پہلے
 غلام فرشتوں حوروں نے
 بیہوش ہوا تھا بشر مگر
 جو دیکھ سکے جلوہ حیری
 صدیق شہادت دے دے گا
 رہنے دے پریشاں جاں کو
 ہے شوق چراغاں آج کی شب
 ہیں دلوں جہاں جھلک جھلک

ہم بھی کچھ نام کر گئے ہوتے
غم نہ ہوتا جو تیرے کوچے سے
لے کے ہاتھوں پہ سر گئے ہوتے
تیری رسوائیوں کا خوف رہا
ورنہ کب کے بکھر گئے ہوتے
دل میں رکھتے جو تم مری چاہت
نالے نہ بے اثر گئے ہوتے
نیر کرتے نہ ہم جو مشقِ سخن
دن ہمارے سنور گئے ہوتے
(نیر رضادی/کراچی)

ہو میرا کام ضعیفوں سے محبت کرنا
رات کو آتی ہے دعا بن کے تنہا میری
صبح کو پوری ہو دعا بن کے تنہا میری
بچی رہے جان میری یونہی رہا ان سے
دعائی مدد نہ بن جائے کہیں رہا میری
ذول تھپڑ میں نہیں ان کے رخساروں پر
ذول ٹھڈے میں نہیں تشریف گاہوں پر
کبھی قحطانے کی صحت نہ میں دیکھوں یارب
پولیس کے بھاری "چھتر" سے بچانا مجھے یارب
ہو میرا کام ہٹلر سے بھی پھر بٹنگا لینا
کبھی مٹکا، کبھی تھپڑ کبھی فکر لینا
میرے اللہ تلنگوں سے بچانا مجھ کو
رہ جو جیل کی ہو اس سے بچانا مجھ کو
ہو میرا کام بمائی سے بھی نفرت کرنا
مدد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
دہشت کی جو راہ ہو اس سے بچانا مجھ کو
فیک جو راہ ہو اس راہ پر چلانا مجھ کو
ہر لمحے چہرے پہ رہے میرے تبسم یارب
شر انگیزوں کے شر سے بھی بچائے رکھنا

انہیں چلتی ہیں
نہیں دماغ چن جانے سے
خوف آتا ہے
ندریا کی بھری ہوئی موہیں
ان کے ارادوں کا خون کرتی ہیں
کچھ خواہشیں بھی کتنی.....!

(ڈاکٹر درخشاں انجم/کراچی)

غزل

وقا کو درد لکھتا درد کو آرام جاں لکھتا
ہمیں آئی گیا آخر محبت کی زباں لکھتا
زمین کو چہ جاناں کی قیمت کوئی کیا جانے
اگر لکھتا پڑے تو اس زمین کو آسمان لکھتا
قلم تو وقف ہے ذکر بیماروں کے لیے ہم
میرا مسلک ہے ویرانہ کو درخک گلستاں لکھتا
اگر قربت کا اک لمحہ میرا آ نہیں سکتا
تو پھر لازم ہے ساری زندگی کو رائیگاں لکھتا
اتیار لکھتے کی عادت ہو گئی ہے تم کو دنیا میں
بجائے اپنے غم کے تم کو حدیث دیکھاں لکھتا
(ایس۔ امتیاز احمد/کراچی)

غزل

لوٹ کے ہم نہ گھر گئے ہوتے
اس سے اچھا تھا مر گئے ہوتے
دیکھ لیتے جو مسکرا کے تم ۱۱
دغم سب دل کے بھر گئے ہوتے
کاش تم اور گنگو کرتے
کاش لمحے ٹھہر گئے ہوتے
تیرے کوچے سے اجنبی کی طرح
کاش ہم بھی گزر گئے ہوتے
موت آئی اگر جہانی میں

جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کرنی نہیں آتی
کیوں نہ جیوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی
دارغ دل گر نظر نہیں آتا
یو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
موتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
کہے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی
(مرزا اسد اللہ خان غالب)

وادی گنگا میں ایک رات
کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادی گنگا ترے شاداب قطارے
یہ بکھرے ہوئے پھول یہ بکھرے ہوئے تارے
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے
یہ چاندنی رات اور یہ پڑ خواب فضا میں
اک موج طرب کی طرح بے تاب فضا میں
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضا میں
ہلکے ہوئے قطارے ہیں ہلکے ہوئے تارے
یہ تارے ہیں یانور کے عے خانے ہیں آباد
معصوم وحسین حوروں کے کاشانے ہیں آباد
مستانہ ہواؤں پر پری خانے ہیں آباد

اللہ مجھے اس وجہ کے شر سے بچائے رکھنا
راہ جو بچ ہو اس راہ پر چلائے رکھنا
(اقبال تبسم)

مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں۔!

وہ میرے اداس دل پر
وہ تیری خوشبوؤں کی دھنکیں
مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں
صبح کو کوئل کی کوک
سرشام شفق کی رنگینیاں
وہ خواب جو بنے تھے میں نے
وہ تمام رنگ زندگی کے
چاہے تھے میں نے زندگی سے
ہواؤں کی نرم سی سرگوشیوں پر
اک تیرے آنے کا سن کر
وہ تیری خوشبوؤں کی دھنکیں
مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں
وہ میرے اداس دل کو
بہار کا پیرا ہن دینے کو
وہ تیری خوشبوؤں کی دھنکیں
مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں۔۔۔!

(مریم ماہر منیر، لاہور)

غزل

کوئی امید پر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے
غید کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنس
اب کسی بات پر نہیں آتی

کب چھڑا تھا، کون گھڑی تھی یاد نہیں
 لہ لہہ کیجا کر کے دیکھوں گا
 وعدہ کر کے لوگ بھلا کیوں دیتے ہیں
 اب کے میں بھی ایسا کر کے دیکھوں گا
 کتنا سچا ہے وہ میری چاہت میں
 محسن خود کو رسوا کر کے دیکھوں گا
 (محسن بھوپالی)

غزل

اس دور کی دنیا سے گزر کیوں نہیں جاتے
 یہ لوگ بھی کیا لوگ ہیں مر کیوں نہیں جاتے
 ہے کون زمانے میں میرا پوچھنے والا !
 ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ گھر کیوں نہیں جاتے
 شعلے ہیں تو کیوں ان کو بھڑکتے نہیں دیکھا
 ہیں خاک تو راہوں میں بکھر کیوں نہیں جاتے
 آنسو بھی ہیں آنکھوں میں دعائیں بھی ہیں لب پر
 بگڑے ہوئے حالات سوز کیوں نہیں جاتے
 (حبیب جالب)

یا دامن افلاک میں بے تاب شرارے
 مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
 الہاس کی صورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
 نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بے دار ہوائیں
 گل دار میں گل ریز گھر بار ہوائیں
 یا نور میں ڈولی ہوئی سرشار ہوائیں
 یا ہال فشاں مستی کھت کے قطارے
 صحرا ہیں کہ خوابیدہ قطاروں کے شبستاں
 دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں
 فردوس کی پُر کیف بہاروں کے شبستاں
 شاعر کو تمنا ہے یہیں رات گزارے
 (اختر شیرانی)

غزل

اپنا آپ تماشا کر کے دیکھوں گا
 خود کو خود سے منہا کر کے دیکھوں گا
 وہ شعلہ ہے یا چشمہ کچھ بھید کھلے
 پھر دل میں رستہ کر کے دیکھوں گا

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعره کا تعارف ہمہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم/پندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کو پتہ پر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 میں مارکیٹ ریوڈ گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔
کوین برائے اس ماہ کا شاعر



نام:
 عمر:
 پسندیدہ شاعر:
 پسندیدہ غزل/نظم:
 مشاغل:
 شادی شدہ/غیر شادی شدہ:
 ای میل:
 نوٹ: اپنی پسند ناپسند شاعری کی ابتدا مزاج اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔

ڈاکٹر درخشاں انجم

گھر اور شہر

اب مجھے معلوم ہوا کہ یہی میرا شریک سفر ہے، یعنی امیر علی..... میرے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ پہلے ہی بمشکل اپنے ناتواں دل کو سنبھالا ہوا تھا اور اب تو زندگی بھر کا رونا تھا..... ان لوگوں نے مجھے اور میرے گھر والوں کو دھوکہ دیا تھا۔ دل تو یہ چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روؤں، کتنے خود غرض تھے یہ لوگ۔

ایک عورت کی کہانی جس کے ساتھ شادی کے نام پر بہت بڑا دھوکہ ہوا تھا



دے رہا ہے۔ جس پر اڑتے ہوئے سفید بگے کتنے اچھے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان سرسبز درختوں کے درمیان رنگ برنگے پھولوں کے بیج میرا کالجیسا بڑا سا بنگلہ ایک عجیب سحر خیز سا منظر پیش کرتا ہے۔

یہ ادائل بہار کی ایک دھنک رنگ اور خوشبو بکھیرتی شام ہے۔ تاحہ نظر تک سبز ہی سبزہ نظر آرہا ہے۔ دور پہاڑی سے بہتا ہوا جھرنے کا سفید جھاگ اڑاتا پانی نیچے جمیل میں آکر ٹیلا دکھائی

عادی بنا دیا۔ یہ زہر کتنی ہی رگوں میں اُتارتا گیا۔ بدلے میں اُتے ہی پیسے ملتے گئے اور کچھ ہی سالوں میں وہ ایک امیر و کبیر انسان بن گیا۔ اپنے نام کی طرح نوجوان نسل میں بغیر سوچے سمجھے یہ زہر اُتارتا رہا یہاں تک کہ قدرت کی طرف سے دی گئی ڈھیل کا وقت بھی ختم ہو گیا۔ معمولی سی بیماری کے بعد ڈاکٹروں نے اسے بلڈ کیمنر تشخیص کیا، جب اسے ہوش آیا کہ اب رتی کھینچنے کا عمل شروع ہوا چاہتا ہے۔ بہت شیشیا مگر دیر ہو چکی تھی۔ اب ہر سال خون کی تبدیلی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ بیماری اخراجات کے علاوہ یون میڑو (Bone Marrow) کے اذیت ناک مراحل سے گزرتا ہوتا، یہ سلسلہ کئی سالوں تک چلتا رہا۔ اس کا ایک بھائی والدین کی موت سے پہلے ہی یہاں آ گیا تھا۔ اس کے آنے کے بعد اس کی دوشادی شدہ بہنیں بھی آ گئی تھیں۔ انہیں بھی اس نے علیحدہ علیحدہ فلیٹ پاکستانی کمیونٹی میں دلوا دیے تھے۔ اس کے علاوہ بھی مالی امداد کرتا رہتا تھا۔ اب جبکہ اس کی بیماری پر اس کے سارے پیسے لگنے لگے تو انہوں نے بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ سب نے مصنوعی مجبوری کا سہارا لینا شروع کر دیا۔ ملازم یا ملازمائیں اڈل تو وہاں ملتی نہیں تھیں اور کوئی ملا بھی تو بھروسے کا نہیں۔ البتہ پاکستانی کمیونٹی سے تلاش بسیار کے بعد جڑوقتی چوکیدار اور ایک خانساں کا بندوبست اس کے دوست استفد علی نے کر دیا تھا۔ خانساں اکثر چھٹی کر لیتا تھا۔ امیر خان کے بیمار ہونے پر ایک جڑوقتی نرس کا بھی انتظام کرنا پڑا تھا۔ جس کی فیس بہت زیادہ تھی۔ اس کے مالی حالات بھی خراب ہوتے جا رہے تھے۔ اب اس کی حمارداری کا کام سب کے لئے درد سر بنا ہوا تھا۔ جب اس کے دوست

میں اکثر اس میسر پر کھڑی گھنٹوں گھنٹوں ان حسین مناظر میں گم سی رہتی ہوں۔ اگر یہ کانچ ہمارے ملک کے کسی شہر میں ہوتا تو شاید میں اپنے آپ کو دنیا کے خوش نصیب انسانوں میں شمار کرتی لیکن یہ میرا ملک نہیں۔ ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ میں ہمیشہ یہاں کھڑی ان مناظر میں گم ہو جاتی ہوں لیکن آج بظاہر تو میں انہیں دیکھ رہی ہوں میرا ذہن کہیں اور ہے۔

شاید کل یہ سب کچھ نہ رہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ سب کچھ مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ قدرتی حسن میری کمزوری ہے اور آج جبکہ یہ سب میرا ہو چکا ہے میں بلا شرکت غیرے ان سب کی مالک و مختار ہو چکی ہوں تو سوچ رہی ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے؟

امیر خان نے اس خوبصورت سی وادی میں یہ مکان اپنی ذاتی رہائش کے لئے خریدا تھا۔ یہ انسان بھی کتنا حربیں ہے۔ دودن کی زندگی میں اپنے آرام و آسائش کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا۔ سنگٹک، منافع خوری، حق تلفی اور جانے کیا کیا کچھ، یہاں تک کہ بے گناہ انسانوں کی جان تک لینے سے دریغ نہیں کرتا مگر اسے کیا معلوم کہ موت اس کے پیچھے پیچھے منتظر رہی ہوئی ہے یا پھر کسی وقت کسی بھانے زندگی کی شام ہو جائے تو اسے سوائے دو گز زمین کے اور کیا ملتا ہے۔ اسے بھی کیا ملا، حالانکہ وہ اریوں کا مالک تھا۔ خاندانی دشمنی کی بنا پر والدین کے قتل کے بعد خود اس نے نشے میں پناہ ڈھونڈی۔ چاہے ماموؤں نے تینوں بھائی بہنوں کی شادیاں کروائیں اور اسے دشمنوں کی پہنچ سے دور سمندر پار بھیج دیا۔ ان کا خیال تھا وہاں جا کر اس کے نشے کی عادت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کے بارے میں تو اس کے خاندان کا خیال درست نکلا مگر اس نے دوسروں کو اس کا

افتخار احمد نے اسے شادی کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن آنکھوں دیکھی کسی کون لگ سکتا تھا۔ وہاں تمام لوگ اس کے بارے میں جانتے تھے۔ کافی سوچ بچار کے بعد پھر اسفند علی کا مشورہ کام آیا۔ اس نے پاکستان میں موجود اپنی خالہ سے کہا کہ وہ کسی ایسی لڑکی کا بندوبست کریں جو غریب ہونے کے ساتھ ساتھ قابل اعتماد بھی ہو۔ شکل و صورت خواہ جیسی بھی ہو۔

اس کی خالہ نے جس کی ماں جی سے خوب ہنتی تھی۔ اماں کے سامنے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئیں۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہائش پذیر لڑکے کے لئے غریب اور معمولی شکل و صورت والی لڑکی کی منطق سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، جبکہ ایسے لڑکوں کے تو مطالبات ہی بہت ہوتے ہیں۔ چلو غربت والی بات بھی مان لیتے ہیں کیونکہ کچھ صاحب حیثیت لوگوں کو روپے پیسے یا جہیز کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن شکل و صورت تو سبھی دیکھتے ہیں۔ ہمارا گھرانہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور شکل و صورت بھی اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں بہنوں کی اچھی بنائی تھی مگر افتخار احمد کی خالہ میرے لئے ہند تھیں۔ ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہانے لڑکے کی تصویر مانگی، ذرا انتظار کے بعد وہ بھی آ گئی۔ اماں کو لڑکا پسند آ گیا اور یوں بات آگے بڑھی۔ شادی کے سارے معاملات طے پا گئے، لڑکا کسی مصروفیت کی بنا پر نہیں آ سکتا تھا اس لیے فون پر ہی نکاح ہوا۔ کچھ دن پاسپورٹ اور ویزے وغیرہ کی تیاریوں میں لگے۔ آخر تین چار ماہ کے بعد میری رخصتی عمل میں آئی۔ سارا خاندان مجھے رخصت کرنے آیا تھا مگر صرف ایئر پورٹ تک۔ سب لوگ مجھے ڈیپارچر لاؤنج تک چھوڑ کر خدا حافظ کہتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میں پہلی بار اکیلی اتنے لمبے سفر پر جا رہی تھی۔ ایک تو انہوں سے

چھڑنے کا غم دوسرے اتنا طویل سفر پر مستقبل کا خوف اور ہمسفر سے ملنے کی آرزو، انجانے خوف کے حصار میں گھری ہوئی بیا کے دیس کو جا رہی تھی۔ آخر اس طویل اور تھکا دینے والے سفر کا اختتام ہوا۔ میں چیکنگ وغیرہ کے مراحل سے گزر کر ایئر پورٹ کے عملے کی نگرانی میں ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر ہونٹوں کی طرح گھبرائی گھبرائی سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی تصویر میرے ہاتھوں میں تھی۔ جب ہی ایک گاڑی میرے نزدیک آ کر ڈکی میرا دل زور سے دھڑکا کہ شاید امیر خان کی گاڑی ہے، لیکن یہ..... وہ تو نہیں تھا..... پھر..... گاڑی میں بیٹھے شخص نے میرے قریب آ کر میری مشکل آسان کر دی۔ ”قالتا آپ..... شفق منیر ہیں“۔ اور میں افتخار احمد..... امیر خان کا دوست سمجھ لیں“ اس نے خوشگوار لہجے میں اپنا تعارف کرایا مگر آنکھیں اس کے مسکراتے چہرے کی چٹخی کھا رہی تھیں۔ ایک الجھن تھی اس کی آنکھوں میں جسے میں سمجھ نہیں سکی۔ ”وہ کیوں نہیں آئے؟“ ”ہکوہ میرے ہونٹوں سے پھسل ہی گیا۔“ ”انہیں کوئی ضروری کام تھا“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ میں تذبذب کا شکار تھی۔ ”محترمہ یہ پاکستان نہیں امریکہ ہے یہاں ہر موڑ پر ایسے واقعات سے واسطہ پڑے گا۔“ اس نے میری سوچ کو پڑھتے ہوئے ہلکا سا طعنے لگایا اور کچلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ پھر ایک اور طویل سفر کا آغاز ہوا۔ مستقبل کے تانے بانے بننے گاڑی ایک شاعر کا بیچ کے پارکنگ ایریا میں پہنچ کر رُک کر میرے خوابوں کا سلسلہ بھی منقطع ہوا۔ تین چار خواتین اندر سے آتی دکھائی دیں ”لیس جی سنبھالیں اپنی بھائی صاحبہ کو“ افتخار احمد نے جھکے جھکے سے انداز میں انہیں مخاطب کیا۔ میں اُن کے ساتھ گھر

نوبلی دہن کو چھوڑ کر نکل گئے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اُداسی سمٹ آئی۔ جب بہت کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ مگر اتنا کچھ ہوتے ہوئے اتنا دولت مند انسان تھا کیوں تھا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

”دیکھو شفیق! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے“ بہت دیر کے بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ میرا دل خوش فہیوں کی لپیٹ میں آ کر دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ شاید اب..... کوئی پیار بھرا جملہ میری جانب اچھالے یا کوئی بہت راز کی بات بتائے۔ میں ہمہ تن گوش تھی۔ ”یہ شادی ایک مجبوری تھی میں صاف صاف بتا دیتا چاہتا ہوں، میں بلڈ کینسر کا مریض ہوں، سب آہستہ آہستہ میرا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ مجھے ایک کل وقتی ملازمہ کی ضرورت تھی جو یہاں ملتی مشکل تھی۔ اسفند علی نے مجھے اس مسئلے کا آسان حل بھی بتایا کہ میں کسی ایسی لڑکی کا انتخاب کروں جو مالی حیثیت میں کمتر ہو۔ پھر میرا یہ مسئلہ بھی اسی نے حل کر دیا۔ میں نے تمہارے والدین کو اتنا دے دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کا مستقبل ستوارنے کے بعد بھی اپنی باقی ماندہ زندگی بھی اچھی طرح گزار سکتے ہیں۔“

میں جو اتنی دیر سے اپنے خوابوں کے چمکا چور ہونے پر جاں بلب تھی اس کی اس بات پر یکدم چیخ پڑی ”کیا..... میرے والدین نے مجھے فروخت کر دیا ہے؟“

”نہیں! نہیں تو کچھ پتہ نہیں ہم نے اپنی خوشی سے کچھ ڈالرز ان کے اکاؤنٹ میں بھجوا دیئے ہیں۔“ اس نے صبح ایک طرف رکھ کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”تو آپ نے! ہماری کم مانگی کا سودا کیا۔“ میری آنکھیں سادون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔ ”نہیں..... نہیں ایسی بات

کے اندر چلی گئی۔ اندر ایک ادھیڑ عمر آدمی ٹھیک لگائے بیٹھا تھا۔ شاید بیمار تھا جب ہی گہل سے آدھا جسم چھپایا ہوا تھا۔ ”لیس جی! اپنی بیگم سنبھالیں، اور بیگم صاحبہ! ذرا اپنے میاں کا خیال رکھیے گا یہ کچھ بیمار ہیں۔“ بہن بھائی تعارف کے بعد مجھے ان کے کمرے میں چھوڑ گئے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ یہی میرا شریک سفر ہے، یعنی امیر علی..... میرے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ پہلے ہی بمشکل اپنے ناتواں دل کو سنبھالا ہوا تھا اور اب تو زندگی بھر کا رونا تھا..... ان لوگوں نے مجھے اور میرے گھر والوں کو دھوکہ دیا تھا۔ دل تو یہ چاہ رہا تھا چیخ کر روؤں، کتنے خود غرض تھے یہ لوگ اپنی خوشیوں آرام کی خاطر میری زندگی برباد کر رہی تھی اور کتنی جلدی یہاں چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔

”بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے دیکھ کر؟“ امیر خان نے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سہائے ہوئے پوچھا۔ ”نہیں..... نہیں“ میں نے لڑکھڑا کر دیوار کو تھام لیا۔ ”حوصلہ..... حوصلہ“ اس نے تسخیرانہ لہجے میں کہا۔ ”ادھر آؤ!“ اس نے اپنے پاس بیڈ پر آنے کا اشارہ کیا مگر میں اس وقت تک خود کو سنبھال کر پاس پڑے صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔ کچھ لمحے یونہی بیت گئے۔ ”بھئی کچھ تو بولو۔“ آخر وہ میری خاموشی سے اکتاہٹ گیا۔ ”تم نے شاید اس طرح کی شادی کا تصور نہیں کیا ہوگا۔ مگر یہ ہماری مجبوری تھی اور یہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے سارے اپنی اپنی دنیاؤں میں مصروف رہتے ہیں، کون کسی کے لئے وقت نکالتا ہے؟“ میری طرف سے مایوس ہو کر اس نے خود ہی وضاحتیں پیش کرنا شروع کر دی تھیں۔ ”اور پھر میرا یہاں سوائے ایک بھائی اور دو بہنوں کے اور کوئی ہے بھی نہیں اور وہ سب بھی اپنی اپنی مصروفیات میں کھوئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا تم نے! کیسے ایک نئی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریویو ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ آر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



نہیں اس نے مجھے بہلایا۔

اس رات میں سارا وقت جاگتی رہی۔ ایک تو اجنبی شہر دوسرا اتنا بڑا فریب، کبھی والدین کی طرف سے دل نہ اہونے لگتا کبھی سوچتی کہ کسی طرح واپس چلی جاؤں۔ تصور میں اپنے والدین کا شرمندہ اور مایوس چہرہ بھائی بہنوں کی سرد نظریں، خاندان والوں کی مسخرانہ ہنسی آجاتی، پھر ارادے ڈالوں ڈول ہونے لگے۔ دل نے بھی کہا، جب ملازمہ سمجھ ہی لیا گیا ہے تو کیوں نہ اسی رشتے کا حق ادا کر دیا جائے۔ اور میں اپنی ذات کی نفی کر کے امیر خان کی کنیز ہی بن گئی۔ کتنی بہاریں آئیں، کتنے پت جھڑ پیتے کتنے موسم گزرے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ گھر کے کام کاج کے علاوہ میں نے اپنے آپ کو اس کی خدمت کے لئے ہی وقف کر دیا۔ ڈکھ صرف اس بات کا تھا کہ میرے انہوں نے مجھے اپنا مستقبل سنوارنے کی خاطر یوں بے مول کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ ٹھہر کر کم از کم معلومات تولے لیتے۔ جب دل کا درد حد سے زیادہ بڑھ جاتا تو میں آنسو بہانے کی خاطر ٹیس پہ چلی آتی۔ وہاں بیٹھ کر بہت ہلکی پھلکی ہو جاتی، پھر بہت دیر تک ان نظاروں میں گم رہتی۔ اتنا کچھ میں نے اس انسان کے لئے کیا مگر کیا مجال کہ اس نے مجھ سے ہمدردی کے دو بول بولے ہوں یا میرے کسی کام کو سراہا ہو۔ بلکہ ہر کام میں نقص ہی نکالتا رہا۔ اب تو اس کے بھائی بہن بھی آنے جانے لگے تھے۔ مفت کی ملازمہ جوں جی تھی۔ صرف کھانا اور فرمان جاری کرنا ان کا کام تھا اور امیر علی انہیں سامنے پا کر پھولے نہیں ساتا تھا۔ باقاعدہ حصار داری اور دیکھ بھال سے اس کی طبیعت بھی بہتر ہو گئی تھی۔

میں بھی گوشت پوست کا ایک انسان تھی میرے سینے میں بھی دل تھا۔ اس دل کو تو وہ میرا

رہنے دیتا۔ فک کے فیروں سے وہ ہمیشہ میرا وجود چھلنی کرتا رہا۔ ہر آئے گئے کے سامنے شیر کی طرح گھورتا رہتا۔ اول تو امیر خان گھر سے باہر بہت کم ہی جاتا تھا، اگر کبھی کسی اگتائی ضروری کام کے لیے جانا پڑتا تو واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھ گچھ شروع ہو جاتی۔ جیسے میں کسی کے ساتھ عیاشیاں کر رہی تھی۔ بستر کی سلوٹوں سے لیکر ڈسٹ بن تک کی چھان بین کرتا کہ کوئی ثبوت ہی مل جائے۔ مجھے اکیلے نہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کبھی کہیں جانا ہوتا تو اپنی بہن یا بھائی کے ساتھ بھیجتا تھا۔ حالانکہ اس کی بہنیں بھابی، بھینجیاں، بھانجیاں سکرٹ بلاؤز فراڈز میں ملیں شتر بے مہار کی طرح جدھر منہ آتا نکل جاتیں۔ افتخار احمد کو مجھے لانے ایئر پورٹ بھیج دیا گیا تھا مگر اب مجھے اس کے سامنے بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی سے اپنا درد بیان کر سکتی اور نہ کسی کی خوشیوں میں شریک ہو سکتی تھی، کاغذ قلم استعمال کرنے کی اجازت بھی نہ ہی فون۔ بابا یا ماں جی کا فون آتا تو اسی لینڈ لائن فون پر جو امیر خان کے سر ہانے پڑا ہوتا۔ اس پر بھی پیکیج آن کر دیتا تا کہ ادھر کی باتیں میرے ساتھ وہ بھی سن سکے۔

وہ ایک دھندلی سی شام تھی۔ کئی دنوں سے برقعہ داری کا سلسلہ جاری تھا، سردیاں عروج پر تھیں۔ امیر خان کی طبیعت پچھلے کئی دنوں سے گری گری سی تھی۔ اس کے بھائی بہنیں سرشام ہی آکر اسے دیکھ گئے تھے۔ اچانک رات کو اس کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ میں نے ڈاکٹر کو فون کرنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ کچھ دیر کے بعد ہی افتخار احمد ڈاکٹر کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ شاید امیر خان نے ہی اسے فون کیا تھا۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں لکھ کر دی تھیں ڈاکٹر کے ساتھ افتخار بیٹھے لیکر نکل گیا۔ بہت دیر کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس

مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ میرا سائبان تھا۔ نام نہاد ہی
سبھی سائبان تو تھا جس کے نیچے میں زمانے کے سرد
و گرم سے محفوظ تھی۔ امیر خان کے انتقال کے بعد
اس کے گھر والوں نے طرح طرح کی باتیں شروع
کر دیں۔ بیمار تو وہ پہلے ہی تھا اس بات کا الزام تو
وہ مجھے دے ہی نہیں سکتے تھے البتہ اس کی موت کا
ذمہ دار مجھے ہی ٹھہرا دیا گیا کہ میں نے اس کی صحیح
دیکھ بھال نہیں کی۔ مجھے پتہ مارنے والوں
میں افکار احمد بھی شامل تھا جو میرے ایک ایک پل
کے طباب کا گواہ تھا۔ عدت پوری ہونے کے
دوسرے ہی روز امیر خان کے بھائی بھینس
آگئے۔ ”چلو نکلو بڑے عیش کر لے“ میری بڑی تند
نے نفرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔
چھوٹی سامان نکلوانے کے لئے مری جا رہی تھی۔
”دیکھنا زیور زیورات پر بھی دھیان رکھنا“۔ میں
نے ہارے ہوئے جواہری کی طرح اس گھر کے درو
دیوار پر نظر دوڑائی۔ تب نہ جانے کہاں سے افکار احمد
آگئے ”یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے حیرت
سے سب کی طرف دیکھا۔ ”کیوں؟ اب یہ یہاں
رہ کر کیا کریں گی“ بھابی نے اسے گھورتے ہوئے
کہا۔ ”اور پھر یہ گھر اس کا تو نہیں کہ محترمہ یہیں
ٹانگیں پھیلائے پڑی رہیں گی“۔ اس کے لہجے میں
زہر بھرا ہوا تھا۔

”یہ کہیں نہیں جائے گی، یہیں رہے گی“ اس
نے بڑے رसान سے کہا۔ پہلے تو سب کی سمجھ میں
کچھ نہیں آیا ”کیا؟“ پھر بیک وقت سب کے منہ
سے نکلا۔ ہر آنکھ میں سوالات تھے۔ ”امیر خان نے
مرنے وقت یہ مکان، گاڑی اور بینک میں جو کچھ بچ
گیا تھا ان کے نام کر دیا تھا“۔ افکار کے اس
انکشاف پر اُن لوگوں کے ساتھ میں بھی حیران
ہو گئی۔ ”یہ نہیں ہو سکتا؟“ نصیر خان سمیت وہ سب

کے آنے پر میں باہر آ گئی، باہر آتے ہوئے مجھے
افکار کی آواز سنائی دی۔ ”دیکھو خان صاحب ا
زندگی اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں کب کس
وقت کون چلا جائے انسان کو کچھ علم نہیں۔ اس لیے
بہتر ہے کہ اب اپنی بچی بچی جائیداد وغیرہ کی
وصیت کر دو، ورنہ بعد میں بڑا مسئلہ بنے گا“ میں
بجس کے مارے دروازے کی آڑ میں ہو گئی۔ ”کیا
..... وصیت کروں جو کچھ ہے وہ میرے بھائی بھن
کے کام آئے گا، اور کچھ اس میں سے اس غریب
مسکین کو دینا چاہیں تو دیں گے ان کی مرضی“۔ گویا
وہ اب بھی انہیں ہی نوازنا چاہ رہا تھا۔ جنہوں نے
ضرورت کے وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک
بار پھر میں آسمان سے زمین پر آ گئی۔ زندگی کے
اتنے سال اس کی خدمت کرتے رہنے کے بعد بھی
میں اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں بنا سکی تھی۔
اس پر ستم یہ کہ وہ کوئی میرا ہم عمر اور صحت مند انسان نہیں
تھا۔ اس نے سب کچھ پوشیدہ رکھ کر یہ شادی کی تھی
اور حیرت اس بات پر کہ وہ کوئی بے دین انسان بھی
نہیں تھا۔ خواہ ماضی میں کچھ بھی رہا ہو۔ بچی بات
ہے مجھے ایسے دیدار انسان سے اس بات کی توقع
نہیں تھی۔ مگر جو کچھ وہ کہہ رہا تھا میں پورے ہوش و
حواس کے ساتھ سن رہی تھی۔

”لیکن..... کچھ ان کے لئے بھی ہونا چاہئے
تھا“ اس نے ایک بار پھر میری حمایت کی۔ ”یہ کیا کم
ہے کہ وہ امریکہ جیسے بڑے شہر میں عیش کر رہی ہے۔
وہاں اس کے والدین کو بھی میں نے بہت کچھ دے
دیا ہے“۔ شاید افکار احمد کے پاس امیر خان کے اس
جواب کے بعد کچھ بھی کہنے کو نہیں رہ گیا تھا۔
اس کی طبیعت کئی دنوں تک گرتی سنبھلتی رہی۔
جیسے چراغ بجھنے سے پہلے کئی دفعہ پھڑپھڑاتا ہے۔
اسی طرح جلتے بجتے وہ ایک دن بالکل بجھ گیا۔ اب



طبیعی لٹلن و مشرقی احساس خوشبو

موجبا عرق گلاب کا شمار ان مصنوعات میں ہوتا ہے جس نے موجبا لیبارٹریز کا نام ہر گھر میں پہنچا دیا ہے۔

موجبا عرق گلاب

موجبا کا عرق گلاب اپنی کوالٹی، خوشبو اور اثر انگیزی کی وجہ سے دیگر تمام کینیوں کے عرق گلاب پر سبقت لے گیا ہے۔ ہر طرح کے مصنوعی پستنس سے پاک ہے جس کی وجہ سے اس کی خوشبو آخریک برقرار رہتی ہے۔ مفرح اور مقوی دماغ، آشوب چشم اور کان کے درد کو فائدہ بخشا ہے۔ خفقان، طشی اور ضعف قلب کو دور کرتا ہے۔ معدہ، جگر اور امعاء کو قوت دیتا ہے۔ قبض رفع کرتا ہے۔ پسینہ کی کثرت کو روکتا ہے اور اس کی بدبو کو دھل کرتا ہے۔ جلد کی حفاظت کرتا اور بے مثال موچر اتر اور میک اپ ریموور ہے۔ جلد کی بیماریاں جیسے Erythrodermia, Atopic Psoriasis اور Ieczema میں بے حد مفید ہے۔ موجبا عرق گلاب کھانے پینے کی اشیاء کو خوشبو دار اور خوشگوار بنانے کے لئے بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

موجبا عرق گلاب کی ڈسٹلن میں جو گلاب استعمال ہوتے ہیں ان کے اثر پذیر اجزاء اور ادویاتی استعمالات حسب ذیل ہیں

ادویاتی استعمال: (Pharmacological Actions)	اثر پذیر اجزاء (Active Constituents)	اجزاء (Ingredients)
مقوی اعصاب دیکھ اور مقوی بدن ہے۔ معدے اور امعاء کو قوت دیتا ہے۔ دست لاتا ہے اور قبض کشا ہے۔ صفراء کی حدت کو ساکن کرتا ہے۔ بدن کے نینے کو خوشبو دار بناتا ہے اور اس کی کثرت کو روکتا ہے۔ دروں کو تسکین دیتا اور زخموں کو خشک کرتا ہے۔	جیرمینول، سٹرونیلول، ریبوز مینول، نیرول، لینالول، ایوجینول، سیر آئین، کورینسٹرن، کوڑشائیک ایسڈ، میکلیک ایسڈ، کیروٹین	سرخ گلاب Rosa damacena

خوراک و طریقہ استعمال

شیر خور اور نو ذائید بچوں کے لیے: آدھا سے ایک (2.5 سے 5 ملی لیٹر) چائے کا چمچ دن میں سے تین بار بچوں کے لیے: دو چائے کے چمچ (10 ملی لیٹر) دن میں دو سے تین بار بڑوں کے لیے: دو سے تین چائے کے چمچ (10 سے 15 ملی لیٹر) دن میں دو سے تین بار برائے چشم: تین سے چار قطرے دن میں دو سے تین بار کھانوں میں: حسب ذائقہ

ممنوعہ علامات: (Contra indications): موجبا عرق گلاب کوئی ممنوعہ علامات نہیں رکھتا

احتیاطیں: (Precautions):

علامات برقرار رہنے کی صورت میں معالج سے رجوع کریں۔

نقصانات: شاذ و نادر Loose motions کا باعث بنتا ہے۔

ہدایات (Instructions): غصہ اور خشک جگہ پر رکھیں۔ رانی سے بچائیں اور بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔

نوٹ: موجبا عرقیات میں بعض ادوات لطیف اجزاء کی شکل میں جمع ہوتے ہیں یا جڑے ہیں لہذا انہیں اپنی طرح ہلکا کر استعمال کریں

پیکنگ: موجبا عرق گلاب مندرجہ ذیل روش اور کھاتی پیکنگ میں دستیاب ہے۔

(i) 25 ملی لیٹر (ii) 50 ملی لیٹر (iii) 50 ملی لیٹر (iv) 120 ملی لیٹر (v) 240 ملی لیٹر

(vi) 750 ملی لیٹر (vii) 1.5 لیٹر



طرف بڑھاتے ہوئے کہا اب تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی شک کی، اس لئے سب بے نیل و مرام واپس لوٹ گئے۔ اب وہاں صرف میں، افتخار احمد اور چوکیدار رہ گئے تھے۔ افتخار نے بھی شاید اس طرح اکیلے میں میرے پاس رہ کر ان کے شک کو ہوا نہیں دینا چاہی اور فائل مجھے پکڑا کر چند اہم باتیں بتاتا ہوا اسی وقت گھر سے نکل گیا۔

مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ کچھ کہتے ہیں اس کائنات کا خالق ہل میں بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا دیتا ہے۔ اس نے پہلے مجھے عرش سے فرش پر پھینکا اور پھر فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا۔ اب یہ سب میرا تھا..... صرف میرا..... افتخار نے خطرے کے پیش نظر پہلے کی طرح سیکورٹی انتظام بھی رہنے دیا تھا۔ اب کسی کو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے دس دفعہ سوچنا تھا۔

کتنے ہی روکے پھیکے دن یونہی گزر گئے۔ میں روز اس ٹیبل پر کھڑی ہو کر منصوبے بناتی رہتی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ واپس لوٹ جاؤں یا نہیں زندگی گزاری چاہئے، اب تو یہ سب میرا تھا۔ پھر افتخار احمد بھی کئی بار ڈھکے چھپے لفظوں میں کچھ باتوں کا اظہار کر چکا تھا۔ مگر..... اسے تو..... یہاں رہنا تھا..... اور میں، میرا تو صرف جسم یہاں تھا۔ مگر روح تو اب تک وہیں میرے ملک کے اسی شہر میں ہی قیام پذیر تھی جہاں میں پیدا ہوئی۔ پلٹی بڑی تھی۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہاں کا ایک ایک منظر میرے ذہن کے پردے پر نقش تھا۔ میرے کانوں میں اب بھی میرے ہم وطنوں کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ امیر نے کئی بار مجھ سے پوچھا تھا، یہ تم بار بار چونک کیوں جاتی ہو، کہاں گم رہتی ہو؟ میں اسے کیا بتاتی۔

آج پھر افتخار احمد آیا تھا، وہی سوال لیجے۔

بے ہنگم ٹریفک والے

10 بدترین شہر

جیڑی سے بڑھتی ہوئی آبادی نے دنیا بھر میں کئی مسائل پیدا کر دیئے ہیں، ان میں ٹریفک کا مسئلہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ حال ہی میں ایک امریکی جریدے کی جانب سے دنیا کے 10 اہلے شہروں کی فہرست جاری کی گئی ہے جو بے ہنگم اور بڑھتی ہوئی ٹریفک کی وجہ سے شدید مسائل کا شکار ہیں۔ فہرست کے مطابق چین کا شہر بیجنگ ٹریفک کے حوالے سے دنیا کا بدترین شہر ہے جبکہ جنوبی کوریا کا شہر سیول، فرانس کا شہر پیرس اور اٹلی کا شہر روم بدترین دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر پر ہیں۔ بھارت کا شہر ممبئی بدترین ٹریفک کے حوالے سے پانچویں نمبر پر ہے جہاں گائے سمیت مختلف جانوروں کی وجہ سے ٹریفک کی صورتحال ابتر ہو چکی ہے۔ کینیڈا کا شہر ٹورنٹو، فلپائن کا دارالحکومت منیلا، نايجیریا کا شہر لاگوس، منگولیا کا شہر یولان باتر اور یونان کا شہر اتینکسز بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

(مرسال: شفقت طاہرہ درک۔ کراچی)

چلانے لگے۔ "وہ تو کہتا تھا سب کچھ تم لوگوں کا ہے..... اور یہ بھی؟" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "وہ بہت ہوشیار تھا، وہ تم لوگوں کو فریب دے کر کام لگا رہا۔ یہ رہے کاغذات۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ "لیکن یہ کاغذات تمہارے پاس کیسے آئے؟" نصیر خان اور اس کے بڑے بہنوئی کامل خان کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ "کل ہی وکیل یہ مجھے دے گیا تھا۔" اس نے کاغذات ان کی

نے مجھ دیا کیا تھا، نہ ازدواجی خوشیاں نہ آل نہ اولاد بلکہ آخری وقت تک مجھے کچھ سمجھائی نہیں۔ میری زندگی کے پندرہ ہفتے مسکراتے سال اس نے کھائے تو پھر میں اسے یاد کر کے غمزدہ کیوں ہو رہی تھی۔ دوسری طرف اپنے وطن اپنی مٹی کی طرف لوٹنے کی خوشی تھی، گو کہ اب وہاں بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔ والدین جیسی ہستی اب باقی نہ رہی تھی۔ لیکن پھر بھی تھا تو میرا وطن، جس کے ایک ایک ذرے سے جسم و جاں کا رشتہ بڑا ہوتا ہے۔ پھر یہ پھانس کیسی تھی جو مجھے بے چین کر رہی تھی۔ میں اس وقت تک اپنی اس بے کلی کا کھوج لگاتی رہی جب تک کہ جہاز نے اڑان نہ بھری۔

پھر دل میں خیال آیا کہ شاید میری اداسی اور بے کل کیفیت اس شخص کی وجہ سے تو نہیں جس نے مجھے ڈلوایا بھی اور بخیر سے نکلنے میں میری مدد بھی کی۔ اور میں تو اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔ جب ہی مجھے اپنے بھائی ایک مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ مڑتے ہی حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ ”آپ آپ یہاں“ دل ایک خوشگوار انداز میں دھڑکا۔ ”میں نے آپ کو بہت ڈھونڈا“۔ کچھ دیر کے بعد میں اپنی حیرت پہ قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن آپ مجھے ڈھونڈ کیوں رہی تھیں؟“۔ انکار احمد کی آنکھوں میں شرارت کا عکس نمایاں نظر آرہا تھا ”لیکن آپ کہاں؟ اور کیوں جارہے ہیں اچانک مجھے یاد آیا آپ تو غالباً یہاں“ ”ہاں! یہاں رہتا تھا“ اس نے میری بات پوری ہونے سے پہلے کہا ”مگر اب نہیں“، ”کیا مطلب“ میں گڑبڑائی۔ ”مگر کہیں بھی بن سکتے ہیں مگر شہر تو کہیں نہیں جاسکتا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے میری ہی بات مجھے لوٹادی۔

”ہاں! تو کیا سوچا ہے آپ نے؟“

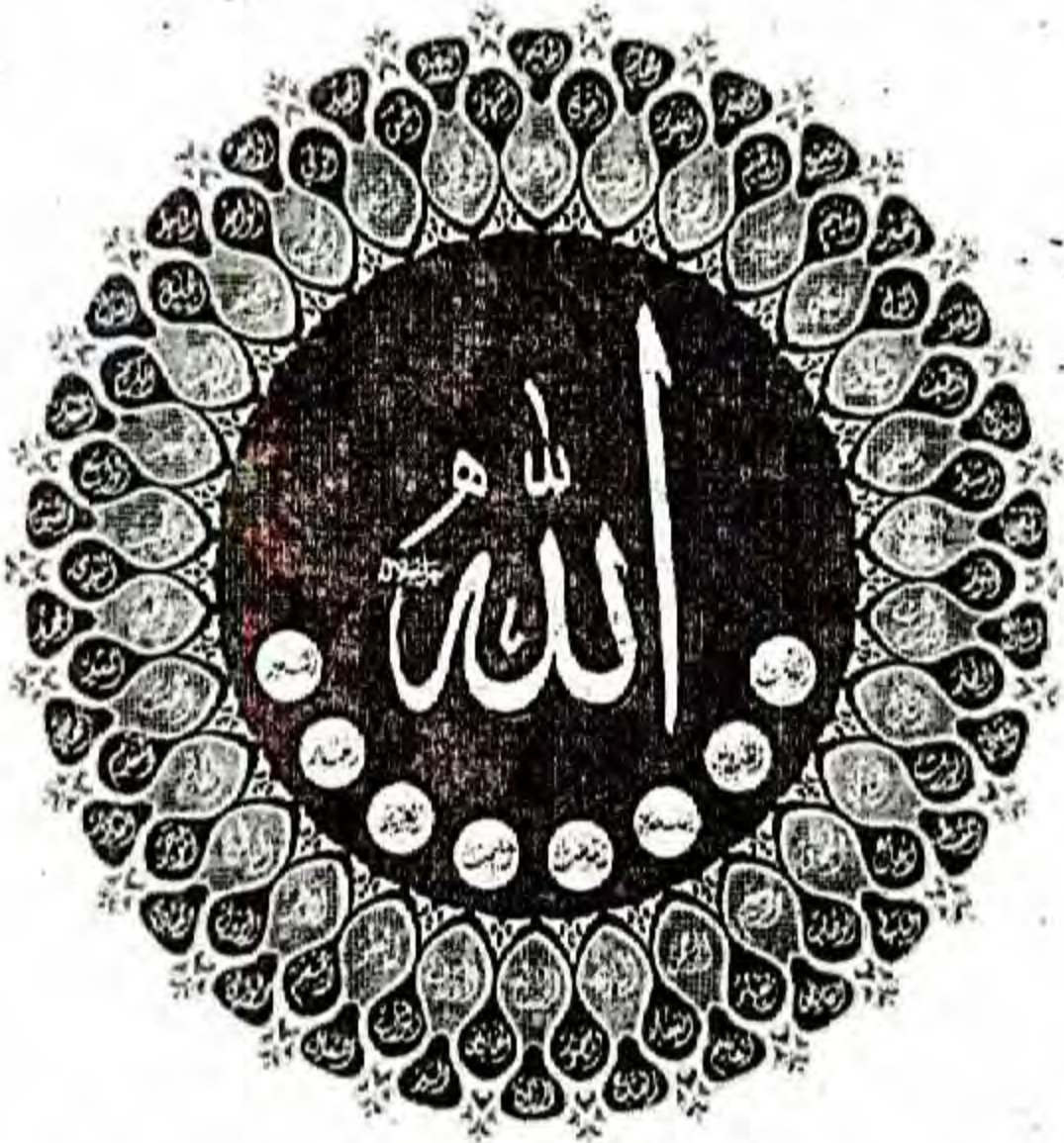
”میں جارہی ہوں“۔ میرے سپاٹ لہجے میں اعتماد تھا مگر ساتھ ہی آنکھوں میں ایک بے نام سی اداسی اتر آئی تھی۔ ”میں اپنے شہر اپنے ملک واپس جارہی ہوں۔“

”لیکن اب وہاں جا کر کیا کریں گی آپ! آپ کے والدین بھی نہیں رہے، بھائی بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ پھر آپ کو تو یہ جگہ بہت بھاتی تھی۔ یہ گمریہ دلکش نظارے بہت اچھے لگتے تھے آپ کو“ آخر میں اس نے میری دھستی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر ہمارے ملک میں بھی ایسے مناظر کی کمی نہیں ہے، وہ مٹی گمریہ بات، تو ایسا مگر وہاں بھی بن سکتا ہے مگر میرا ملک میرا شہر یہاں نہیں آسکتا۔ آپ اس مکان کی قیمت لگوائیں اور میرے جانے کا بندوبست کریں۔“ میرا حتی فیصلہ سن کر وہ جھکے جھکے قدموں سے باہر نکل گیا۔ مکان کی فروخت سے لے کر میرے پاکستان آنے تک کے سارے انتظامات اسی نے مکمل کیے تھے۔ اس وقت وہ مجھے ڈیمپارچ لاؤنج میں چھوڑ کر نہ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ میں اس سرزمین کو چھوڑنے سے پہلے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ پتہ نہیں کس طرح اس نے مکان اور دیگر اشیاء کے کاغذات میرے نام کروائے تھے ورنہ امیر خان تو ان باتوں سے منکر رہا تھا۔ پرواز کی روانگی کا اعلان ہوا تو اس کے آنے کی امید بھی ختم ہو گئی۔ آنے جانے والے چہروں کو دیکھتے ہوئے میں ہلکتے قدموں سے جہاز میں سوار ہو کر اپنی سیٹ تک پہنچی۔ ایک پھانس سی دل میں چہرہ رہی تھی۔ غم اور خوشی بیک وقت دونوں کیفیتوں سے دوچار تھی۔ کیا میں امیر خان کو یاد کر کے غمزدہ ہو رہی تھی لیکن اس

اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ

پیر شاہ محمد قادری

اللہ تعالیٰ کے عطیاتی ہوں ہے آپ کے مسائل کا حل



راہ نمائی کر سکتے ہیں؟ (نصیر۔ رینالہ خورد)
☆ عزیزم! آپ کے طویل خط سے یہ بات
ظاہر ہے کہ آپ تمام حالات اور واقعات کو اپنی
رائے اور ضرورت کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔
آپ کے تمام فیصلے مشروط ہو جاتے ہیں۔ میں یہ
کروں گا تو وہ یہ کرے گا۔ زندگی خلوص، محبت، ایثار

○ زندگی کے تمام معاملات میں مسلسل ناکامی کا
سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ ہر طرف سے مایوسی کا شکار
ہوں۔ کسی کے لئے کچھ کروں کوئی پزیرائی حاصل
نہیں ہوتی، جس کے ساتھ ٹنگی کرتا ہوں۔ ہدی ملتی
ہے، شادی میں تاخیر ہے کیونکہ تنخواہ اتنی کم ہے کہ
بیوی بچوں کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیا آپ میری کوئی

○ جیسا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان کے حالات امن و امان، بیرونگاری کے باعث خراب ہوتے جا رہے ہیں، لہذا میں بیرون ملک جانا چاہتا ہوں تاکہ میرے حالات بہتر ہو جائیں۔ مجھے کوئی اسم الہی تجویز فرمادیں۔ آپ کا سورۃ التائین کا آئینل بہت اچھا تھا۔ کیا ہم ان میں سے کسی عمل کو اپنی ضرورت کے مطابق پڑھ سکتے ہیں؟ (احمد فرقان۔ فیصل آباد)

☆ عزیزم! یقیناً ملک کے حالات بہت مخدوش ہیں لیکن اگر گھر کو سہارے کی ضرورت ہو تو کیا اسے چھوڑا جاتا ہے، انگریزی کہاوت ہے کہ جب جہاز ڈوبنے لگتا ہے تو سب سے پہلے چوہے بھاگتے ہیں۔ ہم اپنے نوجوانوں سے، صاحب کم و ذکاوت سے کہتے ہیں کہ وطن عزیز کو بچے منجھدار میں نہ چھوڑیں۔ بہادر بنیں اور ہر سطح پر ملک کی ترقی میں ہاتھ بٹائیں۔ آپ ہر نماز کے بعد 240 مرتبہ ”یا وہاب یا رافع یا رزاق یا قاح“ پڑھ کر دعا کریں۔

○ اللہ تعالیٰ اسباب مہیا کر دیں گے۔ ان شاء اللہ
○ میرا صاحب اکثر آپ کی خبریں اور آئینل اخبار میں پڑھتا رہتا ہوں۔ میرا ایک سوال ہے کہ ہر چیز اگر مقدر میں لکھ دی گئی ہے تو پھر دعا اور جدوجہد کی کیا ضرورت ہے؟ ہر شے کو ایک خاص سطح تک رہنا ہے تو پھر بھاگ دوڑ کا ہے کوئی جائے، امید ہے کہ آپ نے بُرائیاں مانا ہوگا۔ (محمد ندیم۔ گوجرانوالہ)

☆ ندیم میاں! اللہ تعالیٰ نے ہمیں محدود اختیارات اور لامحدود جدوجہد کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ ہمارے اعمال کے منتقلی نتیجے ہی ہماری تقدیر بنتے ہیں۔ لہذا جدوجہد نا صرف اپنی بقا بلکہ انفرادی اور اجتماعی ترقی کے لئے بھی ضروری ہے، اگر آپ ڈپریشن، خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں تو دل جمعی سے نماز پڑھیں اور ہر نماز کے بعد ”یا قاح یا رافع“

کے بغیر ناکمل ہے، آپ اپنی زندگی سے غرض کو نکال دیں۔ بے لوث مدد کریں۔ صرف مثبت احساس ہی زندگی میں خوشیاں عطا کرتا ہے آپ ”یا سلام یا قدوس یا کریم یا اللہ“ ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی زندگی کے منفی رُخ اعتدال پر آجائیں گے۔

○ میرے پانچ بچے ہیں اور سب کے سب انتہائی تالائق، ضدی، ہٹ دھرم ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کو کس طرح کی تہذیب اور تربیت دوں کہ یہ انسان بن جائیں۔ کوئی ایسا وظیفہ تجویز کر دیں کہ جس سے ان کے اندر تبدیلی پیدا ہو جائے اور وہ فرمانبردار ہو جائیں۔ (ریحانہ خالد۔ لاہور)

☆ بہن ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک ہم گھریلو تشدد پر قابو نہیں پائیں گے، بچوں کو عزت و احترام نہیں دیں گے، شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو فرد کی حیثیت سے تسلیم نہیں کریں گے، ہم کس طور سے بچوں کے بہترین انسان ہونے کی توقع کر سکتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ عمل اور برد باری کو اپناؤ، خوش اسلوبی سے گفتگو کرو، لیکن جو ماحول ہم بچوں کو دے رہے ہیں وہ نا تو دین کے مطابق اور نہ ہی اخلاقی معیار پر پورا اترتا ہے۔ باپ سگریٹ پیتا ہے اور بچے کو سگریٹ پینے پر دھتائی کر دیتا ہے، شوہر بیوی سے تنخواہ چھپاتے ہوئے اس سے سب کچھ بتانے کی توقع کرتا ہے۔

ساس و مادہ کو گرویدہ بنانے اور بہو کو بچہ کی جوتی بنانے کے گر سیکنے میں لگی رہتی ہے۔ کیا ہم اس سے بے خبر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ عظیم و خیر اللہ سب جاننے والا ہے اور ہم یہ جاننے کے باوجود اس کی نافرمانی کر کے اپنی اولاد کو فرمانبردار دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر نماز کے بعد 500 مرتبہ ”یا حامد یا کریم“ پڑھ کر دعا کریں۔ گفتگو میں نرمی اختیار کریں۔

نہیں آجاتا۔ ایک صحابی جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور ان کی عیادت کو ان کے دوست تشریف لائے تو انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا ”مجھے اپنی بیٹیوں کے خرچ اور معاملات کی فکر نہیں اس لئے کہ میں نے اپنی بیٹیوں کو سورۃ بقرہ سکھا دی ہے۔“ آپ بکثرت ”یا سلام“ پڑھا کریں اور ہر نماز کے بعد 115 مرتبہ ”یا سلام یا حنیف“ پڑھ کر دعا کیا کریں۔

○ میرے بچے اچھے سکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ محنت بھی خوب کرتے ہیں لیکن امتحانات کے دوران پریشان ہو جاتے ہیں، ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور جو آتا ہے وہ بھی ذہن سے نکل جاتا ہے۔ کوئی ایسا اسم الہی بتائیے کہ جس سے بچوں کا یہ تعلیمی مسئلہ حل ہو جائے۔ (محمد سلیم۔ رحیم یار خان)

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمارے بچوں کو دین و دنیا کے تمام امتحانات میں سرخرو فرمائے (آمین) ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ ”سورۃ الم نشرح“ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف۔

○ n رے پڑوس میں ایک خاتون رہتی ہیں۔ گذشتہ دنوں ان کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اس کو مولود بچی کو دودھ پلا رہی ہوں کہ اچانک میرا بیٹا آتا ہے اور کہتا ہے کہ امی ابو آگئے ہیں میں گھبرا کر بچی کو گود سے اتار کر جلدی سے گھر آ جاتی ہوں اور ڈرتی ہوں کہ میرے شوہر کو پتا نا چل جائے پھر آنکھ کھل جاتی ہے ایسے خواب مجھے اکثر آتے ہیں حالانکہ میرے اپنے پیارے پیارے بچے ہیں اور کوئی پریشانی بھی نہیں ہے۔ (طہہ سلطانہ۔ کراچی)

☆ عزیز بہن! یوں لگتا ہے کہ آپ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اخراجات کرتی ہیں جس کے باعث

313 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ معاملات آسان فرمائیں گے۔ ان شاء اللہ

○ مجھے اولاد نہینہ کی بہت آرزو ہے، اللہ تعالیٰ نے تین حد بھی بیٹیاں عطا کی ہیں اب آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ نام باقی رہنے کے لئے ایک بیٹا عنایت کر دیں۔ کوئی اسم الہی عطا کریں۔ (فہد عرفان۔ اسلام آباد)

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کی آرزو کو پورا فرمائے (آمین) لیکن نام کے لئے اولاد نہیں اچھے اعمال، انکار کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہمارے اور آپ کے آقا ﷺ کی صاحبزادی سے آپ ﷺ کی نسل پاک کا سلسلہ بڑھا۔ ابو جہل کے کتنے بیٹے ہونے کے باوجود کون اس کی ذریت میں سے ہونے کا دعویٰ کرتا ہے؟ داتا گنج بخشؒ نے شادی نہیں کی تھی لیکن ان کی علمی، تبلیغی، روحانی اور دین کی کاوشوں نے ان کا نام زندہ و جاوید کر دیا۔ آپ ہر نماز کے بعد ”یا کریم یا سلام یا وارث یا باقی“ 313 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف، اللہ تعالیٰ آپ کو گوہر مقصود عطا فرمائیں گے۔ ان شاء اللہ

○ کافی عرصے سے شدید ڈپریشن میں مبتلا ہوں۔ ہر وقت کچھ ہونے کا خوف، حادثے کا خوف ذہن پر طاری رہتا ہے۔ بچے اچھے خاصے بڑے ہیں وہ میری حالت پر کبھی افسردہ ہوتے ہیں کبھی چڑ جاتے ہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ ایک انجانا خوف دل کو لڑائے رکھتا ہے، میری نیگم بھی میری اس حالت سے بہت پریشان ہیں، کوئی ایسا اسم الہی تجویز کر دیجئے کہ میرے دل سے خوف نکل جائے۔ (راشد محمود۔ کراچی)

☆ برادرم! اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی پناہ میں رکھے اور ہر قسم کی بلاؤں، شر اور حادثات سے محفوظ رکھے (آمین) سیدنا علی مرتضیٰؑ کا ارشاد ہے کہ موت تمہاری حفاظت کرتی ہے جب تک کہ وقت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریز سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



جو اس سلسلے میں اکسیر کا اثر رکھتی ہے۔ سورہ تغابن کو زبانی یاد کر لیں تاکہ ادائیگی نماز میں سہولت رہے۔ (اس عمل کو بغیر اجازت نہ کریں)

وسعت رزق

رزق کی تنگی دور کرنے اور کشائش رزق کے لئے یہ عمل بہت مفید ہے۔

اس مقصد کے لئے پریشان حال شخص اپنا روز کا معمول یہ بنالے کہ بعد نماز عشاء اسی جگہ بیٹھ کر تین بار سورہ تغابن اول و آخر درود شریف سات سات مرتبہ پڑھ کر اللہ کے حضور دعا مانگا کریں۔ اس عمل کی بدولت ان کے رزق کی تنگی رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی (ان شاء اللہ) اور جلد ہی وہ بے حساب رزق کمانے والوں میں شمار ہوں گے اور یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ بے گمان رزق کہاں سے آتا ہے۔

حفاظت آسیب و بلا

اور خوف جنات

جس شخص کو کسی ایسی جگہ رہنے کا اتفاق ہو یا کسی سنان راہ سے گزر ہو اور آسیب و بلا، جنات کے خوف اور راستے کی آفات سے محفوظ رہنا چاہتا ہو تو حسب ذیل عمل اختیار کرے۔

اس مقصد کے لئے با وضو ہو کر ایک مرتبہ سورہ تغابن اول و آخر درود شریف تین تین مرتبہ پڑھ کر اپنے پورے جسم پر دم کرے اور پھر سورہ تغابن پڑھتا ہو اس راہ سے گزرتا چلا جائے۔ ان شاء اللہ ہر قسم کے آسیب، جنات اور بلاؤں کے شر سے محفوظ و مامون رہے گا۔ (عمل شروع کرنے سے پہلے اجازت لے لیجئے)

آپ ذاتی طور پر مالی مسائل کا شکار ہو جاتی ہیں، شوہر کی اجازت کے بغیر اس کی کمائی کو گھر سے باہر غیروں پر خرچ کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس طرز عمل کو ترک کر دیں آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہر نماز کے بعد 300 مرتبہ "یا قدوس" پڑھا کریں اللہ تعالیٰ ہم سب کو آسانیاں عطا فرمائے۔ آمین

○ سورہ التغابن کے اعمال اور فضیلت کے متعلق بتا دیجئے؟ (مومنہ عمران۔ لاہور)

☆ قرآن پاک مومنوں کے لئے شفا ہے یہ اللہ کا فرمان ہے۔ اس سورہ میں جو فضائل بیان کئے گئے ہیں ان کے مطابق ہم دینی اور دنیاوی معاملات میں آگے بیان کردہ وظائف سے مستفیض ہو سکتے ہیں (وما توفیتی الا باللہ)

بچیوں کی شادی

جو والدین اپنی بچیوں کی شادی کے مسئلہ پر بہت پریشان ہوں۔ شادی کے لئے رشتہ کہیں بھی، کسی بھی وجہ سے طے نہ پاتا ہو یا ہو کر ٹوٹ جاتا ہو تو اس کے لئے مندرجہ ذیل عمل بے حد فائدہ مند ثابت ہوگا۔

اس مقصد کے لئے لڑکی کے والدین میں سے کوئی ایک بعد نماز عشاء یا بعد نماز تہجد دو رکعت نماز اس طریق سے پڑھیں کہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ التغابن ایک مرتبہ پڑھیں۔ سلام پھیرنے کے بعد اللہ کے حضور گڑ گڑا کر دعا مانگیں۔ بفضل تعالیٰ سات یوم کے مسلسل عمل سے کہیں نہ کہیں رشتہ طے ہو جائے گا (ان شاء اللہ تعالیٰ) اچھے رشتے کے لئے یہ عمل اکیس یوم تک کریں اور ادارہ سے لوح شرف زہرہ منگوالیں۔

میر شاہ محمد قادری B-359، فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان

فون نمبرز: 35168036-35167842-42-92+

میل: ریحہ خط جواب کے لئے جولائی لٹافہ ہمراہ ارسال کریں۔

وقت ملاقات: ظہر تا عشاء (تحطیل جمعہ المبارک)

ہیم بیک

آخری لمحہ

مشری چلائی اور اس نے انور سے مجھے چھوڑنے کو کہا لیکن انور پر دولت کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ احساسِ جرم اور اس کے افشا ہونے پر اس کے اندر اتنی طاقت آگئی تھی کہ کوشش کے باوجود میں اپنی گردن نہ چھڑا سکا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ ایک ہاتھ سے وہ میری گردن دیوے دوسرے ہاتھ سے مجھے گھونے مار رہا تھا۔

ایک بازاری عورت کی کہانی، وہ اپنی محبت کی تذلیل برداشت نہ کر سکی

لیکن میرا ذاتی خیال قدرے مختلف ہے۔ ناامیدی کے سمندر میں کنارے کی تلاش بہر حال زندگی کا ایک روشن پہلو تو ہے چاہے ساری عمر ہی اس میں گزر جائے۔ یہی حال کچھ ان دنوں میرا تھا۔ میں نے بچپن ہی سے غربت کے ساتھ سمجھوتہ نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ منزل کشن تو ضرور تھی لیکن

جب انسان خوش قسمتی اور بد نصیبی کے درمیان مقدر کے تھے ہوئے رستے پر مسلسل چل رہا ہو، پل بدلنے والے حالات اس موڑ پر لے آئیں کہ بالآخر وہ بھرے میلہ میں متوازن رہنے کی کوشش کے آخری لمحے پر رستے سے چھلانگ لگانے پر مجبور ہو جائے آپ اسے کیا کہیں گے۔ موت کی خواہش یا پر امن نئی زندگی۔



بہر حال شاید اس دن قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ایڈیٹر ذکاء الدین حسب معمول اپنی سیٹ پر براجمان کاغذوں کے ڈبیر میں اپنی قسمت کا ستارہ ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے میری آمد کو محسوس تو کیا لیکن خاموش رہے بلکہ ایک پلندہ میری طرف کھسکا کر مسکرانے لگے جو اب مجھے بھی مسکرانا پڑا۔

”آج بہت خوش اور مسکرا رہے ہو“ انہوں نے خوشدلی سے سوال داغ دیا۔

”جی ہاں آج بالے نے شام کو پانچ بجے چائے کی دعوت دی ہے، اس لیے خوش ہوں“ میں نے اذراؤ کفن ہلکے ہلکے انداز میں انہیں چھیڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسی دعوتیں وہ کبھی رو نہ کرتے تھے اور میں کبھی قبول نہ کرتا تھا۔ وہ تو سہا جلدی میں سب کچھ ہو گیا۔

”تو چلو ٹھیک ہے، میں بھی ساتھ چلوں گا“ مجھے تمہاری دعوت قبول ہے۔“ انہوں نے دعوت اس طرح قبول فرمائی کہ میری روح قتا ہو گئی۔ بہر حال قہر درویش برجان درویش۔ چونکہ انہوں نے کافی دنوں سے مجھے دباؤ میں رکھا تھا لہذا اس سرکاری دباؤ کو ختم کرنے کے لیے میں نے جواباً منع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

شام کے سائے جب لمبے ہونے لگے تو مجھے اچانک بالے کی دعوت یاد آئی۔ وقت دیکھا تو تقریباً پانچ بج رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اپنے کاغذات کو سنبھالا اور ذکاء الدین کی طرف دیکھا تو وہ کسی خاتون سے فون پر باتیں کر رہے تھے۔

باتیں کیا تھیں، بس یہ طرفہ داستانِ عشق تھی جو مجھے تازہ ہو چکی تھی اور یہ ان کا کمال تھا کہ کام کی زیادتی میں بھی وہ عشق کے لیے کچھ وقت نکال لیتے تھے۔

میں نے انہیں اپنی کلائی کی طرف گھڑی دکھاتے ہوئے اشارہ کیا تو انہوں نے جلدی سے سر ہلایا اور

میں ابھی مایوس نہ ہوا تھا۔

ان دنوں میں نے سرکاری ملازمت کے کوارٹرز میں ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا اور کچھ فاصلہ پر میرے اخبار کا دفتر تھا۔ صبح دیر سے اٹھتا، تیار ہو کر نذیر ٹی شال سے صبح کا ناشتہ کرتا اور پھر دفتر کی طرف چل پڑتا۔

میں تیز قدموں سے اپنی رفتار کو بدھاتا ہوا ٹھنڈی سڑک عبور کر رہا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے بالے نے مجھے آواز دی۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ساتھ آگے آنے کو کہا۔ میں دراصل رکنا نہیں چاہتا تھا۔ بالے نے چلتے چلتے میرا حال پوچھا اور شام کو نذیر ٹی شال پر چائے کی دعوت دے دی۔

مجھے یہ احساس مارے جا رہا تھا کہ آج شاید اخبار میں میرا آخری دن ہوگا کیونکہ ایڈیٹر ذکاء الدین نے مجھے کل شام ہی وارننگ دی تھی کہ اگر کل بھی دیر سے آئے تو اپنی نوکری کا آخری دن سمجھنا۔ لہذا بالے کی دعوت پر میں فوری طور پر کوئی رد عمل ظاہر نہ کر سکا اور ہوں، ہاں ہی کرتا رہا لیکن اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے دیکھ کر مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ ملاقات ضرور ہوگی۔

محمد اقبال جسے محلہ میں سب لوگ بالے کے نام سے جانتے تھے کو میں بہت زیادہ تو نہیں جانتا تھا لیکن جو کچھ ادھر ادھر سے معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ وہ اس میدان میں کچھ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ تاہم اس کے ثباتِ باث دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ عورتوں کی دلالی کرتا ہے۔

ان دنوں میں اچھی خاصی مالی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ ایک تو لکھیل تنخواہ اور کمرے کا بدھتا ہوا کرایہ اور بل وغیرہ اور روزمرہ کے اخراجات الگ۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ زندگی کی بھاگ دوڑ میں

اسی اثناء میں ایک چمکدار ہلکے نیلے رنگ کی گاڑی کو اپنے پاس رکتے دیکھا۔ جھانکا تو معلوم ہوا کہ کالا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہاتھ سے اشارے کر رہا تھا۔ میں نے فوراً ذکاء الدین کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بھی شاید ہالے کو دیکھ لیا تھا۔ آؤ دیکھنا تاؤ انہوں نے جھٹ سے اگلی نشست کا دروازہ کھولا اور دم سے حسب عادت بیٹھ کر اپنی سانس درست کرنے لگے۔ جب میں نے آٹا فانا یہ ہوتے دیکھا تو ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوعا۔ کیوں نہ میں بھاگ لوں لیکن راستے مسدود تھے لہذا ارادہ ملتوی کیا اور پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

”شاعر صاحب“ ہالا ہمیشہ مجھے شاعر صاحب کہہ کر پکارتا تھا ”میں نے سوچا کہ آپ کو دیر ہوئی ہے تو کیوں نہ میں خود حاضر ہو جاؤں۔ یہ سوچ کر دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ نکل چکے ہیں۔ میں نے آپ دونوں کو سیڑھیوں سے ہی دیکھ لیا تھا کہ آپ کی گاڑی کا دروازہ نہیں کھل رہا تھا چنانچہ اپنی گاڑی نکال لایا ہوں۔“

میں نے اسے خاموش کرنے کے لیے ذکاء الدین کی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگا: ”ہاں جی میں ذکاء الدین صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ہمارے مہربان ہیں۔ مشتری ہائی کے اشعار کی اصلاح فرماتے تھے اور اس کے کوشے پر ملاقات بھی ہو چکی ہے بہت اچھے انسان ہیں۔“

یہ خبر میرے لیے ایک دھماکہ سے کم نہ تھی لیکن میں نے کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا لیکن ذکاء الدین نے راز افشا ہوتے ہوئے خفت مٹانے کے انداز میں ایک زوردار دھپے ہالے کے کندھے پر مارا اور کہا: ”اپنے شاعر صاحب بھی کچھ کم نہیں ہیں“ ان کا اشارہ میری طرف تھا۔ ”لیکن اپنی ملاقاتیں خفیہ رکھتے ہیں وہ تو اتفاق سے انہوں نے تمہارا نام لیا تو

”تو میں تو بھول ہی گیا تھا کہ آج تم نے چائے کی دعوت دی ہے“ ذکاء الدین جیسا ذہین اور طبعی شخص آج تک میری نظروں سے نہ گزرا ہوگا۔ اس قدر خوبصورتی کے ساتھ بات کو اپنی مرضی کے مطلب پہنانے میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ اب ہالے کی دعوت خود بخود میری دعوت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ خوف مجھے یہ تھا کہ ساتھ میں انہوں نے رات کا کھانا بھی اسی طرح قبول فرمالینا ہے کہ میری ایک ہفتہ کی تنخواہ تو اس پر اٹھ جاتی۔ اب کچھ نہ ہو سکتا تھا لہذا ان کا ساتھ دینے میں ہی عافیت سمجھی۔ ہم دونوں جب دفتر سے نکلے تو پانچ سے اوپر کا وقت تھا چونکہ فاصلہ زیادہ نہ تھا اور ذکاء الدین کی ”حینہ“ مٹی میں اُٹی اپنے ٹائروں پر صدیوں کی دھول بجائے سڑک کے پارٹ پاتھ کے ساتھ ایستادہ تھی جسے وہ بزمِ نشاط ”میری جان“ کہتے تھے اور دفتر والوں نے اس کا نام ”حینہ“ رکھ چھوڑا تھا۔ حینہ کا کوئی دروازہ باہر سے نہ کھلتا تھا۔ وہ چابی سے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے، دم سے سیٹ پر براجمان ہوتے، اپنی سانس درست کرتے اور پھر باری باری اندر سے تمام دروازے کھولتے۔

اس بار بھی یہی مشق دہرائی جانی تھی لیکن بد قسمتی سے پہلا قدم ہی بوجھل ہو گیا۔ کافی دیر تک چابی چاروں طرف گھمانے کے باوجود دروازہ نہ کھلا۔ میں گاڑی کی دوسری طرف کھڑا نہیں دیکھ رہا تھا۔ جب ذکاء الدین کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوتے دیکھے تو میں ان کی طرف چلا گیا اور ان کے ہاتھ سے چابی لے کر خود دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

ذکاء الدین نے دوبارہ چابی تھامی اور قدرے غصے سے ایک جھٹکا دیتے ہوئے دروازے کے ہینڈل کو خوب جھنجھوڑا مگر آج ”میری جان“ نے ہاں کرنے سے انکار کر دیا۔

کہ میں تقریباً اس کام سے توبہ کر چکا ہوں۔ اب مجھے ہر لڑکی مشتری ہائی لگتی ہے۔ کیا شریف انفس عورت تھی۔“

”طوائف اور شریف؟“ ذکاء الدین نے استفہامیہ انداز اختیار کیا ”دونوں ایک ساتھ کیسے۔“

”ذکاء الدین صاحب! آپ یقین کریں مشتری ہائی اندر سے ایک انتہائی شریف عورت تھی۔ آج تک کسی نے اس کے اندر جھانک کر نہ دیکھا تھا۔ یہ پیشہ تو اس نے وراثت میں پایا تھا۔ اسی طرح جس طرح دنیا میں اکثر لوگ وراثت میں پیشہ قبول کرتے ہیں۔ آپ تو شاعری کی اصلاح کرتے تھے کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا۔“

”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو“ ذکاء الدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”لیکن اس طرح ان لڑکیوں کا کیا بنے گا جو تم سے ہمیشہ منسلک رہی ہیں۔ انہیں تو اپنی بھوک مٹانی ہے۔“

”کس کی؟“ ہالے نے مسکرا کر پوچھا۔

”اپنی اور اپنے گاہکوں کی۔“

”ہاں کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں لیکن حالات نے یہاں لاکھڑا کر دیا ہے۔“

اتنے میں چائے آگئی تھی۔ میں نے ایک کپ کو سرکا کر نزدیک کر لیا۔ بھاپ اٹھتی چائے کے کپ پر نظر جمائے ہالے کی باتوں پر چشم تصور میں اپنے گاہکوں سے دور ہوتی ان لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔

”شاعر صاحب! آج آپ خاموش ہیں“ ہالے نے میری طرف ٹیک کا کھڑا ہوا حاتے ہوئے کہا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ اس معاملے میں بد نصیب کون ہے تم یا تمہاری لڑکیاں یا وہ گاہک جو اپنی بھوک مٹانے اس بازار میں چلے آتے ہیں۔“

میری فلسفیانہ گفتگو شاید ہالے تو نہ سمجھ سکا لیکن ذکاء الدین نے فوراً ٹوکا۔

میں نے سوچا آج میرانی یادیں تازہ کر لیں۔ تم سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور مشتری ہائی کا حال بھی تم سے پوچھ لیں گے۔“

”ذکاء الدین صاحب! مشتری ہائی کا نہ پوچھیں تو بہتر ہے“ ہالے نے قدرے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا مشتری ہائی کو؟“ ذکاء الدین حیرت سے پوچھے۔

”ذکاء الدین صاحب یہ ایک لمبی داستان ہے پھر کسی روز آپ کو سناؤں گا۔ مختصر آدھ منوں مٹی تلے دب چکا ہے۔ میرا مطلب کہ وہ مر گئی ہے“ ہالے کے چہرے پر غم کے سائے لہرا گئے۔

”لیکن کیسے؟ وہ کافی جوان اور صحت مند تھی“

ذکاء الدین مزید حیرت زدہ ہو گئے۔

”بچی تو بات ہے، جب جوان اور خوبصورت قاتلہ خود قتل ہو جائے تو بہت افسوس ہوتا ہے“ ہالے نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

گوکہ میں نے مشتری ہائی کو کبھی نہ دیکھا تھا لیکن اس طرح سے اس کا ذکر ہوا تو میں بھی افسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ لہجہ بھر کو گاڑی میں سکوت ہو گیا۔ ہم تینوں چلتی گاڑی سے سڑک پر شام کی دھند میں مدھم روشن سٹریٹ لائٹ کے نچے قطار در قطار گزرتے دیکھ رہے تھے کہ ندیم ٹی شال آگیا۔ مشتری ہائی کے ذکر سے ماحول کسی قدر سوگوار ہو چکا تھا۔ ہالے نے چائے کا آرڈر دیا اور ساتھ ہی کچھ کھانے کے لیے لائے گا کاڈکٹر پر بیٹھے ندیم سے کہہ دیا اور ہم تینوں ایک میز پر براجمان ہو گئے۔

”ہاں تو کہو ہالے تمہارا کام کیسے چل رہا ہے“

ذکاء الدین نے گفتگو کی ڈور پکڑنے کی کوشش کی۔

ذکاء الدین صاحب! کیا بتاؤں۔ مشتری ہائی کے مرنے کے بعد اب کام میں جی نہیں لگتا۔ یہ سمجھو

منافع ہو گیا ہے

سیارہ ڈائجسٹ

* کی ایک اور عظیم ایمان افروز پیش کش

سرکونین کی 63 سالہ زندگی کے دوران وقوع پذیر ہونے والے سینکڑوں معجزات پر مشتمل

معجزات رسول اللہ ﷺ

ان معجزات کے ذریعے

لا تعداد انسانوں کے لیے راہ ہدایت روشن ہوئی اور
دنیا سے انسانیت پر چھائی ہوئی کفر و جہالت کی تاریکیاں سمیٹی چلی گئیں۔

ایک ایک اظہارِ حقیقت بہت ادب و احترام اور علم و عرفان کی خوشبو سے جانداروں کو مسحور

500 صفحات پر مشتمل نفیس کاغذ، عمدہ کمپیوٹر کمپوزنگ اور دیدہ زیب مرقع

”یہ تو آپ نے ٹھیک کہا ہے“ بالے نے ذکاء الدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اسی طرح طوقان میں گھری مشتری بائی اپنے ہاتھوں سے جان ہار بیٹھی۔“

”تم نے ابھی کہا ہے کہ وہ قتل کردی گئی ہے اور اب تم کچھ اور کہہ رہے ہو۔“ ذکاء الدین کے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر بالے قدرے گھبرا سا گیا۔

”ذکاء الدین صاحب! سچ پوچھئے تو اس نے خودکشی کی ہے نہ وہ قتل ہوئی ہے۔“

”یہ صرف مقدر نے اس کے ساتھ کھیل کھیلایا ہے۔ یہ صرف میں جانتا ہوں یا وہ قاتل۔“ بالے کو سچ بتانا پڑا۔

”اب میں آپ کو تمام واقعہ سناتا ہوں اور فیصلہ آپ کریں“ بالے نے ہلکی سی آواز بھرتے ہوئے کہا۔

سچ تو یہ ہے کہ مشتری بائی سے انور نامی ایک شخص محبت کا بہت بڑا دعویدار تھا۔ مشتری بھی اس پر

جان دیتی تھی۔ دونوں بظاہر شادی کے خواہش مند تھے کیونکہ مشتری عزت کی زندگی گزارنے کے لیے

تڑپ رہی تھی۔ میں نے کہا تھا آپ سے کہ وہ اندر سے ایک شریف انفس عورت تھی لیکن اس کے

گھروالے میرا مطلب کہ اس کی ماں یہ سنہری چڑیا اپنے ہاتھ سے اڑانے پر تیار نہ تھی۔ مشتری کی ماں

نے مجھے بھی تمام حالات بتائے اور مجھ سے مدد کی درخواست کی تھی۔ میں اس معاملے میں پڑنا نہیں

چاہتا تھا لیکن کیا کرتا اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا کیونکہ میں بھی مشتری سے محبت کرتا تھا لیکن اس

سے شادی نہ کر سکتا تھا۔ میں بازار کے اصولوں سے واقف تھا۔ میں ایسا کرتا تو قتل کر دیا جاتا۔

یہ سوچ کر میں ایک دن مشتری کو سمجھانے کی غرض سے باہر لے گیا اور راستے بھر اس کو سمجھاتا رہا

لیکن مشتری کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ یہ وہی دن تھا

نایاب مچھلی

انڈونیشیا کو اپنے ہزاروں خوبصورت جزائر اور سمندری مخلوق کی وجہ سے دنیا بھر میں منفرد پہچان حاصل ہے۔ سمندری مخلوق میں پرندوں جیسی شکل رکھنے والی مانتارے مچھلی کی خفیہ دنیا اب تک انسانوں کیلئے ایک معرہ ہی رہی ہے تاہم اب انڈونیشیا کا سمندر مانتارے مچھلی کی محفوظ پناہ گاہ بننا چاہ رہا ہے۔ انڈونیشیا میں ایک مانتارے مچھلی کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہے۔ مانتارے نامی یہ مچھلی 23 فٹ تک لمبی ہوتی ہے جو زیر سمندر چھوٹی چھوٹی سمندری مخلوقات کو کھا کر گزارہ کرتی ہے۔ یہ مخصوص مچھلی کسی خاص گہرائی کے حامل سمندر میں نہیں رہتی بلکہ یہ ایک سمندر سے دوسرے سمندر میں ہجرت کرتی رہتی ہے۔ یہ مچھلی اکثر خود شادک مچھلیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

(مرسلہ: ندیم خان۔ کراچی)

جواہر پارے

تین واؤ (و) کو اپنا میں عزت پائیں۔

وقت و وعدہ وفا

صحافیوں میں جب تک چہ (ک) کو نہ اپنایا جائے خبر نہیں بنتی۔

کیا کیوں کب کیسے کہاں کتنے

غلام نبی عارف/ایہ

”چلو تم آگے بڑھو اور کسی ایک کی بد نصیبی ختم کر دو۔ ارے شاعر صاحب! اس دنیا کا نظام اسی طرح چلتا ہے۔“

ہم سب بیک وقت خوش نصیبی اور بد نصیبی کے طوقان میں گھرے اپنی اپنی ذات کو ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



بتایا کہ ہمیں پہلے گول قبرستان جانا ہے۔ میں چونکا کہ گول قبرستان؟ لیکن میں سرشاری میں کچھ بول نہ سکا۔ سوچا کہ شاید میرے ساتھ جانے سے پہلے اپنے کسی جدا محمد کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتی ہے۔

ابھی ہم قبرستان کے دروازے پر ہی تھے کہ مجھے انور نظر آیا۔ میں نے مشتری کی طرف دیکھا وہ مسکرائی اور رکنے کو کہا، میں نے گاڑی روک لی۔ انور حیرتوں سے چلتا ہوا گاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ ہم قبرستان آئیں گے۔

میں نے ساتھ بیٹھی مشتری کی طرف دیکھا۔ مشتری مسکرائی اور کہنے لگی ”ہاں ہالے میں نے انور کو بلایا ہے“ مشتری کے چہرے پر اتنی رونق اور خوشی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں حیران تھا کہ مشتری میرے ساتھ بھاگ رہی ہے یا انور کے ساتھ۔ اتنی دیر میں انور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ میرے لیے یہ کچھ غیر متوقع تھا لیکن میں خاموش رہا۔ انور نے اندر بیٹھتے ہی سگریٹ سلگائی۔

”شاعر صاحب! آپ کو پتہ ہے کہ میں سگریٹ سے نفرت کرتا ہوں۔ اکثر آپ کو بھی منع کرتا رہا ہوں۔ آدمی دنیا بھر کے کام کرے لیکن سگریٹ نہ پئے تو مجھے بخشا گیا ہے۔“ یہ اس کی ایک عجیب منطق تھی جو مجھے کبھی سمجھ میں نہ آئی۔ بہر حال اس بات پر میں نے اپنی سگریٹ سلگائی اور ہالے کو اپنا بیان جاری رکھنے کو کہا۔

”ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ یہ میری انور سے پہلی اور آخری ملاقات تھی“ ہالے نے وہیں سے بات دوبارہ شروع کر دی۔ گاڑی میں چند لمحے سکوت طاری رہا پھر مشتری نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور محبت سے بولی ”ہالے تم نے اپنی محبت ثابت کر دی ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں اور ساری عمر

جب میں نے بھی اپنا حال دل اسے کہہ ڈالا لیکن مشتری کے دل پر تو انور کا راج تھا۔ وہ کسی قیمت پر اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی لیکن ایک عجیب بات اس دن ہوئی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں تو اس نے مجھ سے قسم لی کہ اگر تمہاری محبت بچی ہے تو تم میرا ایک کام کرو۔ میں نے جذبات کی رو میں کہہ دیا کہ میں تو تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی کہ تم اپنی گاڑی لے کر اگلے جمعہ کی صبح گھر آ جانا میں تمہارے ساتھ چلوں گی اور پھر ہم بعد میں سوچیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔“

ہم دونوں بڑے انہماک سے ہالے کو دیکھ رہے تھے۔ ہالے کے چہرے پر کرب اور غصوں کے سائے ظاہر تھے لیکن ملال کسی طرح کا نہ تھا۔

چونکہ معاملہ دلچسپ بھی تھا۔ ذکاء الدین نے چائے کی چمکی لیتے ہوئے کہا ”پھر تم مجھے۔“

”ہاں جناب میں وعدہ کر چکا تھا“ ہالے نے کہا۔ میں اب پوری توجہ سے کہانی کے اگلے موڑ کا انتظار کر رہا تھا کہ ہالے نے کہنا شروع کیا۔

”میں جب اگلے جمعہ کی صبح اس کے ہاں پہنچا تو مشتری تیار تھی۔ ایک چھوٹا سا بیگ اس کے ہاتھ میں تھا جس میں شاید اس کے زیور اور کیش وغیرہ تھا۔“

”شاعر صاحب“ اس نے پہلی دفعہ مجھے براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا ”جب وہ میرے سامنے آئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر خوبصورت تھی۔ نکھری نکھری سی بغیر میک اپ کے، میں تو اسے ہمیشہ رات کے گہرے سایوں میں میک اپ کیے بدھم روشنی میں دیکھتا تھا۔ دن میں کبھی اتفاق ہی نہ ہوا تھا۔ شاعر صاحب! وہ ملکہ تھی ملکہ آپ یقین کریں۔“

میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہونے لگا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھایا اور چل پڑے۔ مشتری نے مجھے

لیکن انور میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر بھی ہانکل نہ گھبرایا۔ اس نے بڑھ کر پیچھے بیٹھے ہوئے ہی اپنے مضبوط بازو سے میری گردن دبوچ لی۔ میرا سانس رکنے لگا۔ مشتری چلائی اور اس نے انور سے مجھے چھوڑنے کو کہا لیکن انور پر دولت کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ احساس جرم اور اس کے افشا ہونے پر اس کے اندر اتنی طاقت آگئی تھی کہ کوشش کے باوجود میں اپنی گردن نہ چھڑا سکا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ ایک ہاتھ سے وہ میری گردن دبوچے دوسرے ہاتھ سے مجھے گھونے مار رہا تھا۔ میں شدید مزاحمت تو کر رہا تھا لیکن میں اس کے پیچھے سے حملے میں پوری طرح گرفت میں آچکا تھا۔

اس اثناء میں مشتری نے اچانک میرے پستول والے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر اپنے سینہ پر رکھ لیا اور چلا کر انور سے کہا کہ وہ مجھے چھوڑ دے ورنہ وہ اپنے آپ پر گولی چلا دے گی۔ انور نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ”مجھے تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔“

شاعر صاحب، یہی وہ آخری لمحہ تھا جب خوش قسمتی اور بد نصیبی کے طوفان میں بدبختی نے سراٹھایا تھا۔

مشتری انور کی زبان سے محبت کی یہ تذلیل نہ سہ سکی اور اس نے ٹرنگر دبا دیا۔ گولی سیدھے اس کے سینے میں اتر گئی اور خون کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ یہ کہہ کر بالا خاموش ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”مشتری نے پولیس کے سامنے اپنے نزہی بیان میں مجھے بچا لیا تھا۔ انور جیل میں زیورات چھیننے اور ارادہ قتل کے الزام کا سامنا کر رہا ہے اور اب آپ ہی کہیے کہ یہ خودکشی ہے یا قتل، بد نصیبی ہے یا خوش قسمتی۔“



تمہیں یاد رکھوں گی۔ ایک محسن کی طرح تم نے میری عزت.....“ انور شاید جلدی میں تھا۔ اس نے مشتری کی بات کاٹ دی اور پوچھا کیا تم وہ بیک لے آئی ہو؟“

”ہاں ایہ رہا“ یہ کہہ کر مشتری نے اپنی گود سے بیک اٹھا کر انور کو پیچھے دے دیا۔

”شاعر صاحب ایہ وہ پہلا لمحہ تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ انور کس قماش کا آدمی ہے، آپ سمجھتے ہیں نا۔“

میں نے مشتری کو متنبہ کرنے کے لیے اشارہ کیا کہ وہ گاڑی سے باہر میری ایک بات سن لے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مشتری اپنی اندھی محبت میں ماری جائے۔ میں اس سے کچی محبت کرتا تھا اور اس کا مدد گار بھی تھا۔

انور نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن خاموش رہا۔ اتنے میں مشتری بولی ”بالے، لگر نہ کرو، انور اپنا ہے جو کچھ کہنا ہے یہیں کہہ دو لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ انور کے سامنے نہ کہہ سکتا تھا۔ مجھے اس کی نیت کا فہم نظر آ گیا تھا۔ بازار میں رہتے ہوئے بازار کے دام معلوم رکھتا تھا۔ انور بھی کچھ سمجھ سا گیا تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا۔

اس نے برا سامنہ بناتے ہوئے مشتری سے کہا کہ چلو نیچے اترو۔ ہم خود چلے جائیں گے۔

بس شاعر صاحب ایہ دوسرا لمحہ تھا کہ میں مشتری کو یوں لٹے اور برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے بھرا ہوا پستول نکالا جو احتیاطاً اپنے ساتھ رکھتا تھا اور میں نے انور سے کہا کہ وہ مشتری کا بیک واپس کرے اور گاڑی سے اتر جائے۔“

بالے نے قدرے میری طرف جھکتے ہوئے انسوس سے کہا۔

میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مشتری گھبرا گئی



شوکت افضل

گمانِ دوتا

ایک شخص کی دگداز کہانی، جس نے جنتِ نظیر زندگی کا خواب دیکھا تھا



شوکت افضل حسب معمول اس بار بھی قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے لیے ایک شاہکار کہانی لیکر آئی ہیں۔ یہ کہانی ایک ایسے شخص کی ہے جو شادی سے قبل ایک کھلنڈ راکس زادہ تھا مگر اُس نے ایک جنت نما ازدواجی زندگی کا خواب ضرور سجا رکھا تھا۔ تلاشِ بیاد کے بعد اُسے اپنی پسند کی شریکِ حیات تو مل گئی مگر شادی نے اُس کی زندگی یکسر تبدیل کر کے رکھ دی ہے..... کہانی کے کردار انتہائی مضبوط اور پلاٹ جاندار ہے، یہی وجہ ہے کہ قاری ایک بار پڑھنا شروع کرنے پر کہانی کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔

میں تو وہ ایک پختہ عمر کی موٹے شیشوں کی عینک لگائے ایک نہایت ہی سنجیدہ اور مدبر صورت ہیڈ مسٹرئیس کے سامنے جا رہا تھا مگر آفس ٹیبل کے پیچھے رکھی کرسی پر ایک نوجوان نرم و نازک سی حسین لڑکی

محسن کو پرنسپل کے آفس کے سامنے کھڑے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ چڑا سی نے اسے اندر جانے کو کہا۔ وہ چار سالہ ننھے عاصم کی انگلی تھامے نہایت مودب انداز میں آفس میں داخل ہوا۔ اپنے خیال

بولاً ”آپ مس.....؟“ وہ مسکراتی ہوئی سوالیہ نظروں سے اسے گھور کر رہ گیا۔

”مس فرزانہ“ ایک لائق سے لہجے میں میڈم نے فقرہ کھل کر دیا تو ”اودہ“ کہہ کر محسن زیر لب مسکراتے ہوئے خاموشی سے قارم بھرنے لگا۔ کمرے میں کھل خاموشی تھی۔ صرف کلاک کی ٹک ٹک وقت کے آگے سرکنے کا پتہ دے رہی تھی۔ جب فرزانہ نے رجسٹر بند کر کے نظر اوپر اٹھائی تو پھولے پھولے سرخ گالوں اور موٹی موٹی آنکھوں والے ننھے سے پیارے عاصم پر نظر جا پڑی جو اسے بغور دیکھے جا رہا تھا۔ اسے اس بچے پر بے تحاشا پیار آ گیا۔

”یہاں آؤ بیٹے کیا نام ہے آپ کا؟“ وہ اسے پاس بلا تے ہوئے چکار کر بولی۔

”عاصم“ بچے نے قدرے شرما کر جواب دیا۔
”شاباش! ادیری گڈ بوائے، اچھا آپ ابھی اپنی کلاس میں جائیں گے؟“

مس فرزانہ کو عاصم سے باتیں کرتا سن کر محسن نے لکھتے ہوئے سر اٹھایا اور دیکھا کہ خوشنما چہرے سے متانت کا نقاب سرک کر اس پر مسکراہٹ کا گلاب کھل اٹھا ہے اور سرد آنکھوں سے پیار کی شعاع نکل کر تمام وجود کو منور کر گئی ہے۔ اس نے دلچسپی سے مس فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بھرا ہوا قارم اس کے آگے رکھ دیا۔ مس فرزانہ نے قارم پڑھنے کے بعد گھنٹی بجا کر چڑا اسی کو بلایا اور بچے کے ساتھ زمری کلاس تک جانے کو کہا۔ محسن نے محسوس کیا کہ اب پھر سنجیدگی اور اجنبیت کی برف سی مس فرزانہ کے چہرے پر جمنے لگی ہے۔

”آف..... اس لڑکی کے بھی کتنے روپ ہیں؟“
محسن نے ٹھنڈا سانس بھر کر سوچا ”ایک منٹ میں گھرے ہوئے نیلے آسمان کی طرح نظر آتی ہے تو دوسرے ہی لمحہ اجنبیت کی دھند میں چھپ جاتی ہے۔“

کو بیٹھا دیکھ کر چونک سا پڑا، جو کہ اپنے شوخ سراپے پر سنجیدگی کا خول چڑھائے غروٹی سفید انگلیوں میں فون کا ریسیور تھامے کسی سے بات کرنے میں مصروف تھی۔ اس کا ہاتھ اتنا از محسن کو کھلنے لگا گویا وہ یہ سب محض ”پوڑ“ کر رہی ہو۔ وہ کھٹکی ہاندھے دلچسپی سے اسے دیکھ رہی رہا تھا کہ اس نے فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ کر نہایت متانت سے اپنی دراز پلکیں اٹھا کر محسن کو دیکھا اور پھر ہاتھ سے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی:-

”جی فرمائیے۔“

”وہ جی میڈم دراصل اس بچے کو میں نے زمری میں داخل کر دانا ہے۔“ وہ بیٹھ جانے کے بعد ننھے عاصم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، جو اس وقت اس کے گھٹنے سے لگا نہایت محسوس اور بھولی بھالی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

میڈم نے بات سننے ہی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔
چڑا اسی تیزی سے اندر داخل ہوا۔

”جی صاحب!“ چڑا اسی نے مستعدی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو عبدالرشید کلرک سے داخلے کا قارم لے آؤ“ میڈم کی بات سننے ہی چڑا اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ تو محسن نے میڈم کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”معاف کیجئے گا میڈم کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ ہی ہیڈ مسٹریس ہیں؟“

”جی نہیں وہ رخصت پر ہیں“ وہ محسن کی نظروں کی قیادت سے بچنے کے لیے دوسری طرف دیکھتے ہوئے مختصر بولی اور پھر رجسٹر کھول کر سامنے رکھ لیا۔
چڑا اسی قارم لے کر آیا تو میڈم نے سرسری نگاہ سے دیکھتے ہوئے قارم محسن کے آگے سرکا دیا اور بولی۔

”پلیز! اس قارم پر مطلوبہ معلومات درج کر دیجئے۔“
”جی اچھا“ محسن قارم کو ہاتھ میں لیتے ہوئے

کہ آپ تو بیدل گھر جائیں اور ہم کار میں بیٹھ کر قریب سے فرار لے بھرتے ہوئے گزر جائیں۔ یہ تو سراسر بے ادبی ہوئی نا۔“ محسن نے بات بناتے ہوئے نہایت خوشدلی سے کہا۔

”بہت بہت شکریہ! مسٹر.....؟“

”محسن“ محسن نے جھک کر شفقی سے جملہ پوچھا کیا۔
 ”ہاں تو مسٹر محسن آپ کی اس دینی خدمت اور قدر افزائی کا شکریہ! مگر پلیز آپ میرا راستہ چھوڑ دیں۔ لوگ خواخواہ مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ میں جس حال میں بھی جاری ہوں، اس سے آپ کو کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔ براہ کرم آپ اپنے کام سے کام رکھیں اور اپنا راستہ ناپیئے۔“ وہ کئی گزرا کر چیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

محسن بالپس ہو کر کار میں آکر بیٹھ گیا۔ چند فرلانگ تک تو ہلکی رفتار کے ساتھ فرزانہ کے ساتھ چلا رہا مگر جب اس کو ٹریفک سنگٹل پر ڈکنا پڑا تو فرزانہ بھیڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اور آج پھر محسن کو محسوس ہوا کہ وہ انجانے میں ہی اس پر پیچ سی سڑک پر آکلا ہے۔ جہاں سے فرزانہ روزانہ سکول سے واپسی پر گزرتی ہے۔ ابھی سکول بند ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اس نے کار ایک طرف کھڑی کر دی اور وقت گزاری کے لیے کار کا کیسٹ ریکارڈ آن کر کے سیٹ پر پشت لگا کر آنکھیں بند کر لیں مگر پھر بے چین سا ہو کر فوراً ڈور تک نظریں دوڑانے لگا۔ کار کے ڈیش بورڈ سے کسی نکالی اور کار کے آئینے میں دیکھ کر ہال سنوارنے لگا اور کنگھی رکھتے ہوئے غصت سے مسکرا بھی دیا کہ اس طرح سر رہا ہال سیٹ کرنا خاصا لوفرانہ کام ہے۔

”پڑ کیا کریں مجبوری ہے صاحب“ وہ زیر لب بڑبڑایا اور پھر سگریٹ سٹاک کر لیے لیے کش لیتا ہوا

”شکریہ میڈم“ محسن نے کھڑے ہو کر دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا اور سرخم کر کے باہر نکل گیا۔ واپسی پر تمام راستہ وہ فرزانہ ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا دل قریب چہرہ اور اس کے انداز محسن کے دل میں جیسے کب کر رہ گئے تھے۔ کچھ دن بعد وہ کسی کام سے اسی سکول والی سڑک سے گزرا تو اسے میڈم فرزانہ ایک ہاتھ میں پتھری اور دوسرے میں دو کتابیں تھامے گزرتی نظر آئی۔ ایک دفعہ تو وہ اس کے پاس سے نکل گیا مگر پھر جب چوکتے ہوئے پیچھے دیکھا تو وہ خراماں خراماں چلی آ رہی تھی۔ اس نے کار ریورس کرتے ہوئے فرزانہ کے قریب جا کھڑی کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس دوران فرزانہ چلتی چلتی چند قدم کار سے آگے نکل آئی تھی۔ محسن نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور بولا:-

”آئیے مس فرزانہ! آپ شاید گھر جا رہی ہیں میں آپ کو ڈراپ کیے دیتا ہوں۔“

فرزانہ نے ایک ٹکا غلط انداز سے محسن کی طرف دیکھا مگر پھر انکار کے انداز میں اسی چال سے چلتی ہوئی بولی:-

”جی نہیں شکریہ، میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“

”اجی شکریہ کس بات کا میڈم، پلیز آئیے نا، دیکھئے آپ تو تکلف بہت رہی ہیں۔“ محسن التجا بھرے لہجہ میں اس کے آگے آتا ہوا بولا۔

”اذہد میں روز اسی طرح آیا جایا کرتی ہوں اور یہ میرا معمول ہے“ وہ تن کر بولی۔ ”اور پھر اجنبیوں سے لفٹ لینا میرا طریقہ بھی نہیں۔“

”ارے صاحب! جانے بھی دیجیے، اب ہم اجنبی کہاں ہیں، آپ ہمارے بچے کی میڈم ہیں اور یہ بات آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ ہمارے دین میں

ہے۔ ایک شریف لڑکی جو اپنی گزر اوقات کے لیے سکول میں پڑھاتی ہے، تم نہایت لوفرانہ شان سے اپنی پورے کنوینینس گارڈی کی شمارتے راستے میں آکر بیٹھ جاتے ہو کیا تم مجھے سکول سے نکلوانا چاہتے ہو؟ اور اگر تمہاری یہ خواہش ہے کہ تمہاری خاطر میں بدنامی مول لے لوں تو افسوس کہ یہ خوشی میں تمہیں نہیں دے سکتی اور اس کے بعد خبردار جو میرا بیٹھا کیا۔ ورنہ میں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔ وہ یقیناً جیترا بدل کر سرخ سرخ آنکھیں نکال کر بولی۔ فرزانہ کی یہ باتیں عمران خان کے فاسٹ ہال کی طرح آئیں اور جیسے بلا اٹھانے سے پہلے ہی اس کی تمام وکٹیں اڑ گئی ہوں۔ محسن نے خشک ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ارد گرد دیکھا۔ پھر آگے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی فرزانہ کو دیکھ کر زیر لب بڑبڑایا۔

”آف یہ تو بڑی تیز لگی، اچھا ہوا جو یہاں کوئی واقف سننے دیکھنے والا نہ تھا ورنہ بڑی رکر رکر ہوتی“ محسن نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ”خیر کوئی بات نہیں محسن بیٹے، ابھی تو ابتداء ہے، ویسے چھوڑو گا تو میں بھی اسے نہیں۔ چاہے یہ پھولن دیوی کی سگی ہی کیوں نہ ہو“ محسن نے بسورنے کے انداز میں ہونٹ لٹکا کر کندھے اچکائے اور گاڑی میں جا بیٹھا۔

اور پھر فرزانہ سے اس کی اگلی ملاقات نئے عاصم کی امی راحت کے گھر ہوئی۔ جیسے ہی محسن اندر داخل ہوا، غل غپاڑے نے اس کا استقبال کیا۔ اس حسین ہنگامے میں سے عاصم ”اگل“ کا نعرہ لگا کر اس کی طرف بھاگا اس کے ساتھ چند اور بچے بھی ”اگل آگئے اگل آگئے“ کا شور مچاتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔ ایسے محسوس ہوا تھا جیسے کسی بچے کی ساگرہ کی تقریب ہو۔ کھانے کی میز کے اوپر رنگ برنگی چمکدار قدیلیں اور غبارے لگے

کافی رکھے، کاریں اور سائیکل گزرنے لگے تھے، جس سے پتہ چلتا تھا کہ سکول میں چھٹی ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسے فرزانہ بھی سامنے سے آتی دکھائی دی۔ محسن نے محسوس کیا کہ کار پر نظر پڑتے ہی فرزانہ کے چہرے پر ایک تناؤ سا آگیا ہے اور خوبصورت ماتھے پر بڑی ٹھنکیں دور سے دکھائی دینے لگی تھیں۔ ”عالم پتھر کی بنی معلوم ہوتی ہے، آج چوتھی بار ہم بھی کس نیا زبندی سے اس کے راستے میں آکر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جیسے یہاں ہماری نوکری لگ گئی ہو۔ کتنی تابعداری سے ماتھے پر ہاتھ رکھ سلام کرتے ہیں لیکن وہ نظر اٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔“ اپنے میں فرزانہ چلتی ہوئی قریب آگئی اور محسن نہایت وارفتگی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ فرزانہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں شب بیداری کی سرخی اور خوب صورت ماتھے پر ٹھنکیں تھیں، لیکن گلابی رسیلے خمدار ہونٹ دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ کو قابو کرنے کی کوشش میں قہرک رہے تھے، جیسے وہ اس کے اختیار سے باہر ہوئے جا رہے ہوں۔ محسن کو ان چمکے ہتھیاروں نے گھائل کر کے رکھ دیا۔ فرزانہ کی یہ خوش ادائیاں اس کے خرمین دل پر بجلی بن کر گریں اور محسن پر اک قیامت سی گزر گئی مگر پھر وہ ہوش میں آگیا اور جب وہ قریب آگئی تو وہ یکدم اپنی مرانہ جرأت کو بروئے کار لاتا ہوا کار سے باہر نکل آیا اور دروازہ قہام کے بولا۔

”آئیے نا! آپ کو ڈراپ کر دوں۔“

فرزانہ نے ایک خوبصورت ملی کی طرح خرا کر اسے چمکے انداز سے دیکھا اور کہا۔

”شکریہ ایہ کار تمہیں ہی مبارک ہو مگر یہ تو تناؤ تمہیں لوگوں کو ڈراپ کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں؟ یہ تم نے آخر اتنے دنوں سے تاک کیا رہا رکھا ہے؟ تمہیں شرم آئی چاہئے۔ ایک تو ان فلموں نے تم جیسے نوجوانوں میں سے غیرت کا مادہ ختم کر کے رکھ دیا

”سوری صاحب! ہمیں پتہ نہ تھا، ورنہ گھاس کھلانے کے علاوہ پانی کی بالٹی بھی رکھتے آپ کے سامنے“ فرزانہ نے طرے ہونٹ میکرتے ہوئے کہا۔

”اور میڈم! مجھے بھی اس سے پہلے پتہ نہ تھا کہ آپ درس و تدریس کے علاوہ اس قسم کے فرائض بھی بخوبی سرانجام دے سکتی ہیں۔ کافی وسیع تجربہ معلوم ہوتا ہے آپ کا۔“ محسن نے بھی آنکھیں میچھ کر دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈھونڈتے ہوئے پہلے پردہ لایا۔

”لیکن صاحب میں نے نہ تو موسیقی کی نفسیات پر ریسرچ کی ہے۔ نہ ہی ان کی بولیاں سمجھنے کی کوئی ڈگری لی ہے۔ اس لیے زیادہ بے لگام ہونے کی بھی ضرورت نہیں“ فرزانہ نے غصے سے کہا۔

پہلے تو راحت دونوں کو اس طرح آپس میں اُلجھتے دیکھ کر حیران ہوتی رہی مگر پھر ان کے ڈائیلاگ سن کر قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی۔

”ارے ارے کیا ہو گیا تم دونوں کو۔ کیا بیٹھے بیٹھے چوڑوں کی طرح لڑنے لگے۔ فرزانہ کیا بات ہے؟ پھر ارے محسن سے اس قدر ناراض کیوں ہو؟“

”کچھ نہیں یہ صاحب ذرا خود بخود ہی لفٹ دینے کی کوشش میں ہیں“ فرزانہ نے گول مول الفاظ میں تنک کر کہا۔

”آف لڑکی ہے یا بھڑوں کا جمعہ؟“ محسن نے اسے خالص طعہ پرستانے کے لیے قدرے بڑبڑا کر کہا۔

دوسری مہمان خواتین کے ادھر متوجہ ہونے سے پہلے ہی راحت نے بات تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

”آؤ نا، محسن تم دیر سے پہنچے ہو ورنہ بڑی مزے مزے کی چیزیں بنی تھیں آج تو، چلو بیٹھو آرام سے تمہارے لیے بھی کچھ منگوائی ہوں کھانے کو۔“

”ارے بھابھی کون کھلاتا ہے ہمیں کچھ آپ کو تو اپنی ہی سہیلیوں سے کچھ فرصت نہیں۔“ محسن کمرے کے

رہے تھے اور نیچے چند لڑکیاں بالیاں باہم لوک جھونک میں معروف تھیں۔ جو نبی فرزانہ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو محسن چلا آ رہا تھا۔ جس کے دائیں ہاتھ بچے چٹے ہوئے اسے کھینچے لارہے تھے۔ قریب آ کر محسن نے بمشکل خود کو بچوں کے نرے سے آزاد کیا اور پھر سرخم کر کے سب کو آداب کیا۔ چاکلیٹ رنگ کا ٹو پیس سوٹ اس کی بڑی بڑی متوالی اور شوخی بھری آنکھوں سے میچ کر رہا تھا۔ لڑکیوں نے اسے دیکھ کر باہم کھسک پھری اور پھر اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ محسن نے سرسری نظر سے چاروں طرف دیکھا تو اسے ان لڑکیوں میں بیٹھی فرزانہ بھی نظر آ گئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ یکا یک چونک پڑا اور پھر غیر ارادی طور پر فرزانہ کے قریب چلا آیا۔ ”ہیلو“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”ہیلو“ فرزانہ نے اس کی آ رہا ہونے والی مشاق نظروں سے بچنے کے لیے پلکیں رخساروں پر گراتے ہوئے دھیمے سے کہا۔ اتنے میں راحت بولی ”ارے فرزانہ آؤ، محسن کا میں تم سے تعارف کرواؤں۔ یہ ہے میرے شوہر رضا کا نہایت ہی پیارا شریہ سا دوست اور بہن، ابھی ایک ماہ ویشتر یہ ٹرانسفر ہو کر عاصم کے کول میں وائس پرنسپل مقرر ہوئے۔“

”جی ہاں! ان سے پہلے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ جب آپ کے شوہر نامہ از عاصم کے داخلے کی ذمہ داری مجھے تاجز کے ناتواں کندھوں پر ڈال کر خود لیے دورے پر نکل گئے تھے۔ تو سکول میں پرنسپل کے آفس میں ان محترمہ سے سابقہ پڑا تھا۔ مگر آپ کی اس بچپن کی سہیلی اور بہن نے تو گھاس تک نہ ڈالی آپ کے اس پیارے سے شریہ سے دیور کو۔“ محسن نے بعد کی ملاقاتوں کی روداد کو نسبتاً چھپاتے ہوئے بات کو جینا کر کہا۔

کمرے میں تو ہمیں باتوں باتوں میں پتہ ہی نہیں چل سکا، میں تو بس اب چلوں گی" فرزانہ نے اپنی چھوٹی سی رست واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھہرنا۔ تمہیں سمجھوانے کا بندوبست کرتی ہوں" راحت نے جلدی سے کہا۔ "نہیں" راحت میں خود ہی چلی جاؤں گی رکشے رکشے پر" فرزانہ بجلت تمام کمرے سے نکلے ہوئے بولی۔

"تو بہ ہے بھی، کیوں چلی جاؤ گی اس وقت اس کبخت رکشے رکشے پر" راحت نروس سی ہو کر بولی "تم ٹھہرو ذرا، محسن دیکھو بھی کار باہر کھڑی ہے تا تو تم ہی پلیز فرزانہ کو ڈراپ کر دو تا۔"

محسن کے تو جیسے بی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے باہر جاتی فرزانہ کے پیچھے لپکا۔ راحت بھی ساتھ ہی ساتھ باہر چلی آئی۔ فرزانہ نے اک ٹکاو فلڈ انداز سے محسن کو اپنی کار کا لاک کھولتے دیکھا اور پھر بولی۔ "مانا کہ آپ لوگ بڑی بڑی کاروں کے مالک ہیں، ایک شہنشاہ نے بنا کر تاج محل ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق کے مصداق آپ کو بے چارے رکشے کو بھی کبخت کہنے کا کوئی حق نہیں"۔ فرزانہ اپنی لوہنجی ہیل کی جوتی پر ٹک ٹک کرتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی اور اتفاقاً سامنے تیزی سے گزرتے ہوئے ایک خالی رکشے کو ہاتھ دے کر کھڑا کرتے ہوئے بھاگ کر اس میں سوار ہو گئی اور رکشہ اسے لے کر ہوا ہو گیا۔

پہلے تو محسن اور راحت ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے پھر راحت تشویش سے بولی۔

"یہ لڑکی تو شروع سے آفت کی پرکالہ ہے مگر آج مجھے اس کی بڑی لگ رہے گی۔ اتنی دیر گئے اکیلی چلی گئی ہے۔ اوپر سے ایسا زمانہ آگیا ہے کہ جو نہ ہو سو کم ہے۔ محسن تم ذرا پیچھے رہو، کار لگا کر اسے گھر تک چھوڑ کر ادھر سے ہی آگے نکل جانا پلیز۔"

محسن راحت کا ہاتھ لے کر ہوا کرتا ہی رہا

نظروں سے فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو بھی محسن وہ کیا ہوتا تہاری شادی کا۔ ملی کوئی آئیڈیل لڑکی یا نہیں؟" راحت اسے پلیٹ پکڑاتے ہوئے قدرے دھیسے لہجے میں بولی۔

"نہیں تو گئی ہوئی، مگر وہ جو کارلائل نے کہا ہے کہ آئیڈیل ستاروں کی مانند ہوتے ہیں، جنہیں ہم دیکھ تو سکتے ہیں مگر چھو نہیں سکتے" محسن نککیوں سے فرزانہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"لو اور سنو اب تو لوگ ستاروں پر بھی جانے لگے ہیں۔ ایسی کون سی بات ہے۔ ویسے اگر تم مجھے بتا دو کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے تو پھر رشتہ برابر کریں"۔ راحت نے دلچسپی سے کہا۔

"جانے دو بھابھی کون برابر کرتا ہے ہم سے رشتہ۔ کسی کو ہماری پروا ہی نہیں" وہ پلیٹ میں سے ایک رس گلا اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"خواتین بات کو طرز دینے جارہے ہو۔ مجھے بتاؤ نا میں جو کہہ رہی ہوں میں کرواؤں گی تمہاری شادی" راحت نے ٹک کر کہا "کیا اب اسٹام لکھوانا ہے مجھ سے؟"

"ہاں تو پھر یہ ہوئی نا بات" محسن بے اختیار ہنس کر بولا۔

"بھابھی یہ تو سوچو کہ کون کرے گا مجھ کو فرسے شادی؟" وہ پھر نککیوں سے فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

کچھ لڑکیاں معنی خیز انداز میں کھکاریں اور پھر دبی دبی مسکراہٹ ہنسی کی کھنک میں تبدیل ہوتے دیکھ کر فرزانہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی "ہائے کچھ دیر تو بیٹھو نا فرزانہ کی بچی" راحت نے یکدم اس کے اٹھ جانے پر حیران سے ہو کر کہا۔

"باہر تو گہری شام بڑی ہے، راحت ذرا دیکھو

"تو فرزانہ... ہاتھ لگاتے ہوئے بولی، اور اندر



سیارہ ڈائجسٹ کا عظیم الشان نمبر

رسول ﷺ نمبر

کانیا ایڈیشن ضروری تراجم و اضافہ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

- ◀ سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز ▶
- ◀ حسین و جمیل سرورق ▶
- ◀ بے شمار نعتوں کا انتخاب ▶
- ◀ عکسی طباعت ▶
- ◀ ہر جلد کے پانچ سو صفحات ▶
- ◀ 2 جلدوں پر مشتمل ▶
- ◀ دنیائے اسلام کے اہل علم کے رشحاتِ قلم کا مجموعہ ▶



تاریخین حضرات اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں

منگوانے کا پتہ

سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن لاہور۔ فون 042-37245412

جائے ہاں ہاں قدم اٹھائیے شاہاش اینڈ گڈ ہائے۔

محسن کے پیٹھ موڑتے ہی فرزادہ کا نازک سانس قہقہہ شام کی ملگنی تاریکی میں گونجا اور وہ تیزی سے اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ محسن قدم اٹھانے سے قبل ہی پھر پلٹ پڑا۔ وہ کہتے کے سے عالم میں ششدر اسی طرح دیکھنے لگا جہاں وہ کسی چھلاوے کی طرح غائب ہوئی تھی۔ دروازے پر نمبر اور نیم پلٹ پر غور کرنے کے لیے اس نے چند قدم بڑھا کر جونہی نیم پلٹ پر نگاہ دوڑائی چاہی تو دروازے کی جالی کے پیچھے سے ایک جفاوری قسم کے بل ڈاگ نے اس طرح غرا کر ”ڈف“ کیا کہ جیسے فضا میں بم کا دھماکہ ہوا۔ ذرا حواس بجا ہوئے تو اس نے شرمندگی اور شکست کے سے احساس سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر سر کو جھٹک کر ایک کھیانی سی ہنسی ہنستا ہوا کارڈیورس کر کے زن سے نکال لے گیا۔ آدھے راستہ تک فرزادہ کے کتے کی آواز محسن کے کانوں میں گونجتی رہی۔ گھر جانے کی بجائے وہ سیدھا دوبارہ راحت کے پاس جا پہنچا۔ وہ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد چیزیں سنبھال رہی تھی۔ محسن کو دیکھ کر بولی۔

”کیوں بھیجی پہنچا آئے فرزادہ کو۔ خیریت تو رہی نا.....؟“

”لگتی کہاں رہی خیریت.....؟“ محسن نے عجیب جھکے ہوئے انداز میں آنکھیں چڑھا کر صوفے پر گرتے ہوئے ہانپ کر کہا ”ناحق دوڑا دیا مجھے اس کے پیچھے۔“

”ہیں کیوں کیا ہوا؟“ راحت کچھ تھک کر اس کی حالت دیکھتے ہوئے حیران ہو کر بولی۔

”یہ مت پوچھو کہ کیا ہوا، ارے بھی بلکہ یہ پوچھو کہ کیا کیا نہ ہوا۔ آف بھائی آپ کی بچپن کی کھلی بلکہ پھیلی نے تو وہ کچھ دکھایا جو تمام زندگی میں نے بھی دیکھا نہ سنا۔ تو بہ تو بہ میں تو نہ جانے کیسے بچ کر نکل آیا وہاں سے

سے کاریگٹ سے نکال لے گیا اور رکشا اور کارڈو نوں آگے پیچھے فرزادہ کے فلیٹ کے سامنے جا پہنچے۔ جب رکشا پھٹ پھٹ کرتا واپس ہوا تو محسن فرزادہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”فرمائیے؟“ فرزادہ نے جان بوجھ کر بے اعتنائی سے سر اٹھا کر محسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ..... وہ دراصل مجھے راحت بھابھی نے آپ کے پیچھے بھیجا تھا“ محسن کچھ گڑبڑا کر بولا۔

”کیوں خیریت؟“

”آپ اکیلی جو چلی آئی تھیں وہاں سے۔ تو پھر انہوں نے بھی کہا یعنی کہ بھابھی راحت نے“ وہ لمحہ بھر کوڑکا اور خشک ہوتے ہوئے گلے سے تھوک نکل کر بولا ”اور پھر میں نے بھی سوچا کہ..... کہ کہیں۔“

”ارے مسٹر وہ جو کسی نے کہا ہے نا“

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم میرے سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے ادھر دیکھو.....“۔ فرزادہ نے اپنی کھکتی ہوئی

شوخ آواز میں قدرے رعب پیدا کرتے ہوئے کہا اور پھر پرس میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالنے لگی۔ محسن نے بے یقینی سے آنکھیں جھپک کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کا ریوالور چمک رہا تھا۔

”میں اپنی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں سمجھے؟ اور آئندہ بھی آپ کو میرے لیے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں اور آپ کو تو میں سمجھتی ہوں خاص طور پر وہی بات ہے کہ قاضی جی کیوں ڈبلے ہوں شہر کی فکر میں؟ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے مسٹر کہ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جن کے منہ سے چوہا دیکھ کر بھی چیخ نکال جاتی ہے.....“ اور پھر وہ ریوالور کی نالی کا رخ محسن کی طرف پھیرتے ہوئے بولی

”میرا خیال ہے کہ آپ کی کار کا دروازہ آپ کے پیچھے ہے اور اب آپ اچھے بچوں کی طرح گھوم

....."حسن کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"ارے کیا پھیلیاں بکھوائے جا رہے ہو۔ حسن کے بچے؟ کچھ بتاؤ بھی تو کسی تاکہ کچھ پتہ تو چلے" راحت نے پریشانی سے پوچھا۔

"آف بھابھی جان اس نے تو اپنے فلیٹ کے دروازے کے سامنے چنڈر اپ کہہ کر پووالور تان لیا مجھ پر اور کہنے لگی جلدی سے نکالو، جو کچھ تمہارے پاس ہے..... خیر" وہ کان کھجا کر بولا "اس طرح تو نہیں کہا مگر آف خدایا پھر بھی وہ تو کسی ٹارزن کی ہنگی معلوم ہوتی ہے مجھے، ارے اور بھیجیں آپ مجھے اس کے پیچھے اور اس کا وہ سرخ لپٹاتی زبان والا خوشخوار کتا جو اس نے مجھ پر چھوڑ دیا۔ وہ کاؤنٹ ڈریکولا کی اولاد، وہ گدھے برابر کتا میرے خیال میں وہ مجھے آپ کے گھریک پہنچا کر ہی واپس گیا ہوگا" حسن نے اپنی آواز میں مصنوعی لرزاہٹ اور کپکپاہٹ پیدا کرتے ہوئے جبر جبری لے کر کہا۔

"ہیں؟ اوہ نوا" راحت نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نہیں مانتی حسن اور یا پھر تم نے خود ہی اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہوگی۔"

"تو یہ تو بہ کرو بھابھی کیا میں آپ کو ایسا ہی نظر آتا ہوں" حسن کان پکڑ کر بولا۔ "آپ تو جانتی ہی ہیں۔ بھابھی میں شروع سے ہی امن پسند شہری ہوں۔ کبھی کسی کو ستانے کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ لیکن اب آکر اتنا ضرور آپ کو بتا دوں کہ اب میرے کنوارے پن کو خیر باد کہنے کا وقت آگیا ہے۔ انسان کا بیشتر وقت اپنے پارے میں پلان بناتے گزر جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی تقدیر یوں بھی فیصلہ کر دیتی ہے" وہ چٹکی بجا کر بولا "اب یہ لڑکی میرے لیے چیخ کا روپ اختیار کر گئی ہے۔"

"خیر خیر، حوصلہ، حوصلہ بے صبرے میاں،

کھیر شٹڈی شٹڈی اچھی لگتی ہے گرم گرم کھاؤ کے تو منہ جلاؤ گے، اور پھر یہ ایک طرفہ ٹریک کیسی، خود ہی ارادہ کیا اور خود ہی فیصلہ بھی دے دیا۔ ارے دوسری طرف کی رضا مندی بھی تو لازمی ہوتی ہے نا" راحت نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا "تم نے اس کے آگے کا پوچھنا نہ پیچھے کا اور چل پڑے اس سے شادی رچانے۔ بندہ خدا مجھ سے ہی کچھ پوچھ لیا ہوتا اس کے بارے میں۔"

"ارے بھابھی! آپ ہی کی وہ سہیلی یا کزن ہے تو آپ کو ہی سب پتہ ہوگا۔ مجھے زیادہ تفصیلات نہیں چاہئیں۔ صرف اتنا ہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس کی میرے ساتھ شادی ہونا ممکن ہے؟"

"سہیلی وہ میری ضرور ہے لیکن رشتہ داری بس برائے نام سی ہے۔ اس کی امی میری امی کی دور پار کی کزن تھیں۔ بہر حال اس کے مہل پاپ بے شک مر چکے ہیں مگر دوسرے وارث موجود ہیں۔ دو بھائی ہیں، بڑا بھائی کراچی میں کافی بڑا بزنس پھیلانے بیٹھا ہے۔ چھوٹا بھائی ڈاکٹر ہے۔ جس کی خاصی پریکٹس ہے، فیصلہ تو آخر انہوں نے ہی کرنا ہے نا بھئی"۔ راحت نے کہا۔

"تو بھابھی اتنے امیر کبیر بھائیوں کے ہوتے ہوئے یہ یہاں ٹپنگ کیوں کر رہی ہے؟"

"بس صاحب! فرزانہ کی بھابھیوں سے نہیں بنتی۔ یہ کہتی ہے کہ دونوں بھائی جو ہیں وہ بیویوں کے غلام ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ بھی غلام بن کر رہے تو ایسا اس کے لیے ناممکن ہے۔ دراصل فرزانہ دونوں بھابھیوں سے زیادہ پریمی لکھی ہے، خوبصورت اور ایڈوائس ہے اور پھر جب کہ اس چیز کا فرزانہ کو احساس برتری بھی ہے تو وہ کس طرح ان کے آگے دب کر رہ سکتی ہے اور پھر جہاں ذاتی عداوت ہو، وہاں بد مزگی لازمی اثر ہے۔ چنانچہ اس نے کیریئر گرل بننے کا فیصلہ کر لیا۔ ایسی لڑکی کے لیے جس کے لیے خوبصورتی وہاں جان بن جائے۔"

دہائی جمع خرچ تھا؟ واہ داد دیتا ہوں آپ کے حافظے کو بھابھی۔ کیا کہنے آپ کے بھی مگر یہ بات بھی کان کھول کر سن لیں کہ جو چیز مجھے پسند آجائے اسے میں چھوڑا نہیں کرتا۔ میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ ہر قیمت پر۔“ وہ صوفے کے بازو پر مکہ رسید کرتے ہوئے بولا۔

”اچھا بھئی اچھا۔ میرا صوفہ تو مت توڑو۔ دیکھو رضا کو کراچی سے واپس آنے دو۔ پہلے اس سے صلاح مشورہ ہوگا پھر فرزانہ کی مرضی معلوم کی جائے گی اور جب بات آگے بڑھائی جائے گی۔ سمجھا اور میرے کانوں کو کیا کہتے ہو، وہ تو ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ہاں مگر میرا خیال کیا بلکہ یقین ہے کہ تمہارے اس خوشنما بالوں والے سر کے ساتھ کانوں کی جوڑی محض اس مقصد کے لیے بیوست کی گئی ہے کہ تم دوسروں کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دینے کے بعد اپنی مرضی پر چلا کرو۔ ہے نا؟“ راحت نے ہنس کر کہا۔

جب راحت کی اپنے شوہر سے بات ہوئی تو رضا نے شکر ہو کر کہا۔

”میرا اس لڑکے محسن سے شروع سے واسطہ ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ یہ ہمیشہ دوسروں کے بارے میں جو پہلا تاثر قائم کر لیتا ہے وہ انتہا پسندانہ ہوتا ہے لیکن تمہارا کیا خیال ہے فرزانہ اس کے لیے کیسی بیوی ثابت ہوگی؟“

”اب میں حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ دیکھنے میں تو طرح دار ہے، بے حد حسین ہے۔ رہی فطرت مزاج کی بات تو اکثر لوگ اپنا آدھا چہرہ ہمیشہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔ کسی کے اندر جھانکا نہیں جاسکتا۔ اتنا میں نے ضرور اندازہ لگا لیا ہے کہ فرزانہ کی طبیعت میں ضد اور خود سری کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور برداشت کا مادہ تو بالکل ہی نہیں اس میں۔ لیکن ہمارے کچھ سوچنے یا نہ سوچنے سے کیا فرق پڑتا ہے جبکہ محسن کہتا

ملازمت کا حصول ہمیشہ مشروط حالات کے تحت ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک اخبار میں اس سکول کی ملازمت کا اشتہار بڑھ کر یہ یہاں چلی آئی۔ اس کی خوبصورتی اور اچھے گھرانے کو دیکھ کر سکول کی پرنسپل نے اسے پاس ہی ایک کمرہ دے رکھا ہے اور اس طرح یہ unpaid guest بن کر رہ رہی ہے، مگر کیا تم واقعی اس کے لیے سیریس ہو محسن.....؟“ راحت محسن کو غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

”وائے ناٹ بھابھی! آخر میں سارے پاؤں تیل کس لیے رہا ہوں۔ یہی تو ہے میری آئیڈیل لڑکی، اس کے نسوانی غرور کے سامنے تو آپ کے اس گلیمرس بوائے دیور نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اُف..... وہ کیا کہا ہے کسی نے:-

تبسم بھی جیا بھی بے زخی بھی
یہ اعزازِ ستم بھایا بہت ہے
ہائے میں پھر کہتا ہوں بس اب تو یہ لڑکی میرے لیے چیخ بن گئی ہے اور میں اسے حاصل کر کے ہی رہوں گا۔“ محسن نے اپنے چمکدار لہریے دار بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر اپنی ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے کہنے لگا ”ذرا سوچو تو بھابھی یہ اس کی الٹی سیدھی حرکتیں اور کڑوی کسلی باتیں کس لیے برداشت کر رہا ہوں، اس کے لیے سنجیدہ ہوں نا، اسی لیے۔ تو پھر اب جلدی سے کچھ کر دنا بھابھی میری اچھی بھابھی۔“ محسن دیکھتے ہی دیکھتے لجاجت پر اتر آیا۔

”نہ..... نہ..... بھئی ہم کسی کے پھٹے میں پاؤں نہیں اڑاتے۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“

راحت نے اپنی پیاری سی ناک اچکا کر مسکراتے ہوئے آنکھیں قدرے منکا کر کہا۔

”میری شادی کے لیے ابھی جو دھوے کیے جا رہے تھے اور اسٹام لکھے جا رہے تھے، کیا وہ محض

اس میں موجود ہیں، پڑھا لکھا ہے، خوب رو ہے، شریف اور خاندانی ہے۔ تمہاری خواہش کے مطابق صاحب جائیداد اور کافی مالدار ہے۔ گلیوں وغیرہ میں بھی جاتا ہے اور کافی دوست احباب بھی ہیں۔ ابھی تو کئی اچھے اچھے گھر اس کو بیٹی کا رشتہ دینے کے تمنائی ہیں لیکن یہ خود ہی کسی کو خاطر میں نہیں لارہا۔ ایک خصوصیت اور اس کی بتاتی چلوں کہ تقریباً اکیلا ہے۔ نہ ساس نہ ننڈ نہ دیو نہ سسر! تم بھی خود سسر لڑکی اس کو اپنا کر تمام زندگی چین کی بنسری بجا سکتی ہے۔ دیکھو ابھی تو اس کی زندگی کا خاص مقصد کوئی نہیں کیونکہ کنوارہ ہے۔ جب شادی کے بعد تم ساتھ رہو گی تو پھر تمہاری خاطر بھی وہ اور آگے بڑھنے اور دولت کمانے کی کوشش کرے گا۔

فرزانہ خاموش ہو رہی مگر اس کی آنکھوں میں رضا اور پردگی کے ملے جلے احساس کے گلاب مہکتے دیکھ کر راحت نے اس کی پیٹھ پر ہلکا سا تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ ”ہاں تو پھر کیا فرماتے ہیں علمائے دین بیچ اس مسئلہ کے، کہو تو تمہارے بھائیوں سے بات کی جائے۔“

بھائیوں کا نام من کر فرزانہ کے خوبصورت چہرے پر کرب سا پھیل گیا اور ششدری آہ بھر کر کہا۔ ”راحت! بعض لڑکیاں مالی مشکلات کے ہاتھوں عاجز آ کر گھر سے کچھ کمالانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور بعض خوشحال گھرانوں کی لڑکیاں محض ماحول کی یکسانیت سے آگاہ کر ملازمت کر لیتی ہیں لیکن میرے ساتھ علیحدہ ہی مسئلہ تھا مجھے بھائیوں کے ساتھ رہ کر اپنی اتنا کا سودا منظور نہ تھا اور بھائی اپنا گھریلو سکون چاہتے تھے اور دیکھ لو۔ مجھے یہاں آئے ہوئے دسرا مہینہ ہے بھائیوں نے مڑ کر حالت تک نہیں پوچھی۔“

”چلو جانے دو فرزانہ۔ تمہیں چاہئے کہ سب کچھ بھول کر جو خوشی آج تمہارے دروازے پر دستک دے رہی ہے اسے خوش آمدید کہو۔ میرا خیال ہے

ہے کہ اگر شادی کروں گا تو فرزانہ سے ورنہ کسی سے بھی نہیں۔“ راحت نے قدرے پریشانی سے کہا۔

”ہوں!“ رضا نے کچھ سوچے ہوئے کہا ”اچھا خیر پہلے تم فرزانہ سے تو بات کر کے دیکھو نا۔“ اور جب فرزانہ سے راحت نے بات کی تو وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی۔

”ارے راحت میں تو خود کئی دنوں سے اس آدمی کے بارے میں تم سے کچھ دریافت کرنے کا سوچ رہی تھی کیونکہ یہ تو بغیر اپنا حدود اور بعد بتائے ہی کب کا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ بہت اس کو ڈانٹا دھمکایا مگر اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا ہے۔“

”اری نامرادا وہ تو تمہیں اتنا چاہنے لگا کہ کہتا ہے شادی فرزانہ سے ہی کروں گا ورنہ کسی سے بھی نہیں۔“ نجائے تم نے کیا چکر چلایا ہے ورنہ اس کو تو کوئی لڑکی پسند ہی نہ آ رہی تھی۔“ راحت نے کہا۔

”اُف مجھے پہلے ہی اس بات کا خوف تھا کہ اب وہ تمہیں درمیان میں لا کر اپنا مقصد پورا کرے گا لیکن راحت بھی اب تم سے کیا پردہ۔ میں صرف ظاہری رکھ رکھاؤ اور صورت شکل کی قائل نہیں بلکہ اب تک تو میں یہی سمجھی رہی تھی کہ ہے کوئی جو کہ شاید لنڈے بازار کا سوٹ جین کر کسی دوست کی کارماگ لانا ہے اور لوہروں کی طرح آتی جاتی لڑکیوں کے راستے میں کھڑا ہو جاتا ہے اور ادھر تمہیں تو پتہ ہے کہ میں اپنی بھائیوں کو شینگ دکھا کر گھر سے نکلی ہوں۔ تو پھر میں شادی کروں گی تو ایسی جگہ کہ وہ بھی منہ کھول کر دیکھتی رہ جائیں۔ ویسے بھی خانہ داری کی کس کس سے مجھے از حد نفرت ہے۔ مجھے تو وہ شوہر چاہئے جس کا سوسائٹی میں اونچا نام ہو جس کے پاس دولت کی ریل پیل ہو اور جو فراخ دلی سے سوشل لائف انورڈ کر سکے۔“

”تو پھر اور کیا چاہتی ہو۔ یہ سب خصوصیات

میں سے کوئی نہ کوئی مین میخ نکال کر محسن کا دل برباد کر دیتے۔ دراصل شروع شروع میں وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ محسن ان کے ہاتھ سے نکل جائے اور پھر آخر جب تنگ آ کر محسن کی بہن نے بھی بات پوچھنی بند کر دی تو اس ایسوسی ایشن میں دراڑیں پڑنی شروع ہو گئیں۔ اکا دکا نمبر شادی کر کے غائب ہونے لگے اور پھر طرہ یہ کہ جو بھی ازدواجی بندھنوں میں بندھتا۔ باقی ماندہ کنواروں سے کئی کترانے لگتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے سارے دوست شادی کر کے کھسک لیے اور اب عالم یہ ہوتا کہ ہنی مون کے بعد سے ہی ان کی ذمہ داریوں کا تاننا شروع ہو جاتا۔ کبھی بیوی کے ساتھ شام منانے کی پرابلم تو کبھی اس کی میڈیکل پرابلم پھر میٹرنٹی ہو کر کے چکر۔ کبھی بچے کی بیماری کا بہانہ تو کبھی داغیے کا۔ ایسی صورت حال سے اب محسن کئی چنگ کی طرح ڈولتا پھر رہا تھا کہ فرزانہ اس کی زندگی میں یوں آئی جیسے:-

دیرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے اسی موقع کے لیے یہ
شعر موزوں کیا تھا۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ Chronic Bachelors یعنی بچی عمر کے کنوارے بڑے گھاگ اور پرابلم کم کے شوہر ثابت ہوتے ہیں اور مشکل سے ہی قابو آتے ہیں کیونکہ وہ زندگی کا ایک خاص حصہ دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے میں صرف کر چکے ہوتے ہیں لیکن محسن کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ بے شک اس نے شادی دیر سے کی تھی مگر فرزانہ سے پہلے کوئی لڑکی اس کی زندگی میں نہیں آئی تھی۔ اب تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ فرزانہ کے سامنے سب کچھ ہار چکا ہے۔ فرزانہ اس کی زندگی میں کیا آئی کہ ہر طرف اس کے وجود کی مہک کافسوں پھیل گیا۔ مستعار لی ہوئی روشنیوں اور اپنے شب و روز کے ٹکچے

محسن تمہارے سارے شکوے دُور کر دے گا۔
اور پھر تعجب تو اس بات پر ہوا کہ جب رضا اور راحت نے فرزانہ کے بھائیوں سے اس رشتے کے بارے میں فون پر بات کی تو دونوں کی طرف سے ایک ہی جواب ملا۔

”فرزانہ بالغ ہے اور اپنے بھلے بُرے کی خود ذمہ دار ہے اور پھر زندگی تو اس نے گزارنی ہے ہم نے نہیں اگر وہ خود اس رشتہ کو اپنے لیے موزوں خیال کرتی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“

اور پھر اگلے دس دن کے اندر ہی دونوں بھائیوں نے پچاس پچاس ہزار کے دو چیک بھیج کر ان الفاظ کے ساتھ گلو خلاصی کرائی۔

”ہم ضرور اس شادی میں شریک ہوتے مگر کیا کریں وقت نکالنا بے حد مشکل ہے۔“

رضا، راحت اور فرزانہ کی پرنسپل نے میکے کے فرائض انجام دیے اور محسن کے دوستوں اور ان کی بیویوں نے سسرال کے..... شادی کی تقریب ہوٹل ہالی ڈے ان میں وقوع پذیر ہوئی اور وہیں سے رخصت ہو کر فرزانہ، بیگم محسن علی خان بن کر اس کے گھر آ گئی۔

شادی سے پہلے محسن کی زندگی کچھ اس ڈھب سے جاری تھی جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اونٹ رے اونٹ حیری کوئی کل سیدی۔ والدین خاصی جائیداد چھوڑ کر ایک حادثے میں چل بے تھے۔ ایک بیانی ہوئی بہن تھی جو خاوند کے ساتھ امریکہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر تھی۔ سالوں میں کہیں ایک دفعہ آتا ہوتا تو بھائی کے لیے رشتے ڈھونڈنے کی مہم کا آغاز کر دیتی۔ وہ بے چاری تو دل سے چاہتی تھی کہ کسی طرح بھائی کا گھر بسا دے لیکن دوسری طرف جو محسن کے دوستوں کی فوج ظفر موج تھی، انہوں نے پچھلے ایسوسی ایشن بنا کر اس کا صدر محسن کو مقرر کر رکھا تھا اور ادھر جو رشتہ بھی برابر ہوتا تھا سب یک زبان اس

چاہتا تھا، جیسا چاہتا، کرتا اور اسی کو زندگی کی معراج سمجھتا لیکن زندگی کی اس یکسانیت سے وہ بھی آخر اکتاہٹ گیا۔ دن کے بعد رات نہ ہوتی تو شاید مسلسل اُجالے سے بھی انسان کا دل گھبرانے لگتا۔ شاید اسی لیے قدرت نے سرد گرم موسموں کے بعد بہار بنائی۔ اب جو محسن نے شادی کا مسئلہ پائی لیا تو اب ان اُجالوں کی چکا چوند زندگی نے ایک نیا مسئلہ اس کے سامنے لا کھڑا کیا اور وہ تھا روپے پیسے کا مسئلہ۔ جائیداد اس کی ضرورت تھی، لیکن اس کی طرف اس نے کبھی توجہ نہ دی تھی۔ جو کچھ فیچر دے دیتا اس کی اکیلی جان کے لیے کافی ہو جاتا۔ محسن نے پلٹ کر کبھی حساب کتاب نہ پوچھا۔ وقت گزاری کے لیے جو اس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار چلا رکھا تھا اس کی طرف بھی شادی کے بعد تقریباً ایک سال سے اتنا وقت نہ ملا کہ اس کی طرف توجہ دے سکے۔ بینک بیلنس لاکھوں کے حساب سے ضرور تھا مگر شادی پر بھی بے تحاشا خرچ ہوا اور ابھی تک اسی پر شاہ خرچیاں ہو رہی تھیں۔ تو آخر ایک دن تو بینک بیلنس نے بھی جواب دینا ہی تھا۔

ایک تقریب سے واپس آ کر جب فرزانہ نے مسز شیخ کے گلے میں پہنے ہار کی بے طرح تعریف کی تو محسن فرزانہ کو لے کر جیولر کے پاس جا پہنچا۔ مختلف ہاروں کے ڈبے کھولنے کے بعد جب ویسا ہی ہار فرزانہ کی نظروں کے سامنے آیا تو اس کے حسین چہرے پر مسرت کی شفق جھلملانے لگی اور آنکھوں میں اشتیاق کے جگنو جلنے بجھنے لگے۔ محسن اس کی اس کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا مگر تین لاکھ پچیس ہزار روپے قیمت سنتے ہی محسن کو جیسے چپ سی لگ گئی۔

”ٹھیک ہے بھی تم اسے علیحدہ رکھ دو ہم پھر آئیں گے۔“ محسن نے بدولی سے جیولر سے کہا۔ اور پھر فرزانہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

اندھیروں اجالوں میں بھٹکنے والے محسن کی آنکھوں کو فرزانہ کے حسن و شباب کی روشنی چکا چوند کر گئی اور وہ اس روشنی کے سیلاب میں بہتا چلا گیا۔ اس کی بے ڈھب زندگی میں قرینہ سا آ گیا۔ اس کی بے مصرف جوانی ایک نئے جذبے سے روشناس اور سرشار ہوئی اور جی بھر کر سیراب ہوئی۔ اب وہ مطمئن اور خوش تھا۔ اس کی بہن جو اس کی شادی کی خبر سن کر بعد میں پہنچی تھی، اس کا گھر شاد و آباد دیکھ کر مطمئن اور خوشی خوشی واپس گئی اور دوست احباب نے بھی یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا کہ شکر ہے کہ کسی طور اس آوارہ پنجھی کے بھی پر کٹے۔ اور یہ آشیانے کی پابندیوں کا لذت شناس تو ہوا۔ اب وہ وقت بے وقت دوستوں کے سر جا چڑھنے اور ان کے گھروں میں فساد ڈلوانے اور یا پھر ہوٹلوں اور کلبوں کے منتظمین کا سر کھانے کی بجائے اپنی نئی نوپلی حسین دہن کی معیت میں بڑے رکھ رکھاؤ سے گھومتا پھرتا نظر آتا۔ اب وہ کلبوں میں فرزانہ کے ساتھ اک نئی شان و بان سے نکلتا اور اعلیٰ ہوٹلوں میں بڑے سلیقے سے کھانا کھاتا۔ اونچے طبقہ میں بھی پہلے سے ہی اس کا بطور ایک رئیس زادے کے تعارف تو تھا مگر اب اس سوسائٹی میں اس کی بیگم کے حسن اور مہذب اور شائستہ طور طریقوں کا چرچا ہونے لگا۔ تمام ملنے والے محسن پر اب رشک کرتے۔ محسن نے ہنی مون سے واپس آ کر اپنی شادی کی خوشی میں ایک دو شاندار ڈنر کیا دیئے کہ اب وہ اور فرزانہ بھی سرکاری اور نیم سرکاری تقریبات میں اکثر نظر آنے لگے اور فرزانہ تو قریباً ہر فنکشن کی جان بنتی گئی۔ لوگوں کی نظروں میں اپنے لیے پذیرائی اور اہتمام دیکھ کر محسن کو خوش فہمیوں نے گھیر لیا اور وہ جی بھر کر فرزانہ کے ساتھ دائرہ عیش دیتا رہا۔ شادی سے پہلے محسن کی زندگی ایک ہی محور کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس کی ذات کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ تھا وہ جہاں

”کیا خیال ہے چلیں۔“

فرزانہ کی آنکھوں کے دیپ بجھ سے گئے اور مضحل سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ تمام راستہ وہ کبھی کبھی سی رہی۔ وہ اتنی بچی تو نہ تھی کہ محسن کے انداز بھانپ نہ سکے۔ بہر حال پہلی دفعہ اس کی توقعات کو ٹھیس پہنچی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو محسن کو شیو بتاتا دیکھ کر پہلی بات جو اس نے کی، وہ ہار کے متعلق تھی۔

”محسن وہ ہار کتنا خوبصورت تھا۔ ابھی تک میری نظروں میں بس رہا ہے۔“

”کیا واقعی؟ میرا تو خیال ہے کہ تمہارے پاس اس سے بھی زیادہ خوبصورت اور قیمتی ہار موجود ہیں“ محسن نے سیٹھی ریز رمنہ پر پھیرتے ہوئے کہا۔

”آپ نہیں سمجھتے۔ یہ بات نہیں کہ میرے پاس پہلے ہار موجود نہیں ہیں۔ دراصل اس ہار کا ڈیزائن اتنا الونکا ہے کہ میرے دل میں کھلب کھلب کر رہ گیا۔“

فرزانہ نے زچ ہو کر کہا۔

”وہ ٹھیک ہے مائی ڈیئر لیکن چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلا نا پڑتا ہے تا“ یہ کہہ کر محسن کے چہرے پر سوچ کی دھند چھا گئی اور وہ خاموشی سے چہرے پر آفرشیو لوشن لگانے لگا۔

”محسن“ فرزانہ پھر پکاری۔

”جی میری جان“ محسن خیالوں سے چونک کر بولا۔

”آپ اپنی فرم کو زیادہ توجہ کیوں نہیں دیتے؟“

فرزانہ اپنے رگمین ناخنوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”ارے بابا..... توجہ تو تب دوں تا جب کچھ وقت ملے..... جب سے شادی ہوئی ہے پہلے تو چار ماہ اپنی مون میں گزار دیئے۔ پھر آئے دن کی تقریبات کا ہلاکلا اور پھر ابھی تک تو میں اتنے پر ہی قانع رہا کیونکہ میری اکیلی جان کے لیے تو یہ آمدنی ضرورت سے بڑھ کر تھی۔ اس لیے تو یہ لاکھوں کا بینک بیلنس بھی جمع ہوتا رہا۔ جس نے اب تک خوب

ساتھ دیا ہے“ محسن انس کر بولا۔

”دنیا میں چینا چاہتے ہو تو قناعت کا وطیرہ چھوڑ دو محسن۔“ فرزانہ نچی سے مسکرا کر بولی۔

”اور وہ جو بڑے بڑے داناؤں کا قول ہے۔ قناعت میں امان ہے قناعت میں ہی زندگی ہے“ محسن مسکرایا۔

”کہاں کی زندگی اور کیسی زندگی؟ ٹھیک ہے ہوتی ہوگی قناعت کی زندگی..... لیکن مضحل زندگی۔ تا آسودہ زندگی، ایک تالاب میں ٹھہری ہوئی کالی زدہ گدلے پانی کی سی زندگی اور پھر ایسی زندگی پر قناعت کرنا میرے مزاج کو بھی راس نہیں ہے محسن صاحب۔“ وہ ذرا ڈک کر گلا کھٹکھٹا کر بولی۔

”میں شاید آپ کے سامنے اپنی قلبی کیفیات اور افتاد طبع کی صحیح وضاحت نہ کر سکوں لیکن میرے اندک جذبہ آپ کے نظریے کی نفی کرتا ہے۔ میں تو اس نظریے کی قائل ہوں کہ زندگی سے مسرتوں کا آخری قطرہ بھی ٹپوڑ لو اور مسرتیں دولت کے بغیر حاصل ہونی ناممکن ہیں۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے جیسا تم سمجھ رہی ہو فرزانہ لیکن اس سب کے لیے بھی تو وسائل کا ہونا ضروری ہے۔“ محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

”وسائل کا کیا ہے جب آپ جائیداد کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے تو پھر اپنے کاروبار پر پوری توجہ دیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اونچا طبقہ آپ کی طرف مثبت رویہ رکھتا ہے۔ آخر یہ اثر و رسوخ کس دن کام آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اپنی فرم کے لیے محنت کریں گے، تو ضرور خاطر خواہ نتائج سامنے آئیں گے“ فرزانہ نے کہا۔

”لیکن کیا ضروری ہے کہ یہ لوگ ہمارے کاروبار میں بھی دلچسپی لیں؟“ محسن نے کہا۔

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں محسن۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ ضرور کام آئیں گے۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



سیارہ ڈائجسٹ / اگست ۲۰۱۳ء

مجھ سے پوچھنا تک گوارا نہ کیا، فرزانہ آخر کیوں؟“
محسن مشتعل ہو کر بولا۔

”وہ اس لیے کہ آپ نے کوئی تعاون کرنا
تھا میرے ساتھ؟ میں جانتی تھی کہ آپ میرے اس
ارادے میں ضرور ٹانگ اڑائیں گے“ فرزانہ نے
لا پرواہی سے کہا۔

”ارے تم نے اپنے عورت پن پر چھری بھیر
دی۔ محض سوشل لائف کے لیے حالانکہ تمہیں پتہ
ہے کہ عورت کی معراج ہی ماں بننے میں ہے۔
ہائی سب ڈھکوسلا ہے، خود فریبی ہے“ محسن نے
بھنا کر کہا۔

”لو ہوا اتنے گرم کیوں ہو رہے ہو؟ کیا دو بچے
تھوڑے ہوتے ہیں اس زمانے میں؟ مجھے کیا پتہ تھا
محسن کہ تم اتنے بیک ورڈ ٹکلو گے؟“ فرزانہ نے آنکھوں
میں آنسو بھر کر کہا ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں بچوں کی فوج
جج کر کے اپنے حسن و شباب کو دوگ لگا لوں؟“

”افوہ..... خدا کی ہندی، کم از کم اتنا تو صبر کریں
لیتیں کہ ایک گڑیا سی بیٹی ہی اور آجاتی۔ کونسا تم خود
پالتی ہو۔ میں ایک آیا ہی اور رکھ لیتا“ محسن نے بے
بسی سے کہا۔

”بس بس۔ اگر اتنا ہی شوق ہے تو کسی گھسیارے
کی بیٹی لے آؤ جو تمہارے لیے بس بچے جنتی رہے۔
میں تو باز آئی ایسی زندگی سے“ فرزانہ دھواں دھار
روتے ہوئے بولی تو محسن خاموشی سے باہر نکل آیا۔

محسن بے چارہ صلح کن طبیعت کا آدمی تھا اور
پھر فرزانہ کو وہ ہر قیمت پر خوش دیکھنا چاہتا تھا۔
چنانچہ نہ اعلیٰ بھی آیا کے سپرد ہوا اور خود فرزانہ ہر دم
اپنے جسم کو دوبارہ اسی تناسب پر لانے کے لیے
بیوی پارلرز کے چکروں اور مختلف قسم کی ورزشوں
میں معروف رہتی۔ اسے اتنے عرصہ میں یہ تو معلوم
نہ ہو سکا کہ بچے کے فیڈر میں دودھ اور مائی کا کما

اور جب محسن نے اپنی فرم پر توجہ دی تو واقعی
حیران کن نتائج برآمد ہونے لگے۔ محسن اینڈ کمپنی
دو تین کمروں پر مشتمل چھوٹی سی فرم تھی۔ جسے کوئی
خاطر میں ہی نہ لانا تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس کو
منافع بخش آرڈر سپلائی ہونے لگے۔ ایک بڑے
بینک نے ضرورت پڑنے پر کافی ایڈوانس دینے کی
پیش کش کی اور ایک بہت بڑے تاجر نے محسن کی فرم
کو خاصا اضافی کام بھیجنا شروع کر دیا اور اسی طرح
محسن کے بینک بیلنس میں اضافہ ہونے لگا۔ زیادہ
روپیہ کمانے کی طلب اور کاروبار میں کامیابیوں نے
محسن کے حوصلے بڑھا دیے۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ
وقت کاروبار کو دینا چاہتا تھا۔ اکثر اسی سلسلے میں اسے
شہر سے باہر بھی جانا پڑتا تو اپنی سست طبیعت کے
بادوجود فوراً تیار ہو جاتا۔ تین چار دن باہر بھی گزارتا۔
اب تو اس کے حلقہ احباب میں بھی دستیں پیدا
ہونے لگیں۔ رہی فرزانہ تو دیکھتے ہی دیکھتے اس نے
بھی اپنے مشاغل بڑھا لیے۔ دن کو سوشل ورک کے
لیے گھومتی پھرتی نظر آتی تو شام کو کلبوں اور بڑے
بڑے ہوٹلوں میں نظر آنے لگی۔ خوبصورتی کے ساتھ
ذہانت ایسا اہتیار ہے جو کہ اگر ایک عورت کے پاس
ہو تو مضبوط قلعہ بھی سر کر لیتی ہے۔ محسن کا جب پہلا
بیٹا حسن دنیا میں آیا تو اس کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ
رہا مگر فرزانہ جھنجھلائی اور گھبرائی ہوئی نظر آنے لگی۔

ایک تجربہ کار، خاصی تنخواہ والی آیا اور ڈبے
کے دودھ نے کافی حد تک اس کا مسئلہ حل کر دیا
لیکن جب تین سال بعد دوسرا بیٹا علی اس دنیا میں
وارد ہوا تو محسن کی لاعلمی میں ہی فرزانہ نے پچہ بند
کرنے کا آپریشن کروالیا۔

یہ پہلا جھکنا تھا جو اس خوشگوار اور مطمئن زندگی
میں محسن کو لگا اور اس دن پہلی مرتبہ میاں بیوی میں
تکرار ہوئی۔ ”اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے تم نے

”بھتر ہزار کے قریب پہنچی اتنے میں فرزانہ کی کار بھی پورچ میں آڑ کی۔ وہ ٹھکے ٹھکے قدموں سے چلی آ رہی تھی کہ محسن نے اسے بھی سٹڑی روم میں ہی بلا لیا اور وہ اکتائی ہوئی سی کرسی پر ٹپک گئی۔

”فرزانہ میں جب بھی گھر واپس آؤں تم آگے سے غائب ملتی ہو“ محسن نے گلہ کیا۔

”محسن میں کلہو کا تیل تو نہیں ہوں، اگر ذرا دیہ گھر سے باہر گزار لیتی ہوں تو کیا ہو جاتا ہے؟“ فرزانہ نے ہونٹ چبا کر کہا۔

”کلہو کے تیل کا کیا مطلب ہے بھئی، آخر کار تم ایک بیوی ہو، ماں ہو، تمہیں اپنی ذمہ داریاں بکسر فراموش نہ کر دینی چاہئیں۔“ محسن نے جھلا کر کہا۔

”میں خود بیوی اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہ کرنا چاہئے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اگر تم واقعی جانتی ہوتی کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے تو پھر یہ گھر تمہاری آوارہ گردی کے باعث لا پرواہی کا شکار نہ ہوتا۔ بچے تمہاری شفقت اور توجہ کو ترس نہ رہے ہوتے۔“ محسن نے میز پر غصے سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہارا بات کرنے کا یہ انداز اور رویہ ہرگز پسند نہیں آ رہا محسن ا“ فرزانہ نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

”انسان کا لہجہ اور رویہ وقت کے تقاضے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے فرزانہ“ محسن نے رنجیدگی سے کہا۔

”اگر تم لہجہ بدل لو گے تو مجھے بھی لہجہ بدلنے کا طریقہ آتا ہے۔“ فرزانہ نے منہ لال کر کے کہا۔

”یہ دھمکی ہے یا طعنے فرمایا جا رہا ہے“ محسن نے زہر خند سے کہا۔

”چاہے جو سمجھو“ وہ اپنے رنگین بڑھے ہوئے

تکاسب ہوتا ہے لیکن مختلف قسم کے چہرے کے ماسک لینے کے طریقے اسے اذیت تھے۔ بچوں ٹوں کر کے سوا مہینہ آرام کے بعد وہ دوبارہ اپنی سوشل لائف کی طرف اس طرح لپکی جیسے کوئی قیدی پرندہ بچرے سے چھوٹ کر پر پھیلاتے ہوئے سیدھا مکمل فضاؤں میں درخت کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھتا ہے۔ اس شہر کے سوشل سرکل میں فرزانہ اس طرح آئی جیسے کسی جذبہ انتقام سے جل رہی ہو۔ اس کی دھماکہ خیز آمد نے جیسے ہر طرف ہلچل مچا کر رکھ دی۔ نت نئی پارٹیاں ہوٹلوں میں ڈنرز مختلف قسم کے دیگر فنکشنز روز کا معمول بن گئے۔ ان دنوں محسن بھی کاروبار میں مصروف تھا اور کبھی کبھار ہی فرزانہ کا ساتھ دے سکتا تھا لیکن اس کی موجودگی یا غیر موجودگی فرزانہ کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ وہ اکثر گھر آتا تو بچے اور گھر نوکروں کے رحم و کرم پر پڑے ہوتے اور فرزانہ رات گئے گھر سے غائب ملتی۔ جب واپس آتی تو اتنی تھکی ہوئی ہوتی کہ بچوں کو تو کیا محسن کو بھی مناسب توجہ دینے کی روادار نہ ہوتی۔ باہر کی محفلوں میں چھپانے اور تقری قہقہے فضا میں بکھیرنے والی فرزانہ گھر میں محسن کو کس قدر مختلف نظر آتی لیکن وہ پھر بھی اسے ناراض نہ دیکھنا چاہتا اور باز پرس سے گریز ہی کرتا۔ اب پھر اس نے چند دنوں کے لیے باہر جانا تھا تو وہ فرزانہ کو خاص طور پر تاکید کر کے گیا کہ وہ زیادہ تر گھر میں ہی رہنے کی کوشش کرے کیونکہ ننھا علی ٹھیک نہ تھا لیکن اس کے باوجود جب وہ واپس آیا تو حسب سابق وہ گھر میں موجود نہ تھی۔ بچے آیا کے رحم و کرم پر تھے اور اسے بھی کوئی چیز اپنی جگہ پر نہ مل رہی تھی۔ وہ بولایا ہوا سا اس خالی گھر میں ادھر ادھر پھرتا رہا اور جب وہ نہ آئی تو سٹڈی روم میں جا بیٹھا۔ میز پر ہلوں کا پلندہ دیکھ کر محسن نے ٹوٹل کرنا شروع کیا، جب رقم

شاید آپ کو یہ بھی نہ یاد رہا ہو کہ جب جیولر کی دکان پر مسز شا کے ہار کی قیمت سن کر جناب کو پسینہ آ گیا تھا یعنی صرف تین لاکھ پچیس ہزار کی چیز آپ میرے لیے فراہم نہ کر سکے تو اس تمام رات میں سوچتی رہی۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں یہ تجویز آئی کہ جائیداد کی آمدنی بھی خاطر خواہ نہیں تو پھر کیوں نہ کاروبار پر توجہ دی جائے اور اسی رات میں نے کاروبار کو ترقی دینے میں آپ کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کو شاید یاد ہی ہو کہ جس ہلڈنگ کا سامان فراہم کرنے کا آپ کو چھ لاکھ کا آرڈر ملا تھا جس میں سے آپ کو ڈیڑھ لاکھ روپے کا منافع ہوا وہ آرڈر میں نے ہی آپ کو دلویا تھا۔ صرف ان سیٹھ صاحب کی انٹرکائی نیشنل میں دعوت کی تھی اور ان سے آپ کو کانٹریکٹ دینے کا وعدہ لیا تھا۔ ”محسن کے چہرے پر پریشانی کے سائے منڈلاتے دیکھ کر فرزانہ بولی ”کیوں بھول گئے؟ اور اس کے بعد بھی جیسے جیسے آپ کو آرڈر ملتے گئے ویسے ویسے آپ کی فرم ترقی کرتی گئی۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس تمام کریڈٹ کے آپ ہی حقدار ہیں؟ نہیں جناب! یہ تقریباً اس ناچیز کی ذہانت کا ثمر ہیں اور جن دھوکوں اور فتنشز کو آپ بیکار سمجھ کر ان کے بل ادا کرنے سے انکاری ہیں اور میری جس سوشل لائف کو آپ آوارگی کا خطاب دے رہے ہیں یہی تو آپ کی ترقی کا باعث بنے ہیں۔۔۔۔۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ سخت نیند آرہی ہے۔ آج بے حد تھک گئی ہوں۔“

فرزانہ نے اندازہ دلربائی سے انگریزی لے کر کہا اور پھر شان بے نیازی سے اٹھ کر اپنے بیڈروم کو چل دی۔ دیکھا جائے تو فرزانہ کی اس طرز کی گفتگو سے ایک طرح محسن کو یہ فائدہ پہنچ سکتا تھا کہ وہ چند ایک نہایت اہم مگر خطرناک باتوں کی طرف توجہ دے سکے۔ اس کے اس انداز بیان کے بعد وہ اپنی

باتوں کو دیکھتے ہوئے تلخی سے بولی۔

”میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو فرزانہ“ محسن تلخی سے بولا۔

”کون کہتا ہے کہ میں تمہاری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہوں“ فرزانہ بولی۔

”یہ تمہاری فینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان، تمہاری گستاخ نظریں کہتی ہیں جس سے نا فرمانی کی بو آتی ہے۔ جس عورت میں اطاعت اور برداشت کا مادہ نہ ہو وہ بیوی کہلانے کی مستحق ہی کب ہوتی ہے فرزانہ؟“ محسن نے چڑھے ہوئے سانسوں کے درمیان کہا اور پھر تمام بل اٹھا کر اس کے آگے بھینکتے ہوئے بولا ”پہلے یہ تو بتاؤ کہ اتنے سارے اخراجات کے یہ بل میں کہاں سے ادا کروں؟ جو کماتا جا رہا ہوں تم عیاشی میں اڑاتی جا رہی ہو۔ انسان نمڑے وقت کے لیے بھی تو کچھ بچا ہی رکھتا ہے۔ اس طرح سے تو تمہیں کسی راک ٹیلر سے شادی کرنی چاہئے تھی فرزانہ۔“

”اوہو! رہے نہ وہی کے وہی ٹٹ پوچھے، بنیاد نہایت کے!۔۔۔۔۔ یہ نہیں سوچے ان اعلیٰ تقریبات کی شہر میں کس قدر دھوم مچی ہوئی ہے اور پھر اتنا تو خرچ ہو ہی جاتا ہے شہر میں ساکھ بنانے کے لیے اور ہاں جس کمائی پر تم اتنا اینٹھ رہے ہو تا وہ تمام بزنس میرے ہی دم قدم سے ہے ورنہ تمہارے دفتر پر وہ ٹین کا لگا ہوا بورڈ کب کا زنگ کھا کر گر چکا ہوتا۔“

”واہ اس خوشی میں مر رہی نہ جاؤں میں“ محسن نے طنز سے پھنکار کر کہا ”دن رات محنت میں کر رہا ہوں اور سارا کریڈٹ تم اپنے سر لے رہی ہو۔ آخر کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو؟“

فرزانہ ایک دم تہمت لگا کر فحش دی اور پھر بولی:-

”داد دیتی ہوں آپ کے اس تہاہل عار قانہ کو محسن صاحب! ارے میرے بھولے شوہر محترم! اب

آنے کا تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ محسن کو یقین تھا کہ آج
فرزانہ بھی جاگ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے آواز دی۔
”فرزانہ“

”ہوں!“ فرزانہ نے اسی طرح پیٹھ پھیرے
ہوئے جواب دیا ”دیکھو میری بات سنو“ محسن نے
بھرائی ہوئے آواز سے کہا۔

”افوہ کیا ہے محسن؟ اب سونے بھی دوتا“ فرزانہ
نے ناگواری سے محسن کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا
حالانکہ اس کی آواز میں غنودگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ یہ وقت باتوں کا نہیں ہے
اور میرے خیال میں اس وقت یہ بات کرتے ہوئے
نہ تو مجھے کوئی روحانی مسرت حاصل ہو رہی ہے اور نہ
تمہارے ہی دل میں میرے لیے محبت اگھڑائیاں
لے رہی ہے“ محسن نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مطلب کی بات کرو“ فرزانہ نے بیزارگی سے کہا۔
”دیکھو فرزانہ میری بات غور سے سنو، مجھے
تمہارے واسطے سے کما کی ہوئی دولت نہیں چاہئے۔
میں خود محنت کر بھی رہا ہوں اور کروں گا بھی۔
تمہارے اور اپنے بچوں کی اور اس گھر کی سلامتی کے
لیے میں سب کچھ کروں گا..... فرزانہ..... میں تمہاری
ہر خواہش پوری کرنے کے لیے جان کی بازی بھی لگا
دوں گا۔ صرف تم پہلی سی فرزانہ بن جاؤ۔ غیور خود
دار اپنی طرف میلی آنکھ اٹھا کر دیکھنے والے پر تھا سا
ریو اور تان لینے والی البر حسینہ۔ دیکھو ہم یہاں سے
کہیں اور چلے جائیں گے۔ میں تمہیں کسی چیز کی کمی
محسوس نہ ہونے دوں گا۔ میری جان میرا وعدہ رہا۔
میں وقت آنے پر تمہیں دنیا گھملاؤں گا۔ صرف مجھے
مہلت دو۔ تھوڑی سی مہلت، مگر تمہیں میری خاطر ان
راہوں کو بدلنا ہوگا جن راہوں پر تم چل نکلی ہو۔ اس
طرح تو ہماری ازدواجی زندگی کی خدشیاں خاک میں
مل جائیں گی۔ یہ گھر جہاں ہو کر رہ جائے گا۔ ہمارے

کوٹاہیوں اور خوش اعتقاد یوں کے ہارے میں بھی
کوئی معقول رائے قائم کر سکتا تھا اور یوں وہ سب
لوگ بھی سامنے آ گئے تھے جن کو فرزانہ نے سحر حسن
میں جکڑ رکھا تھا۔ لیکن محسن کے لیے یہ انکشاف جان
لیوا تھا۔ وہ فرزانہ کے جانے کے بعد جیسے سکتے کے
عالم میں کتنی دیر گم سم بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن کی رو
نجانے کن خارزاروں میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ اس کی
خوشیوں کا محل جسے اس نے بڑے اربانوں سے
اینٹ اینٹ سجا کر تعمیر کیا تھا، آہستہ آہستہ غم و آلام کی
اندھیری دلدل میں دھنسا جا رہا تھا۔

”یا اللہ“ اس نے ماتھے سے ٹپکتے ہوئے پسینے کے
قطروں کو انگلی کی پونوں سے چھوتے ہوئے آہ بھر کر
کہا ”میں نے کیسے کیسے جتن کر کے اپنے لیے یہ جنت
تعمیر کی ہے۔ اس میں میری خوشیوں اور تمناؤں کے شجر
اور شرمیرے پیارے بچے حسن اور علی ہیں اور ان سب
پر میری اس راحت جاں فرزانہ کے دُقریب ہیکر کا
حسین و لطیف سایہ تھا مگر یہ سب جو میں سن رہا ہوں یہ
سب کیسے ممکن ہوا میرے مولا؟ اس جنت کا تو ایک
ایک ذرہ میں نے پورے خلوص سے سمیٹا تھا اس میں
کہاں کسر رہ گئی میرے اللہ؟“ وہ رات کے سناٹے
میں چیخ سا اٹھا اور پھر دُور جذبات سے بے قابو
ہو کر بیڈروم کی طرف لپکا۔ فرزانہ بستر پر لیٹ چکی تھی
اور دیوار کی طرف منہ پھیر کر لیٹی ہوئی تھی حالانکہ صاف
معلوم ہو رہا تھا کہ جاگ رہی ہے مگر محسن کے بیڈروم
میں آنے کا اس نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ محسن نے ایک لمحہ
توقف کیا پھر اس کے پرکشش جسم کو حسرت بھری
لگاہوں سے دیکھتے ہوئے بستر کے قریب سائیڈ ٹیبل
پر رکھے ایٹش ٹرے میں سگریٹ بجھانے لگا۔ اس وقت
وہ دونوں ایک ہی بیڈ پر دما ز تھے۔ مگر ڈانی طور پر ایک
دوسرے سے کس قدر علیحدہ تھے۔ خواب گاہ پر عجیب قسم
کی اعصاب شکن خاموشی طاری تھی۔ ایسے میں نیند

کیا آپ چاہتے ہیں کہ

- آپ، آپ کی اولاد، آپ کے بن بھائی، عزیز واقارب
- جھوٹ بولنے سے باز آجائیں
- تجارت اور ملازمت میں بدعنوانی اور بددیانتی سے باز آجائیں
- اپنے گھر والوں سے حسن سلوک سے پیش آئیں
- زندگی کا ہر لمحہ نیکی اور پارسائی میں گزرے
- تعلیم و تعلم کے شاندار درس ذہن نشین ہو جائیں
- والدین سے وہ سلوک کریں جو خدا پسند کرتا ہے

تو

سیارہ ڈائجسٹ کی شاندار روایات

کے پیش منظر میں پیش کیا جانے والا
دلکش، دلکشا اور زریں

اخلاق رسولؐ

احادیث رسولؐ کی روشنی میں

مطالعہ کیجئے

احساس کتری تو میرا جینا عذاب کر دے گا۔

”تمہیں کیا پتہ ہے کہ میرے ملنے والے زن مرید بے حسن اور نجانے کیا کیا کہنا شروع ہو گئے ہیں“ محسن نے رند سے ہونے لگے سے کہا۔

”تو کیا تمہارے ملنے والوں کے نزدیک بیوی کو راضی رکھنے یا اسے خوشی و آسائش مہیا کرنے کو زن مریدی کہتے ہیں؟“ فرزانہ نے زچ ہو کر کہا۔

”ہاں ہاں!“ محسن چڑ کر بولا ”کیا تم نے بھی اپنے بھائیوں سے اس لیے قطع تعلقی نہیں کی کہ وہ بیویوں کے غلام ہیں؟“

”وہ تو بات ہی الگ ہے۔ تم لا جواب ہو کر میرے لفظوں کے وار مجھ پر ہی نہ چلاؤ“ فرزانہ نے جھلا کر کہا ”تم تو بلاوجہ ہی جرح پر اتر کر میری جان کو آگئے ہو۔ خدا کے لیے مجھے بخشو اس وقت اور سونے دو۔ میں پہلے ہی بہت تھکی ہوئی ہوں۔ بہر حال جو تم چاہتے ہو، وہ نہیں ہو سکتا“ فرزانہ بڑبڑاتے ہوئے پھر لیٹ گئی۔

محسن بھی اس وقت زیادہ جھگڑا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا تاہم اسے فرزانہ کی باتوں پر سخت غصہ آرہا تھا۔ وہ خاموشی سے زخمی لگا ہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے دل میں لگی ہوئی غصے کی آگ کے شعلے اس کی آنکھوں سے نکل رہے تھے۔ فرزانہ نے کروٹ بدلنے سے پہلے جو نمی مڑ کر محسن کی طرف بے زاری سے دیکھا، محسن کی دھواں دیتی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ فرزانہ اس سے طاقتور نہ تھی۔ وہ چاہتا تو اپنا موقف منوانے کے لیے اس کے جسم کی ہڈی ہڈی الگ کر سکتا تھا مگر وہ ایک صلح کن اور دھیمی طبیعت کا آدمی تھا۔ اور اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اس کی اکائی ہوئی سرد لگا ہوں کی تاب لا سکتا۔ فرزانہ نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیپ بجا دیا تو محسن بھی خاموشی سے لیٹ گیا مگر نجانے کتنی دیر تک تاریکی میں چھت کو گھورتا رہا اور پھر نجانے کس وقت سو گیا۔

بچوں کا مستقبل خاک میں مل جائے گا۔ گناہ راستے منزل نہیں دیا کرتے فرزانہ۔

”کیا بات کر رہے ہو محسن؟“ فرزانہ نے یکدم تڑپ کر کروٹ لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی ”کیا تم چاہتے ہو کہ اس وقت جو میرا سوسائٹی میں اعلیٰ مقام ہے اس کو چھوڑ کر میں تمہارے اس کنویں کا مینڈک بن جاؤں! آف میرا تو یہ سوچ کر ہی دم گھٹنے لگتا ہے محسن، اور پھر کیا ہو رہا ہے اس گھر کو، اتنے نوکر چاکر موجود ہیں اسے سنبھالنے کے لیے۔ رہ گئے بچے تو اچھی بھلی آیا رکھی ہوئی ہے اس کے لیے، مگر میں علیحدہ کوچنگ کے لیے ٹیوٹر لگا رکھا ہے۔ کیا کمی ہے ان کو.....؟“

”جی ہاں! ایک ہی کمی ہے ان کو..... وہ تمہاری ماما، تمہاری محبت بھری آنکھوں کو ترستے ہیں۔ کیا تمہیں اپنی آنکھوں سے کچھ نظر نہیں آتا؟ علی ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا ہے۔“ محسن آزدگی سے بولا۔

”.....افوہ تم نے تو بچوں کے بھی دماغ خراب کر رکھے ہیں۔ ان کو مجھ سے نفرت کرنے پر اکساتے رہتے ہو۔ حالانکہ میں نے دونوں بچوں کے لیے دودو ٹائیک کی بوتلیں آیا کودے رکھی ہیں کہ کھانے کے بعد پلا دیا کرے۔“ فرزانہ طیش میں آ کر بولی۔

”نفرت کسی کے کہنے سننے سے نہیں ہوتی فرزانہ، تمہارا اپنا رویہ ہی ان کے دل میں تمہارے لیے نفرت پیدا کرنے کا سبب بنے گا“ محسن نے بھی رکھائی سے کہا۔

”خیرا وہ تو وقت آنے پر ہی پتہ لگے گا کہ وہ نفرت مجھ سے کرتے ہیں یا تم سے“ فرزانہ کچھ سوچ کر بولی ”دراصل محسن تم میری خوبصورتی، میری صلاحیتوں سے جلنے لگے ہو، جواب تمہیں میری ہر بات میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں، نہ خود چین

تلی اڑنے نہیں دی۔ سوچی نگل نہ جاؤں تو نام بدل دیتا میرا۔“ اس نے نام نہاد مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ادہاشانہ لہجے میں کہا۔ اور پھر اس کے گلے سے دہادہا سا تہہ اُٹل پڑا۔

”یار نجانبے اس کا خاوند کس مٹی کا بنا ہوا ہے یا تو اس کو کچھ پتہ ہی نہیں اور یا جان بوجھ کر کائنات کے سائن کردانے کے لیے بے غیرت بنا ہوا ہے کمینہ کہیں کا۔“ دوسرے نے منہ بگاڑ کر کہا۔

”میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ آدمی مجھے تو کم از کم دیکھنے میں خاصا reasonable لگتا ہے مگر تم نے وہ بات نہیں سنی وہ جو کہا جاتا ہے۔

"The husband is always the last man to know" سے اٹھ کھڑا ہوا اور کاؤنٹر پر جا کر منیجر سے کوئی بات کرنے لگا۔ جب دوسرا بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل گیا تو رضا راحت پر ناراض ہونے لگ پڑا۔

”راحت میں نے کتنی بار تمہیں کہا ہے اس احمق عورت کو سمجھاؤ۔ اس نے تو بے چارے محسن کی عزت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ اسے منع کرو اور کہو کہ خدا کے واسطے اس رسوائی اور بدنامی کے طوق کو گلے سے اتار دے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ محسن واقعی سچ کہتا تھا۔“

”خدا کے بندے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ میں نے کئی دفعہ اس سے اس بارے میں بات کی ہے مگر وہ کسی کی سنتی ہی کب ہے۔ بس اس کے ذہن میں تو ایک ہی بات سمائی ہوئی ہے کہ لوگ خواہخواہ اس سے جلتے ہیں۔ سب ہاتھیں بناتے ہیں آج کل اس کا دماغ ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ میں اس کے سامنے کیا چیز ہوں۔ وہ تو پہلے بھی کسی کو پلے نہ ہاندھتی تھی۔ آپ خواہخواہ مجھے مورد احترام ٹھہرا رہے ہیں“ راحت نے پریشانی سے پسینہ ماتھے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

”خیر اب تو پانی سر سے گزرتا معلوم ہو رہا ہے۔

اس رات کی بات چیت کے بعد بھی فرزادہ کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ بچوں بچوں وقت گزرتا جا رہا تھا محفلوں کی روح رواں اور جان فرزادہ کا نام اب لوگوں کے ڈرائنگ روم کی گپ شپ میں سرگوشیوں میں آنے لگا لیکن کون تھا جو اسے ٹوکتا۔ جن کی محفلیں اس کے وجود سے گرم تھیں وہ ہی تو اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ وہ ایک سرکل سے نکل کر دوسرے سرکل میں رنگین تلی کی طرح محموم رہی تھی اور ساتھ ہی ان کائناتوں پر اٹھتے بیٹھتے ہوئے محسن اور اپنی عزت نفس کا لہادہ تار تار کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے سیکھڑل زبان زد عام ہونے شروع ہو گئے۔ محسن نے فرزادہ کے بارے میں پہلے تو دبی زبان سے اور پھر بر ملا طور پر راحت اور رضا سے تذکرہ کیا تو انہوں نے فرزادہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر فرزادہ نے ان کو بیک ورڈ اور تنگ نظر کہہ کر ان کا اُلٹا مذاق اڑایا۔

رضا اور راحت ہنسنے میں ایک دفعہ ضرور کسی اچھے ریستورنٹ میں کھانا کھاتے تھے۔ اس شام ان کی میز سے ذرا پیچھے کی طرف دو مرد کھانا کھا رہے تھے۔ بات چیت کے انداز سے وہ کوئی کاروباری لوگ معلوم ہوتے تھے۔ ہاتھیں کرتے کرتے وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے تو رضا اور راحت کے کان ان کی طرف لگ گئے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

”ارے یار کس کی بات کر رہے ہو..... وہ فرزادہ کی۔ ارے بھائی“ وہ گلا کھنکار کر اس طرح ہنسا گویا اس نام سے ہی اس کے گلے میں گدگدی ہو رہی ہو.....“ اس دو آتھ کا تو ذکر آتے ہی ہم تو بن پنے ہی مست ہوئے یار..... تم تعلقات کی نوعیت کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ تو فی الحال میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ابھی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ سکا ہوں میں۔ مگر فکر نہ کرو یار..... میں نے بھی آج تک کوئی ہاتھ آئی

خود کو ایک ویران صحرا میں بادِ موسم کے چلتے ہوئے
 بگولوں کے تھپڑوں کی زد میں کھڑا محسوس کر رہا تھا۔
 سامنے قدِ آدم آئینے میں جب اسے اپنا ہی عکس نظر آیا
 تو وہ خیالوں کی دنیا سے نکل کر مشکل چال چلا ہوا
 آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ گلے میں پڑی نکلائی
 اسے پھندہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے لرزیدہ ہاتھ
 بے اختیار گلے کی طرف بڑھے اور اس نے گلے سے
 نکلائی نوچ کر نیچے پھینک دی اور پھر غور سے اسے اپنا
 عکس دیکھنے لگا۔ اسے اپنے لرزتے شکست خوردہ
 وجود پر ترس آنے لگا۔ کھوکھلا جسم و جان، تمام طرف
 ایک بے کراں خلائی خلا..... آف کیا یہی وہ ازدواجی
 زندگی تھی جس کے وہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ یہ کونسا
 خواب تھا جس کی تعبیر اُلٹ نکلی۔ وہ اپنے وجود کو واضح
 طور پر کر چکی، کر چکی ہوا دیکھ رہا تھا۔ یونہی کھڑے
 کھڑے جب اس کی ٹانگیں جواب دینے لگیں تو وہ
 قریب پڑے صوفے پر ڈھیر ہو گیا اور دونوں ہاتھوں
 سے منہ ڈھانپ کر ہچکیوں سے رونے لگا۔ جب
 آنسوؤں کا طوفان تھا تو اس کے ذہن کو پھر ہزاروں
 خدشات اور شبہات زہریلے پھوؤں کی طرح ڈسنے
 لگے۔ اگرچہ اس نے ہر بڑی "ہاں" کے لیے ایک
 جھوٹی سی "نہیں" تراشنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن آج
 اس کی ہر دلیل جو وہ اپنی ازدواجی زندگی کی گرتی ہوئی
 چھت کے نیچے ستون کی طرح کھڑی کرنا چاہتا تھا،
 ریت کے بھر بھرے ٹیلے کی طرح زمین بوس ہو جاتی
 تھی اور وہ مایوسی اور دل شکستگی کے اندھیروں میں پھر
 بھٹک رہا جاتا تھا۔ پھر وہ ننگے پاؤں ہی باہر نکل گیا۔ باہر
 کی خوشگوار فضا اور خشک زمین پر پاؤں رکھتے ہی اس
 کے اُبلتے ہوئے اعصاب کو قدرے تسکین سی ملی اور
 وہ آہستہ آہستہ نرم نرم اس سے بھیگی گھاس پر ٹپٹپٹنے لگا۔
 (جاری ہے)

میں کل ہی محسن سے مل کر اس معاملے کا کوئی حل نکالنے
 کی کوشش کرتا ہوں" رضا نے میز پر مکہ مارتے ہوئے
 کہا "مجھے تو سارا قصور ہی محسن کا نظر آتا ہے۔ نکلے کی
 عورت کو اتنا سر چڑھانے کی ضرورت کیا تھی۔ شروع
 سے ہی ہاندھ کر رکھتا تو آج لویت یہاں تک نہ آتی۔"
 اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ محسن کے دیگر قریبی
 دوستوں نے محسن کے سامنے ڈھکے چھپے لفظوں میں
 فرزانہ کے رویہ کے بارے میں نکتہ چینی کی تھی۔ شروع
 شروع میں تو ان کی سوچ کا یہ انداز محسن کو سخت ناگوار
 گزرا تھا مگر بتدریج فرزانہ کی تغافل شعاری کی وجہ
 سے بعد میں خود بھی محسن کے ذہن میں شبہات کے
 کھڑے نے جالے بننے شروع کر دیے تھے لیکن آج
 رضا کے منہ سے اپنی رسوائی اور بربادی کی داستان
 سننے کے بعد ایک کھوکھلا ہوا لاوا تھا۔ جو کانوں کے
 ذریعے اب آہستہ آہستہ تمام بدن میں اُترتا معلوم ہو
 رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس جان لیوا اشتعال
 نے اس کا سب کچھ راکھ کر کے رکھ دیا ہو۔ کچھ بھی باقی
 نہ بچا ہو۔ جیسے کوئی تمام متاعِ جہین کر لے گیا ہو۔
 ایک بے مانگی اور زیاں کا احساس، ایک شکست کا
 احساس جیسے تمام رگ و پے میں اندھیرا سرایت کر گیا
 ہو۔ گھر میں گھستے ہی محسن چلا اٹھا۔

"فرزانہ آ آ آ..... فرقہ..... و....." کوئی
 جواب نہ ملنے پر اس نے دیوانہ وار تمام گھر کے
 دروازے کھول ڈالے، لیکن ہر بار اس کی آواز کی
 بازگشت نے اس کا منہ چڑا دیا۔ نجانے وہ کیوں بھول
 گیا تھا کہ وہ تو روزانہ ہی رات کو لیٹ گھر آتی ہے۔
 اسے شاید پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس کے ساتھ کتنا
 بڑا مذاق کیا جا رہا ہے۔ خالی خالی گھر جس کے صرف
 ایک کمرے میں اس کے دو نئے بچے اپنی آیا کے
 ساتھ سو رہے تھے اس کے منے اور پرانے شبہات کو
 مزید حقیقت کا رنگ دے رہے تھے۔ اس وقت وہ